مئے طہور
مورخ اسلام
حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری
(۱۹۱۶ء — ۱۹۹۶ء)
کا
مجموعۂ کلام
ترتیب وتقدیم
قمر الزماں مبارک پوری
Scanned by CamScanner

مئے طہور

مورخ اسلام

حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

(۱۹۱۶ء — ۱۹۹۶ء)

کا

مجموعۂ کلام

ترتیب وتقدیم

قمر الزماں مبارک پوری

ناشر

قاضی اطہر اکیڈمی ۔ مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی (انڈیا)

شجرۂ نسب خانوادۂ قاضیان
مبارک پور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا
قاضی شیخ علی
قاضی شیخ امام بخش
قاضی محمد رضا
قاضی شیخ حسام الدین
قاضی شیخ رجب
میاں جی حاجی لعل محمد
میاں جی ولی محمد
میاں جی محمد شفیع
میاں جی حاجی محمد عمر
میاں جی عبداللہ
میاں جی حاجی اسداللہ
میاں جی حاجی محمد حسین
میاں جی حاجی محمد حسن
مورخ اسلام
مولانا قاضی اطہر مبارک پوری
قاضی حیات النبی
قاضی ضیاء النبی
قاضی نظام النبی
قاضی عبدالعزیز
قاضی خالد کمال
قاضی ظفر مسعود
قاضی سلمان مبشر
قاضی حسان احمد
قاضی فوزان طارق
قاضی فرحان احمد
قاضی عدنان احمد
قاضی ریحان احمد
قاضی فیصل
قاضی محمد
قاضی ریان احمد

فہرست مضامین

ہلا سکتی نہیں ہے دولتِ کونین بھی اطہرؔ
زمینِ فقر پر رکھّی ہے بنیادِ خودی ہم نے

مجھے اپنوں سے الفت ہے وگرنہ قاضیِ اطہرؔ
انھیں حالات میں اپنوں سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے

تباہی کا مری ماتم ہے اطہرؔ آج اپنوں میں
مگر دیکھے گی کل دنیا کہ بیگانوں پہ کیا گزری
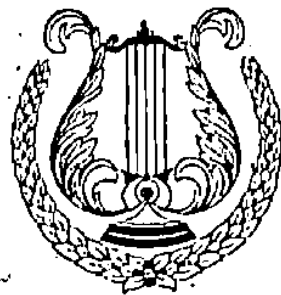
انتساب

والدگرامی الحاج عبدالمجید مبارک پوری صاحب
کی لازوال محبتوں کے نام
جنھوں نے مجھے قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا۔
جن کی زجرو توبیخ میرے حق میں دعائے کعبہ جیسی ہے۔
جن کی ادب نوازی اور تربیت کے صدف نے
مجھے قطرہ سے گُہر بننے کے ہزاروں مواقع فراہم کیے۔

قمرالزماں مبارک پوری

حرفے چند

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا مجموعۂ کلام ''مئے طہور'' کو مرتب دیکھ کر خوشی ہوئی۔ قاضی صاحب ایک محقق عالم و مصنف اور اسلامی مورخ اور فلسفۂ تاریخ میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ہند و عرب کے تاریخ کے ایک خاص دور کے بالغ نظر محقق تھے اور اس موضوع پر بہت کم کتابیں لکھی گئیں، مگر قاضی صاحب کے وسیع مطالعہ نے اس کو ہزاروں صفحات میں کمالِ تحقیق کے ساتھ پھیلا دیا اور پوری علمی دنیا سے دادِ تحقیق حاصل کی۔ میں نے ان کو اس دور میں دیکھا جب انھوں نے شعر و شاعری کا پودا لگایا تھا اور اس کی نشو و نما کا آغاز تھا۔ ہلکی پھلکی رواں دواں نظمیں لکھتے تھے اور ان کے قصبہ میں ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ کیوں کہ وہ وقت اور ماحول کا تقاضہ تھیں۔ یہ ان کی طالب علمی کا دور تھا اور جوں جوں ان کی علمی ترقی آگے بڑھتی رہی ان کی زبان صاف ہوتی گئی۔ تخیل میں تموج پیدا ہوا اور عام ملکی مسائل آزادی کی تحریک مسلم معاشرہ کے مختلف پہلوؤں پر بکثرت لکھنے لگے۔ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگیں کیوں کہ وقت کی آواز تھیں، اس لیے مقبول بھی ہوئیں۔ ''نعتیں'' قومی ملی مسائل پر زیادہ تر نظمیں تھیں۔ انھیں نظموں نے ان کو صحافتی دنیا میں روشناس کرایا پھر انھوں نے اپنا وطن چھوڑ دیا۔ اب ان کا ماحول اور ان کی دنیا بدل گئی۔ آزادی کا سفینہ ساحل کے قریب ہچکولے کھا رہا تھا۔ قاضی صاحب نیشنلسٹ ذہن و مزاج کے تھے، اس لیے مجاہدین آزادی کے قافلے کے حدی خواں بن گئے۔ ترقی پسندوں نے جولب و لہجہ اپنایا تھا قاضی صاحب اس سے متاثر رہے۔ ان کے الفاظ بھی شمشیر و سناں بن گئے، مگر صرف شاعری سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ انھوں نے مضامین لکھنے شروع کیے۔ چوں کہ ذہن شروع سے نئی راہ کا متلاشی تھا، اس لیے انھوں نے اپنا مطالعہ ہند و عرب کے ابتدائی دور کے تعلقات کو بنایا اور قدیم عربی تاریخ کو زیر مطالعہ رکھا۔ اس لیے ان کے سامنے ایسی حقیقتیں آئیں جن پر کم لوگوں کی نظر گئی تھی۔ اس لیے ان کے مضامین میں معلومات کے علاوہ وزن اور گہرائی تھی اور اہل علم کی محفلوں میں ان کی پذیرائی ہوئی۔ پھر ان کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ لائبریریوں کا چکر قدیم کتابوں اور جغرافیوں کی تلاش ان کا مزاج بلکہ ضرورت بن گئی اور وہ سچ مچ فنا فی العلم بن گئے۔ جب ان کی پہلی کتاب شائع ہوئی تو اہل علم نے ان کو حیرت کے ہاتھوں لیا اور مرعوبیت کی نگاہوں سے دیکھا۔ علم و تحقیق کا ایک تناور درخت بن گئے اور سایہ دور تک پھیل گیا اور یہ

قدرت کا اصول ہے کہ گھنے پیڑوں کے سائے میں پودے نشو ونما نہیں پاتے۔ ان کی شاعری جوان کے ابتدائی دور کے پودوں میں سے تھی۔ اس عظیم درخت کے سائے میں مرجھا کر رہ گئی۔ کیوں کہ گھنے درخت کا سایہ اس کی نشو ونما میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تخلیقی مشغلہ چھوڑ دیا، بلکہ خود چھوٹ گیا۔ کیوں کہ اردو شاعری ہواؤں میں گرہ لگانے کا نام ہے۔ اس لیے انھوں نے نہ اپنا کلام مرتب کیا اور نہ کبھی دیوان کے شائع کرنے کا خیال آیا، بلکہ وہ لاہور میں مشہور اردو شاعر احسان دانش کی مجلس میں برسوں رہے۔ تقریباً روزآنہ ملاقاتیں رہیں۔ شعر وشاعری کا بھی تذکرہ رہا۔ احسان کی نظمیں سنتے اور ان کو دادِ تحسین سے نوازتے، مگر انھوں نے خود اپنی کوئی نظم نہیں سنائی جیسے ان کو شاعری سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، یہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ قاضی صاحب ۳۱ ربرس کے ہو چکے تھے، اس دوران انھوں نے بیشمار غزلیں، نظمیں، نعتیں، قطعات لکھے وہ کہیں نہ کہیں اخباروں میں، رسالوں میں یادداشتوں میں، دوستوں کے خطوط میں موجود رہے۔ لیکن ان کی اپنی یادداشت والی ڈائری میں کم ہی رہے۔ اس لیے ان کے ذائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ قاضی صاحب کے اس دنیا سے جانے کے بعد ان کے قدردانوں نے اس طرف توجہ کی اور آج ''مئے طہور'' کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ میں کلام پر تبصرہ اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ یہ خود آپ کے ہاتھوں میں ہے، آپ خود فیصلہ کریں گے کہ اس کا مقام ومرتبہ کیا ہے۔

اسیر ادروی

مدیر ترجمان الاسلام بنارس

المرقوم ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ

مطابق ۱۱ اپریل ۲۰۰۶ء

اِظہارِ تشکر

الحمد الله رب العٰلمین و الصلوٰۃ علیٰ خاتم المرسلین
و من تبعھم باحسان اِلیٰ یوم الدین و العاقبۃ للمتقین

امابعد! والد محترم مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کا شعری مجموعہ ''مئے طہور'' پہلی مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آرہا ہے۔

والد علیہ الرحمہ نے علمی و تحقیقی مصروفیت کی وجہ سے شعر و شاعری سے بے نیازی اختیار کرلی تھی۔ حالاں کہ اس وقت کے متحدہ ہندوستان کے مؤقر علمی و دینی رسالوں اور اخباروں میں آپ کے اشعار شائع ہوتے رہتے تھے اور شاعری ہی آپ کے امرتسر، لاہور اور بمبئی جانے کا سبب بنی اور اس غائبانہ تعارف نے آئندہ کے لئے آپ کے علمی سفر کی راہیں ہموار کیں۔ آپ کا اصل خاندانی نام عبدالحفیظ ہے۔ مگر اپنے قلمی نام قاضی اطہر مبارک پوری سے مشہور ہوئے، شاعری میں اطہر تخلص کرتے تھے۔

آپ نے پوری تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں حاصل کی۔ صرف ایک سال کے لئے مدرسہ شاہی مرادآباد گئے اور وہیں سے دورۂ حدیث کر کے تعلیم کی تکمیل فرمائی۔ فراغت کے بعد تقریباً پانچ سال احیاء العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ دورانِ تعلیم و تعلم مختلف اصنافِ سخن میں خوب طبع آزمائی کرتے رہے۔ آپ کے قول کے مطابق اُن دِنوں اشعار اُبلتے تھے اور ایک دِن میں کئی کئی نظمیں کہتے تھے، جو اُس وقت کے مذہبی و سیاسی حالات کی عکاسی کرتی تھیں۔ خاص طور سے جامع مسجد متعلقہ احیاء العلوم مبارک پور کی تعمیر کے چندہ کے لئے خوب نظمیں لکھیں اور لاکھوں روپے کا چندہ ہوا۔ محی السنہ حضرت مولانا شکر اللہ مبارک پوری علیہ الرحمہ ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم خوب ہمت افزائی کرتے تھے۔ اُن نظموں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج سے ۶۵ رسال پہلے لکھی گئی نظمیں مدرسہ و مسجد کے چندہ کے لیے آج بھی اُسی طرح پڑھی جاتی ہیں۔ موجودہ وقت میں اسی جامع مسجد مبارک پور کے مینارہ کی تعمیر کے لیے آپ کی وہی نظمیں پڑھی جاتی ہیں، جو جامع مسجد کی تعمیر کے وقت ۱۹۴۰ء کے آس پاس پڑھی جاتی تھیں۔

آپ کی ذات ایک انجمن تھی، جس نے علم و تحقیق کی شمع روشن کی، جو اپنی پوری زندگی

علمی روشنی بکھیرتی رہی۔ آپ میں خودی اور خودداری کا عنصر غالب تھا، جس کا جا بجا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہلا سکتی نہیں ہے دولتِ کونین بھی اطہر
زمینِ فقر پر رکھی ہے بنیادِ خودی ہم نے

آپ کی زندگی بحث وتحقیق، عمل پیہم، غیرت وعزتِ نفس، فروتنی، خردنوازی اور خودداری سے عبارت تھی۔ آپ نے چالیس سال کتابیں تصنیف کیں اور چالیس سال تک اُردو روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی میں مسلسل احوال ومعارف کے عنوان سے دینی، ملی اور سیاسی کالم لکھتے تھے اور ۲۵ رسال تک ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی کے اڈیٹر تھے اور اس کے ہر شمارہ میں مستقل عنوان کے تحت کئی کئی مضامین لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر آپ کے بہت سے قیمتی مقالات ہندو پاک کے مشہور علمی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ بلاشبہ اگر ان مضامین کو الگ الگ موضوع پر ترتیب دیا جائے تو درجنوں معیاری تصانیف معرضِ وجود میں آسکتی ہیں۔

آپ عرب وہند کے اسلامی تعلقات پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان موضوعات پر عربی واُردو میں آپ کی متعدد معتبر کتابیں موجود ہیں۔ ان کی بعض اُردو کتابوں کا عربی اور عربی کتابوں کا اُردو اور بعض کا سندھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ علمی میدان میں آپ کی شخصیت منفرد تھی اور بعض فن میں آپ نے پہلی مرتبہ اُردو میں کتاب تصنیف کی۔ جیسے ''تدوین سیر ومغازی'' جس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے نہایت آب وتاب کے ساتھ ۱۴۱۰ھ میں بڑے سائز پر شائع کیا ہے۔ جس میں ۳۲۰ صفحات ہیں۔ ''مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم اور علماء'' کی بھی اپنی ایک الگ حیثیت ہے۔

مختصر یہ کہ آپ ''خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود، گلِ کوزہ'' تھے۔ اُنھوں نے ایک اکیڈمی کا کام تنہا انجام دیا ہے۔ اقبال سہیل نے کیا خوب کہا ہے:

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلّی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اُٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

مورخِ اسلام مبارک پوری علم وتحقیق کے موتی بکھیرتے ہوئے ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء کو سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے اور اپنے وطن مبارک پور کے پچھمی قبرستان شاہ کے پنجہ میں آسودۂ خاک ہوئے۔

اِدھر تو گزری ہے عمر اطہر خودی کی آزاد خلوتوں میں
وہ اور ہوں گے جو انجمن میں اسیرِ جاہ وحشم رہے ہیں

''مئے طہور'' کے مرتب مولانا قمر الزماں صاحب قمر مبارک پوری سے میری دید و ملاقات کا سلسلہ جاری ہے۔ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں زیرِ تعلیم تھا اور مولانا مدرسہ اشرفیہ مبارک پور میں۔ پھر راہیں جُدا ہوئیں اور میں نے دار العلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے تعلیم حاصل کی اور حکومتِ سعودیہ کی طرف سے دینِ متین کی تبلیغ وتدریس کے لئے (گھانا) مغربی افریقہ کی راہ لی اور چودہ سال بچوں کے ساتھ وہاں قیام رہا اور ۱۹۹۲ء میں تبادلہ پر وطن واپسی ہوئی اور مولانا قمر الزماں صاحب اشرفیہ سے فراغت کے بعد مبارک پور میں علمی ودینی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ خاص طور پر اُردو کے فروغ میں آپ کی جدّ و جہد نمایاں ہے۔ اسی سلسلہ کی کڑی ''جعفر لائبریری'' کا قیام بھی ہے۔ جس کے آپ جنرل سکریٹری ہیں اور ایک کتاب ''صدرنگ'' کے مُرتب بھی ہیں، جو ہند و پاک کے شاعروں کا تذکرہ ہے اور اسی لائبریری سے شائع ہوا ہے۔ سخن، فنِ سخن اور اصنافِ سخن پر مہارت رکھتے ہیں۔ نعت گوئی میں کافی شہرت ہے۔ چوں کہ شعر و ادب کا ذوق غالب رہا، اِس لیے مورخِ اسلام مبارک پوری سے شاگردانہ تعلق رکھتے تھے۔ علمی اور ادبی موضوع پر آپ سے مدد لیتے تھے اور گروہی عصبیت سے بالاتر ہوکر والدِ مکرم کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ انتہائی خلوص وعقیدت کے ساتھ والہانہ قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔ جب ان سے دیوانِ اطہر شائع کرنے کے متعلق گفتگو ہوئی تو انتہائی خندہ پیشانی اور اسی جذبہ کے تحت یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہوگئے اور کہا کہ مولانا مرحوم کا مجھ پر قرض ہے کہ میں اُن کی کسی طرح کوئی علمی خدمت کروں، اِس لیے کہ میں نے اُن سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

محترم مُرتب ہماری طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ بلاشبہ ''مئے طہور'' مورخِ اسلام کے قلم کا زرّیں شاہکار ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرما کر اِس کو اوساطِ علمیہ میں قبولِ عام فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

طالبِ دعاء

قاضی سلمان مبارک پوری

حجازی منزل، مبارک پور، اعظم گڑھ

۲۷؍رجب ۱۴۲۶ھ مطابق ۲؍ستمبر ۲۰۰۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

قمرالزماں مبارک پوری

فلسفۂ عمرانیات، علمِ نفسیات، نظریۂ جنسیات اور مطالعۂ نسلیات نے یہ بات تقریباً طے کر دی ہے کہ فرد کی ذہنی و فکری تعمیر و تشکیل اور اس کی شخصیت سازی میں بہت سے عوامل و موثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ کسی دانائے راز، نابغۂ روزگار اور عہد آفریں شخصیت کے ظہور میں بہت سے معلوم و نامعلوم خاندانی و نسبی، جنسی و نسلی اور ذہنی و نفسی اسباب و توافق، تطابق و تفاعل کے جوار بھاٹے، موج تہ نشیں کی شکل میں کام کرتے ہیں۔ اس لیے مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے آباد اجداد کا اجمالی ذکر جمیل ان کی شخصیت اور کارنامے کے ابعاد کو روشن کرنے میں ہماری مدد کرے گا۔ اسلاف کے تذکرے سے مولانا کی فکری تفہیم کے سلسلے میں وہ جہت سامنے آتی ہے جو ماضی کے دھندلکے میں اپنی تابانی کو چھپائے ہوئے ہے۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے ماہ نامہ ''البلاغ''، ''مآثر و معارف'' اور ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' میں کہیں پوری صراحت و تفصیل سے، کہیں اشارتاً، کہیں اجمالاً اپنے خاندان و اسلاف کے تعلق سے ایسی اطلاعات فراہم کی ہیں جن سے مولانا کا فکری و فنی اور ذہنی و علمی پس منظر سامنے آتا ہے۔ حالاں کہ حضرت ممدوح نے کسی مقام پر اشارتاً بھی اپنی شخصیت کے تعارف و تعین کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے، جس سے فخر و مباہات کا احساس ہوتا ہو۔ لیکن انہوں نے اپنی زبانِ قلم سے اپنے بزرگوں کے بارے میں جو کچھ بھی کہا وہ برائے برکت ضرور تھا۔ اضطراری اور غیر ارادی طور سے اب وہی تحریریں اپنے لکھنے والے کے فکر و فن اور شخصیت کا حاشیہ بن چکی ہیں۔ جن سے ان کے فکر و فن اور ذہنی تشکیل سے دلچسپی رکھنے والا کوئی ناقد بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

دیارِ پورب کے قصبات میں مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت اہم مقام حاصل ہے۔ یہ قدیم قصبہ عہدِ ہمایوں (۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ) میں دوبارہ بسا۔ پہلے بھی یہ قاسم آباد تھا مگر تاراج ہو گیا۔ اُسی کے کھنڈرات پر مانک پور کڑا ضلع الٰہ آباد کے سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھنے والے صوفیِ صافی راجہ سید مبارک مانک پوری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۲ رشوال ۹۶۵ھ نے اس کو اپنے

مبارک نام پر دوبارہ آباد کر کے اپنی تعمیری شخصیت کو نمایاں کیا۔ ان بزرگ کے ساتھ آنے والوں میں قاضی صاحب کا خاندان بھی تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"راجہ سید مبارک کے ہمراہ راقم (مولانا قاضی اطہر) کا خاندان مانک پور سے یہاں آکر آباد ہو گیا اور قصبہ کی پہلی آبادی اسی خانوادے کی ہے"[1]

اس خاندان میں قصبہ وسواد قصبہ کے لیے نیابتِ قضاء کا عہدہ آخری دور تک باقی رہا:

بدر بشکل ہلال ہم دارد ہر کمالے زوال ہم دارد

کے الٰہی قانون کے مطابق اس خاندان کو بھی زوال وانحطاط کی آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا اور اس خاندان سے علمی ودینی روایات واقدار تقریباً ختم ہو گئی تھیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی حد تک ان کے آثار وباقیات پائے جاتے تھے۔ بلکہ اب بھی کچھ خاندانی اقدار وروایات، کچھ سرکاری اسناد وتوقیعات اور کچھ نیابتِ قضاء کے امور ومعمولات باقی رہ گئے ہیں۔

عہدِ مغلیہ اور نوابی اودھ کے بہت سے فرامین واسناد انگریزی عملداری کے بعد عدالتوں میں طلب کیے گئے تھے۔ جو بعد میں واپس نہیں لیے جا سکے۔ جس کی وجہ سے اس خاندان کے محاسن ومفاخر کے بہت سے تابناک پہلو ہمارے سامنے آنے سے رہ گئے ہیں۔

راجہ سید مبارک رحمۃ اللہ علیہ اپنے ساتھ آئے ہوئے اس دینی وروحانی اور علمی خانوادہ کو اپنا جانشین مقرر کر کے خود اپنے وطن مالوف مانک پور تشریف لے گئے اور وہیں ۲ رشوال ۹۶۳ھ کو انتقال فرما گئے۔ راجہ سید مبارک کے مبارک پور سے چلے جانے کے بعد اس خاندان نے ان کا قائم مقام رہ کر اور اُن کی مسجد کا متولی بن کر اس قصبہ میں اہم علمی ودینی اور روحانی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد اطراف وجوانب سے مسلمان آکر اس قصبہ میں آباد ہوئے۔ جن کی علمی ودینی سربراہی کا اعزاز مولانا قاضی اطہر کے گھرانے کو کئی سو برس تک حاصل رہا:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت شیخ علی مبارک پوری سے پہلے اس خاندان کے کسی بزرگ کا نام نہیں ملتا۔ ان کے واقعات وحالات سے متبادر ہوتا ہے کہ اس خاندان میں علمی وروحانی وجاہت کے ساتھ ساتھ دنیاوی دولت وثروت اور مال داری وخوش حالی بھی حقِ رفاقت ادا کر رہی تھی۔ یہ دارالقضاء محمد آباد گوہنہ کی طرف

[1] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ تذکرہ علمائے مبارک پور ۱۹۷۴ء (ص: ۷۵)

سے نائب قاضی بنائے گئے تھے۔

یہ مبارک پور اور اس کے ملحقات و متعلقات میں بڑی عزت و وجاہت علمی سے دینی و ملی امور کی انجام دہی میں مشغول رہا کرتے تھے۔ خیال ہے کہ قاضی شیخ علی کی پیدائش ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۴۰ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ آپ خوش حالی، مال داری اور نیابتِ قضاء کے ساتھ پہلوانی اور شہ زوری میں بھی مشہورِ زمانہ تھے اور اطراف و جوانب میں اس فن کے استاد مانے جاتے تھے۔ ذکر و شغل اور زہد و تقویٰ میں بہت آگے تھے۔[1] اَسّی برس سے زائد کی عمر میں اکھاڑہ اور پہلوانی کی رقابت میں ۱۲۱۶ھ کے بعد شہید کردیے گئے۔ ''واقعات وحادثات مبارک پور'' (قلمی) مؤلفہ مولوی علی حسن فاروقی میں ان کا ذکر ''چھٹا حادثہ علی شاہی'' کے عنوان سے ملتا ہے۔ انھوں نے نوابانِ اودھ کے بعد انگریزوں کا زمانۂ حکومت بھی دیکھا تھا۔ نمازِ عیدین، جمعہ، نکاح خوانی، نزاعی معاملات کا تصفیہ، میت کی تجہیز و تکفین، مسائل دینیہ میں عوام الناس کی رہنمائی، دعا خوانی اور زندگی کی دوسری سرگرمیوں میں فلاحی و رفاہی کاموں کی سربراہی آپ سے متعلق تھی۔

قاضی شیخ علی کے صاحبزادے شیخ امام بخش نے بھی باپ کی جانشینی کا حق خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ پدرِ بزرگوار کی طرح زہد و تقویٰ، اوراد و وظائف اور اشراق و تہجد کے پابند تھے۔ ان کی نیکی اور شرافت مشہورِ زمانہ تھی۔ قصبہ کے نائب قاضی، جامع مسجد راجہ مبارک صاحب کے مستقل امام اور سکٹھی و مبارک پور کی عیدگاہ میں عیدین کے امام تھے۔ ۱۲۳۴ھ میں عیدگاہ کے امام مقرر کیے گئے۔[2]

قاضی شیخ امام بخش قصبہ اور ملحقات کے بارہ مواضعات میں قضا کی نیابت فرماتے تھے۔ جس میں نکاح خوانی کے علاوہ رسومِ دینداری کی ترویج و توسیع، التزام سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، امامتِ جمعہ و جماعات، وعظ و تذکیر، مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ، زن و شوئی کے معاملات و تنازعات کا حل اور اسی قسم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دیگر کام شامل تھے۔ آپ کے نام نیابتِ قضاء کی چار سندیں ''مآثر و معارف'' میں درج ہیں۔ ۱۲۶۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

قاضی شیخ امام بخش کے دو صاحبزادے تھے۔ شیخ محمد رضا اور شیخ حسام الدین اور یہ دونوں بھائی اپنے والد کی زندگی ہی میں قصبہ و ملحقات قصبہ میں نیابتِ قضا کی خدمت انجام دینے لگے تھے۔ شیخ محمد رضا کی امانت گزاری اور دیانت داری کے مکرر سماع و معائنہ کے بعد محمد آباد گوہنہ میں حکومت کی طرف سے

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ مآثر و معارف۔ مارچ ۱۹۷۱ء (ص: ۳۴۵-۳۴۶)

[2] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ تذکرۂ علمائے مبارک پور۔ طبع اول ۱۹۷۴ء (ص: ۱۰۹)

منصف کے عہدے پر مامور کیے گئے۔قاضی محمد سلیم صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان کو سندِ جدید دی بلکہ ان کا حلقۂ نیابت بھی وسیع کر دیا اور پندرہ مقامات میں ان کو نائب قاضی بنا دیا[1] پورب میں پرانی بستی تک، دکھن میں سٹھیاؤں تک، پچھم میں بھوراور حاجی پور تک اور اُتر میں گونجر پار اور بنڈ بیا تک ان کے حدود قضا تھے اور وہی اس پورے علاقے کے مسلمانوں کے جملہ شرعی امور و معاملات کے ذمہ دار تھے[2]
''آثر و معارف'' میں ان کی تین سندیں منقول ہیں، جو قاضی محمد رؤف، قاضی محمد سلیم اور قاضی محمد شاہ عالم کی طرف سے دار القضاء نے جاری کی تھیں۔

قاضی شیخ حسام الدین بن قاضی شیخ امام بخش بن قاضی شیخ علی بھی مذکورۃ الصدر افراد خانہ کی طرح زہد و اتقا اور خدا ترسی و پارسائی میں فقید العصر تھے۔اُن کا شمار اپنے دیار کے ولی میں ہوتا تھا۔اُن کی بزرگی وولایت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔وہ نیابتِ قضا سے علیحدگی کے بعد درس وتدریس اور ذہن سازی کی مہم میں لگ گئے۔انھوں نے اسی دینی وعلمی تحریک میں باقی زندگی گزار دی۔۹ ریا ۱۰ ر جمادی الاوّل ۱۲۷۹ھ کو فوت ہوئے۔عوام میں حسامدی بابا سے مشہور تھے۔ آخری عمر میں مجذوبانہ زندگی گزارنے لگے تھے۔انھیں اللہ کی طرف سے طے الارض کی کرامت عطا ہوئی تھی۔اُن کو لوگوں نے ایک ہی وقت میں کئی جگہ دیکھا تھا۔

قاضی شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا اپنے خاندان قضاۃ و مشیخت کے خاندانی عہدہ کے آخری فرد تھے۔جن پر صدیوں کی روایت کا خاتمہ ہو گیا۔انگریزی عملداری میں اسلامی عدالتوں کو بند کر کے تمام قانونی اُمور عام عدالتوں کے سپرد کر دیے گئے۔اس سرکاری اقدام نے ہندوستان میں مغربی نظامِ عدل، مادی تہذیب، اور انگریزی اقتدار کی راہیں ہموار کیں اور مسلمانوں کو پہلی بار اپنی اسلامی روایات واقدار کی پائمالی کا احساس ہوا۔

قاضی شیخ محمد رجب زبردست عالمِ دین اور نہایت متقی ودیندار بزرگ تھے۔ساتھ ہی اسلامی شان وشوکت کے مالک بھی تھے۔جب ان کی پالکی نکلتی تھی تو اربابِ علم وفضل اس کے دائیں بائیں چلتے تھے۔اُن کے پاس خاندانی مخطوطات ونوادرات اور کتابوں کا بیش بہا کتب خانہ بھی تھا[3] جسے بعد میں

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔آثر و معارف۔مارچ ۱۹۷۱ء (ص:۳۵۷)

[2] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔تذکرہ علمائے مبارک پور (ص:۱۱۳)

[3] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔آثر و معارف ۱۹۷۱ء (ص:۳۶۰)

لوگوں نے راجہ صاحب کی مسجد کے پاس کنویں میں ڈال دیا۔ قاضی محمد رجب مولانا اسمٰعیل دہلوی سے حسنِ عقیدت رکھتے تھے اور انھیں کے خطبہ کو جمعہ وعیدین میں پڑھا کرتے تھے۔ ۱۲۵۱ھ میں قاضی محمد سلیم صاحب منصف نے آپ کے دادا شیخ امام بخش کو جو سندِ قضا دی تھی، اُس میں آپ کا نام بھی درج کیا تھا۔ مگر چوں کہ اس وقت آپ کی کم عمری تھی، اس لیے اس میں نام کے ساتھ شیخ کا لفظ نہیں ہے۔ آپ کی وفات ۱۲۹۷ھ کے بعد تیرہویں صدی ہجری کے خاتمہ پر ہوئی۔

قاضی شیخ محمد رجب کے دو صاحبزادے میاں جی حاجی لعل محمد اور میاں جی ولی محمد تھے۔ میاں جی حاجی لعل محمد زندگی بھر کسی نہ کسی درجہ میں خاندانی روایات کے مشعل بردار رہے۔ حج وزیارت سے بھی مشرف تھے۔ اُن کے بھائی میاں جی ولی محمد بھی اپنی ایک حیثیت رکھتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی خاندانی روایات کا حصہ تھی، جس پر وہ کاربند رہے۔

میاں جی حاجی لعل محمد کے چار صاحبزادے ہوئے۔ میاں جی عبداللہ متوفی ۱۵ر رجب ۱۳۵۷ھ، میاں جی حاجی اسداللہ متوفی ۲۵ر صفر ۱۳۸۲ھ، میاں جی حاجی محمد حسین متوفی ۲۵ر رجب ۱۳۶۵ھ اور میاں جی حاجی محمد حسن متوفی ۲۸ر فروری ۱۹۷۸ء۔

میاں جی عبداللہ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ بہت خوش قامت اور جلال ووجاہت کے پیکر تھے۔ عقل ودانائی میں بھی ممتاز تھے۔ انھیں بزرگ نے انگریزی دور میں ۱۹۱۰ء میں جب الہ آباد کی نمائش میں اپنا کارخانہ لے جاکر ہاتھ سے کپڑے تیار کیے تو حکومت کی طرف سے ان کو تمغہ ملا۔ جسے مولانا عبدالسلام مبارک پوری (۱۲۸۹ھ۔۱۳۴۲ھ) نے بچشمِ خود دیکھا تھا[1] میاں جی عبداللہ میں قاضی شیخ علی مرحوم کی شہ زوری اور پہلوانی کی جھلک موجود تھی۔ ان کے گھر کے پاس ہی راجہ بھانٹ کا اکھاڑہ ان کے ذوق کا سامان فراہم کررہا تھا۔

میاں جی حاجی اسداللہ میں خاندانی روحانیت کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ صوفیاء اور اہلِ دل کی صحبت میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی میاں جی حاجی محمد حسین نیابتِ قضا کی رہی سہی روایت وذمہ داری کو سنبھالے ہوئے تھے۔ نکاح خوانی اور امامتِ جمعہ وعیدین کی ذمہ داریاں اُن سے متعلق تھیں۔

---

[1] مولانا عبدالسلام مبارک پوری۔ تاریخ المنوال ولبلہ۔ بار دوم ۲۰۰۲ء (ص:۴۱)۔ مگر قاضی صاحب کے بیٹے قاضی ظفر مسعود صاحب کا بیان ہے کہ یہ بات میاں جی اسداللہ کی ہے جن کو انگریزی حکومت نے کانسے کا تمغہ اور سند دے کر عزت افزائی کی تھی، اب خاندان میں وہ تمغہ اور سند موجود نہیں۔

میاں جی حاجی محمد حسن مرحوم بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، جو بسلسلۂ معاش و معیشت باہر آتے جاتے تھے۔ مولانا کا بیان ہے کہ:

''ایک مرتبہ والد صاحب مرحوم اور محلّہ کے دو اور شخص اچانک لاہور پہنچ گئے ......ان کا یہ سفر امرتسر سے ریشم خریدنے کے لئے تھا۔ کئی دن رہے اور میرے ساتھ امرتسر آتے جاتے رہے''۔[1]

میاں جی حاجی محمد حسن بھی اپنی خاندانی روایت کی بعض امانتوں کے امین تھے۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری انھیں محترم کے فرزندِ ارجمند تھے اور بھائیوں اور بہن میں سب سے بڑے تھے۔

میاں جی حاجی محمد حسن مرحوم کے کل چھ اولادیں ہوئیں۔ جن میں پانچ لڑکے اور ایک بیٹی تھیں۔ اُن اولادوں کے نام یہ ہیں: (۱) عبدالحفیظ المعروف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ (۲) محمودہ خاتون متوفیہ ۱۹۹۵ء۔ (۳) قاضی حیات النبی متوفی ۱۸ردسمبر ۱۹۸۲ء۔ (۴) قاضی ضیاء النبی متوفی ۱۹۹۴ء۔ (۵) قاضی غلام النبی بقید حیات۔ (۶) قاضی عبدالعزیز بقید حیات۔

صاحبِ تذکرہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اپنے بہن بھائی میں سب سے بڑے ہیں۔ قاضی حیات النبی عقل و ذہانت میں خاندانی روایتوں کے امین تھے۔ وہ ادبی ذوق رکھنے کے ساتھ شاعری بھی کرتے تھے۔ اُن کی بعض نعتیں ''البلاغ'' بمبئی کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ نکاح خوانی، قضایات اور صلح وصفائی سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اکثر فریقین کے درمیان انھیں ثالثی کی دعوت دی جاتی تھی۔ وہ اپنی تدبیر سے پیچیدہ تنازعات ومناقشات میں درمیانی راہ نکال کر صلح صفائی کرا دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اللہ نے انھیں ایسا دل و دماغ عطا کیا تھا کہ معاملات کو بخوبی سمجھ کر اس کو حل کر دیا کرتے تھے۔ سیر و شکار سے بھی دلچسپی تھی۔ مرغ و ماہی دونوں کا شکار ان کا من پسند شکار ہوتا تھا۔ عموماً مرغ و ماہی کے صید و شکار کے موسم میں اپنے گروپ کے سرغنہ ہوا کرتے تھے اور کئی کئی دن چڑیوں کے شکار کے لیے بڑے بڑے تالاب اور مچھلی کے شکار کے لیے ندیوں پر خیمہ زن رہا کرتے تھے۔ ''البلاغ'' کی کتابت انھیں کے ذمہ تھی۔ ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' جس کی اشاعت جون ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی۔ انھیں کی کتابت کا مرہون منت تھا۔ اُن کے بارے میں مولانا قاضی اطہر صاحب ایک جگہ یہ اطلاع فراہم کر رہے ہیں کہ:

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۷۶)

''اسی دور میں (۱۹۵۱ء کے آس پاس) اپنے چھوٹے بھائی قاضی حیات النبی مرحوم کو بمبئی بلایا۔ وہ خوش حالی کے دور میں پیدا ہوا تھا۔ ناز ونعمت میں پروان چڑھا تھا۔ فطرتاً ضعیف وناتواں تھا، مزاج میں تیزی تھی، بڑا کام نہیں کرسکتا تھا۔ ذہین، معاملہ فہم اور صاف گو تھا۔ اس زمانہ میں رام پور کے ایک علامہ شرف زیدی نے بمبئی سے ایک روزنامہ ''مشعل'' کے نام سے جاری کیا۔ اسی میں کتابت کے لیے حیات النبی مرحوم کو چھ آنے فی کالم (پر) رکھ دیا۔ حالاں کہ وہ پہلے سے کتابت نہیں جانتا تھا۔ چند ماہ میں ''مشعل'' بند ہوگیا تو اس کو وطن واپس کر دیا اور بعد میں ''البلاغ'' میں مستقل کاتب بن کر میرے ساتھ رہا اور حج وحجاج کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور پانچ مرتبہ حج وزیارت سے مشرف ہوا''[1]

قاضی حیات النبی میں برادری کی حمیت بھی بہت زیادہ تھی۔ جب مدرسہ احیاء العلوم کے طلباء میں برادری واد کو لے کر تنازعہ پیدا ہوا تھا تو اس میں قاضی حیات النبی نے انصاری برادری کی تذلیل وتوہین کے خلاف سخت احتجاجی قدم اُٹھایا تھا اور انصاری برادری کی علمی ودینی، اصلاحی ودعوتی خدمات کا واضح نقشہ پیش کیا تھا۔ مرحوم کا نوحہ مولانا محمد عثمان ساحرؔ مبارک پوری نے بہت پر درد انداز میں لکھا ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے قاضی حیات النبی کی سیرت سامنے آجاتی ہے۔

ذیل میں قاضی حیات النبی کی ایک نعت شریف ملاحظہ ہو:

اس طرح عام ہوگئی اس گھر کی روشنی　　فق پڑ گئی ہے ماہِ مُنوّر کی روشنی

آمد ہے آج کس کی کہ یوں جھوم جھوم کر　　تعظیم کو چلی مہ و اختر کی روشنی

بے نور ہو کے رہ گئی بت خانوں کی فضا　　پھیلی جو ہر سو خانۂ داور کی روشنی

ذرّوں پہ اب بھی دیکھ لو بدر وحنین کے　　جلوہ فگن ہے روئے مُنوّر کی روشنی

روشن ہوئی ہے طیبہ میں وہ شمعِ ضوفشاں　　ہے فیضیاب جس سے ہر اک گھر کی روشنی

شاہد ہر ایک لمحہ ہے اس بات کا حیاتؔ
ہے میرے دل میں روضۂ اطہر کی روشنی

(ماہ نامہ البلاغ بمبئی۔ مئی ۱۹۵۷ء ص:۲۲)

قاضی حیات النبی مرحوم کے دو بیٹے ہیں اور تجارت ومعاش میں رزقِ حلال کی جدوجہد میں

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص:۹۸)

لگے ہوئے ہیں۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری سے چھوٹی اور قاضی حیات النبی مرحوم سے بڑی بہن محمودہ خاتون بھی صاحب اولاد تھیں۔ جن کے چھ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ قاضی ضیاء النبی مرحوم پانچ اولاد کے باپ تھے۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں ان کی صلب سے ہیں۔ قاضی غلام النبی بقید حیات ہیں اور چھ اولاد کے والد ہیں۔ جن میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ قاضی عبدالعزیز بھی الحمدللہ حیات ہیں اور ان کی کل نو اولادیں ہیں۔ جن میں سات لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ یہ تمام بھائی اور بہن مبارک پور ہی میں قیام پزیر رہے، یا سکونت گزیں ہیں۔

میاں جی ولی محمد کے دو لڑکے ہوئے۔ میاں جی محمد شفیع مرحوم اور میاں جی حاجی محمد عمر متوفی ۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ۔ میاں جی حاجی محمد عمر زمانۂ دراز تک مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور کے ناظم اعلیٰ رہے۔ بڑے جفاکش، اچھے منتظم، کامیاب تجارت پیشہ اور تعمیری صلاحیتوں کے حامل تھے۔ اشرفیہ کا زریں دور ان کی جماعتی سرگرمیوں سے وابستہ ہے۔ یہ جب تک ناظم اعلیٰ رہے، طلباء و مدرسین میں مدرسہ کے قواعد وضوابط کے احترام کا احساس بہت گہرا تھا۔ نکاح خوانی کے ساتھ نزاعی اُمور اور خانگی معاملات کو نپٹانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے آخری وقت تک اپنی وجاہت اور دینی و اصلاحی غیرت کو سنبھالے رکھا تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ گاتے ہوئے یا ریڈیو بجاتے ہوئے ان کی گلی سے گزر جائے۔ طبیعت میں نفاست وخود اعتمادی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب وآلِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے انتہائی حسنِ عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا نسب مادری صاحبانِ علم وفضل کا سلسلۃ الذہب رکھتا ہے۔ مولانا کے نانہال کا تعلق مبارک پور سے مشرق میں واقع موضع رسول پور سے ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ تین بھائی زین الدین، جمال الدین اور رکھید و جہانگیر بادشاہ کے عہد سلطنت میں کھورہٹ کے پاس موضع اماری کساری سے ترک وطن کرکے رسول پور میں آباد ہوئے۔ مولانا قاضی اطہر کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری پانچ بھائی تھے۔ ان میں سے دو بھائی اپنے دور و دیار کے بڑے صاحب علم وفضل بزرگ تسلیم کیے گئے۔ مولانا عبدالعلیم رسول پوری بن شیخ عبدالرحیم ۱۲۷۰ھ یا ۱۲۸۰ھ کے درمیان میں پیدا ہوئے۔ صاحب تلامذۂ کثیرہ، مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور کے صدر مدرس، مفتی شہر غازی پور، مناظر ومصنف اور طبیب حاذق تھے۔ جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں اجتہادی شان کے مالک تھے اور اپنے علمی وفقہی تبحر وتعمق کے لیے دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ اُن کے قلمی آثار میں (۱) اساس التوحید (فارسی)۔

(۲) سیدالتخریج مسمّی بہ توضیح الفرائض (اُردو)۔ (۳) التبصرہ فی تحقیق الاشربہ (اُردو)۔ (۴) کتاب الشہادۃ (اُردو)۔ (۵) الخطب المنبریہ من الآیات القرآنیہ۔ (۶) درۃ التاج الانور فی اذان الجمعۃ عندالمنبر۔ (۷) سفر نامۂ حجاز (اُردو) سب کی سب مطبوعہ۔ (۸) اصول فقہ (اُردو قلمی)۔ (۹) الدوحۃ الناظرہ فی علم المناظرہ (اُردو قلمی)۔ (۱۰) الفریدۃ الوضعیہ فی الحکمۃ الالٰہیہ (عربی قلمی)۔ (۱۱) رواۃ البخاری المجروحون (عربی قلمی) مجموعۂ فتاویٰ علیمی (کئی جلدوں میں اُردو قلمی) کے نام لیے جاتے ہیں[1]

مولانا عبدالعلیم کے چھوٹے بھائی اور مورخِ اسلام مولانا قاضی اطہر کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری (۱۲۸۸ھ-۱۳۵۹ھ) عالمِ باعمل، عربی کے بہترین شاعر، صاحب استعداد معلم و مدرّس، زبردست مصنف، خطاطی کے ہمہ اقسام کے ماہر، علم الادویہ، علم الابدان اور دواسازی میں مہارت تامہ کے مالک تھے۔ کتابوں کے بڑے عاشق تھے۔ ان کا کتب خانہ جملہ علوم وفنون کے نوادرات سے پُر تھا۔ مولانا کی پوری زندگی درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور تحقیق ومطالعہ میں گزری۔ ان کی مطبوعہ تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

(۱) تحفۃ الاحیاء (اُردو)۔ (۲) احسن المبرات (اُردو)۔ (۳) القلائدمن الفرائد (فارسی)۔ (۴) حاشیہ ملتقی الابحر (عربی)۔ (۵) حاشیہ قصیدہ (عربی)۔ (۶) سبیل الآخرت (اُردو)۔ (۷) تجہیزالاموات (اُردو)۔ (۸) مجرباتِ احمدی (اُردو)۔ (۹) دیوانِ احمد (مولانا کے عربی اشعار کا مجموعہ)۔

اُن کی غیر مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) حاشیہ سلم العلوم۔ (۲) حاشیہ مسلم الثبوت۔ (۳) حاشیہ میبذی۔ (۴) الخطب المبریہ۔ (۵) التحصیل والتکمیل (اُردو)۔ (۶) کتاب الفروق فی اللغۃ (عربی)[2]

مولانا عبدالعلیم رسول پوری کے صاحبزادے مولانا محمد شعیب رسول پوری (۱۳۰۹ھ-۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء) اپنے علم وعمل کی وجہ سے ہر مکتب خیال کے عوام وعلماء میں مقبول تھے۔ مدرسہ چشمۂ رحمت کے صدرالمدرسین تھے اور ہر علم وفن کی کتابوں کو پڑھانے میں مہارت رکھتے تھے۔ فقۂ حنفی کی

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری۔ تذکرۂ علمائے مبارک پور۱۹۷۴ء (ص: ۱۵۷-۱۶۷) ملخصاً

[2] ایضاً (ص: ۱۷۵-۱۹۰) ملخصاً

جزئیات پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ آپ کے درس سے صدہا تلامذہ نے استفادہ کیا۔ جن میں بعض کو اپنے دور میں بہت فروغ حاصل ہوا[1]

مولانا عبدالعلیم کے دوسرے لڑکے حکیم مولوی عبدالمجید متوفی ۱۳۸۳ھ ذکر و شغل سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا عبدالعلیم کے تیسرے بیٹے مولانا عبدالباقی ولادت ۱۳۰۰ھ اعظم گڑھ میں پیشۂ وکالت سے وابستہ تھے۔ مگر دین و دیانت اور مولویت کا غلبہ رہا اور تصنیف و تالیف سے بھی انھوں نے معاملۂ زندگی کا تعلق قائم کر رکھا تھا۔ مولانا عبدالباقی بچوں کی انگریزی تعلیم کا خرچ اور دوسری ضرورتوں میں رقم اپنے جیب خاص سے برداشت کرتے تھے۔ انھوں نے مبارک پور میں انگریزی تعلیم کی درسگاہ کی کی ''ایم. پی. انٹر کالج مبارک پور'' کی بنیاد رکھ کر ڈور فرما دی۔ ۳۱ راگست ۱۹۷۶ء کو وفات پائی، رسول پور مدفن ہے۔

مولانا قاضی اطہر کے ماموں مولانا محمد یحیٰ رسولپوری (۱۳۲۸ھ-۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) نہایت ذہین وطباع اور صاحب استعداد عالم تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ معقولات میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی، مناظرہ، مرایا، اکر، اسطرلاب کے جامع تھے۔ علمِ ہیئت اور فلکیات میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس دیار میں یہ فن ان پر ختم ہوگیا۔ فقہ، تفسیر، حدیث و معانی، بلاغت اور عربی ادب میں درجۂ استناد رکھتے تھے۔ تحقیق و تصنیف سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے کئی علمی و تحقیقی مقالات جرائد و مجلات میں چھپ چکے ہیں۔ عربی کے بہت باکمال شاعر تھے، انھیں منظوم تاریخ گوئی میں بھی اچھی دسترس حاصل تھی[2]

مولانا کی والدہ مرحومہ حمیدہ بنت مولانا حکیم احمد حسین رسول پوری متوفیہ ۲۲ ر ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ بڑی نیک اور عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔ اپنے گھر پر محلے کے بچوں کو قرآن مجید اور اُردو نوشت وخواند کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ فرصتِ کار کے لمحات میں اپنے اندر دینی و مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب و تحریص بھی رکھتی تھیں۔ اسی لیے انبیاء وصلحاء کے حالات و واقعات انھیں زبانی یاد تھے، جو گاہے گاہے قاضی صاحب کو بھی سناتی رہتی تھیں۔ مولانا قاضی اطہر ان کی آغوش محبت کو اپنی پہلی درسگاہ کہتے ہیں۔ انھوں نے ان سے اپنی دینی و مذہبی مزاج و معیار سازی میں کافی فیض مادری

1. قاضی اطہر مبارک پوری۔ تذکرۂ علمائے مبارک پور ۱۹۷۴ء (ص: ۲۵۴-۲۵۵) ملخصا

2. ایضاً (ص: ۲۶۱-۲۶۴) ملخصا

اٹھایا ہے۔ ان مرحومہ کی برزخی زندگی کا ایک تابناک اور مقبولیت کا پہلو قاضی صاحب کے والد میاں جی محمد حسن متوفی ۲۸ر فروری ۱۹۷۸ء کی گورکنی کے وقت سامنے آیا۔ جس کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ قاضی صاحب کے نام مولانا عبیدالرحمٰن قمر مبارک پوری کے تعزیتی خط محررہ ۴ر مارچ ۱۹۷۸ء میں بھی موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ظفر مسعود سلمہٗ (قاضی صاحب کے فرزند) کے خط کا ایک روشن پہلو بڑا ہی خوش کن رہا کہ جب والد مرحوم کی قبر کی کھدائی آپ کی والدہ مرحومہ (جن کو انتقال فرمائے ہوئے ۴۴ر سال گزرے ہیں) کے پہلو میں ہو رہی تھی تو ایک سوراخ نظر آیا۔ کفن تو کالا ہو چکا تھا مگر پھٹا نہیں تھا اور والدہ کی نعش مبارک بالکل صحیح و سالم حالت میں پائی گئی۔ اس سے ان کے عذاب قبر سے محفوظ رہنے اور جنتی ہونے کی دنیا ہی میں سب لوگوں کو بشارت ہوگئی اور لوگ جوق در جوق اس منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے۔ اس سے آپ کے گھر والوں نے غم واندوہ کے ساتھ ساتھ خوشی ومسرت کے آنسو بھی بہائے۔ اس لیے آپ کو تعزیت دینے والی اس جنتی ماں کے دنیا میں ہی ثبوت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ جن کے نیک اور صالح خون کی آمیزش آپ کے ایک ایک قطرہ خون میں گردش کر رہی ہے اور جن کی دعاؤں کے طفیل آپ کو تمام ممالک اسلامیہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہو رہی ہے''[1]

مولوی قمر مبارک پوری نے اپنے اس خط میں والدہ مرحومہ کے جنتی ہونے کی بشارت اسی دنیا میں لوگوں کو ہو جانے کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس اجمال کی تفصیل قاضی صاحب کی زبانی ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' سے پیش کی جاتی ہے:

''جس زمانے میں نانا مرحوم ڈھاکہ میں مدرس تھے، میری والدہ مرحومہ نے ایک خواب دیکھا، جسے ان کی خدمت میں لکھ کر تعبیر دریافت کی۔ اس وقت نانا نے کیا جواب دیا معلوم نہیں۔ مگر ۱۳۴۲ھ میں جب حج کو گئے تو وہاں سے اس کی تعبیر کے بارے میں مفصل خط تحریر فرمایا۔ یہ خواب اور اس کا تعبیری جواب والدۂ مرحومہ کے قرآن شریف میں مدتوں محفوظ رہا۔

---

[1] قاضی صاحب کے نام ایک تعزیتی مکتوب۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور، ضلع اعظم گڑھ (ص: ۳۹۵)

جناب چچا[1] صاحب! دام ظلہٗ

السلام علیکم۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے، جس سے طبیعت بہت پریشان ہے۔ آج یہ خواب آپ کو لکھ رہی ہوں۔ آپ تعبیر لکھ کر روانہ کریں تاکہ اطمینان ہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ قیامت قائم ہے، تمام خلق اللہ میدانِ محشر میں جمع ہے اور ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے..... میں ادھر اُدھر دیکھتی ہوں کوئی اپنا نظر نہیں آتا۔ اتنے میں میری نظر ایک مکان پر پڑی، جو نہایت چمکدار صاف وشفاف بنا ہوا ہے۔ اس میں چند حضرات نہایت اطمینان سے بیٹھے ہیں، ان میں آپ بھی ہیں۔ میں آپ کو دیکھ کر دروازہ پکڑ کر کھڑی ہوگئی، تاکہ آپ مجھے بھی اندر بلالیں۔ مگر آپ نے جب نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تو کہا کہ یہاں تمھارے لیے جگہ نہیں ہے۔ البتہ میں تمھیں گھر دلاؤں گا، تم اطمینان رکھو..... اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی.........۔

نورچشمی حمیدہ سلمہا

بعد دعا کے معلوم ہو کہ جس وقت بیت اللہ شریف پر میری پہلی نظر پڑی، فوراً تمھارا خواب یاد آگیا اور اس کی تعبیر بھی سمجھ میں آگئی کہ میں نے تم کو جنت میں گھر دلانے کا جو وعدہ کیا ہے اب اس کو پورا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ چناں چہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بیت اللہ شریف کا سات طواف کر کے ۲؍رکعت نماز پڑھی اور اس کا ثواب تمھارے نامۂ اعمال میں شامل کردیا اور تمھاری والدہ (یعنی بھابی کی والدہ) کے لیے بھی بیت اللہ شریف کا سات طواف کر کے اور ۲؍رکعت نماز پڑھ کر اس کے نامۂ اعمال میں اس کا ثواب شامل کیا۔ میں نے تم کو گھر دلانے کا جو وعدہ کیا تھا اسے آج پورا کردیا۔ اب اس گھر کو آباد رکھنا تمھارا کام ہے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا اور نفع ونقصان صرف اس کے قبضے میں ہے۔ اس اعتقاد اور اس پر عمل سے اس گھر کی آبادی ہے اور اس کے خلاف کرنے میں اس کی بربادی ہے۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ اب تم دونوں کا کام ہے کہ اسے آباد رکھو یا نہ رکھو۔ (احمد حسین از مکہ)

[1] محترمہ اپنے والد کو چچا کہتی تھیں، جیسا کہ بہت سے گھروں میں بچوں کی سنی سنا حقیقی بچے اور بچیاں اپنے والد کو اسی رشتہ سے خطاب کرتے ہیں، جو گھر کے اور بچوں کی زبان سے سنتے ہیں۔

نانی مرحومہ اور والدۂ مرحومہ دنیا سے اس عقیدے پر گئی ہیں کہ ان کے لیے جنت میں گھر پہلے ہی سے موجود ہے۔"[1]

قاضی صاحب کی نانی مرحومہ رحیمہ بنت حافظ شاہ نظام الدین سریانوی متوفیہ ۲۶ر رمضان ۱۳۷۸ھ خدا ترس اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ قاضی صاحب نے ان عابدہ و صالحہ خاتون کا بھی دودھ پیا ہے اور اس کی پاکیزگی سے اپنی انسانی کثافتوں اور آلودگیوں سے پاک ہونے کی سعادت پائی ہے۔

دادیہال اور نانیہال کی دین و دیانت، زہد و تقویٰ، روحانیت و مشیخیت، علم و فضل، اور دانش و حکمت کی تابندہ روایات رکھنے والی اس فضا میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے ۴ر رجب ۱۳۳۴ھ ۷ر مئی ۱۹۱۶ء کو صبح پانچ بجے مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو پہلی بار خوش آمدید کہا اور آیئنۂ ایام میں اپنی زندگی کے ماہ و سال کی تصویروں کو دیکھنا شروع کیا۔ ماں باپ کے نخلِ امید کے پہلے گلِ سر سبد تھے۔ پیدائش بھی محلہ پورہ صوفی اور حیدر آباد کے نقطۂ اتصال پر مولانا کے اپنے بیان کے مطابق موجودہ مسکونہ مکان (قاضی منزل) کے شمال میں سڑک کے بعد چوتھے مکان میں ہوئی۔ یہ نقطۂ اتصال بعد میں مولانا کے علم و قلم اور فکر و نظر کا ایسا محور یا مرکزِ ثقل بنا کہ ان کی تحریریں کبھی اس سے آزاد نہیں ہو سکیں اور وہ ہمیشہ فکری و علمی، نیز مسلکی و جماعتی ہیجان کے جوار بھاٹے میں بھی اتحادِ فکری، اور دینی و تہذیبی نقطۂ اتصال کی تلاش میں اپنا مثبت کردار اور تعمیری حق ادا کرتی رہیں۔ وہ کبھی تعصب و تحزب اور تنگ دلی کی دلدل میں نہیں پھنسے۔ مبارک پور کی گروہی عصبیت سے کسی مدرسے کے خوشہ چیں اور تربیت یافتہ ذہن و مزاج کا اس طرح دامن بچا جانا بجائے خود ایک امر حیرت اور ہزاروں تبریک کے لائق کارنامہ ہے۔ جو ہر کسی کے ظرف کی بات نہیں۔ یہ دانائے روزگار اور نابغۂ عصر ہی کی خصوصیات میں سے ہے۔

نانا مرحوم مولانا احمد حسین رسول پوری (۱۲۸۸ھ-۱۳۵۹ھ) نے آپ کا نام عبدالحفیظ رکھا۔ لیکن شاعری شروع کی تو قاضی اطہر لکھنے لگے۔ ایوب مبارک پوری متوفی ۳ر نومبر ۲۰۰۵ء کی منظوم تعزیت میں اسی حقیقت کا اظہار ہوا ہے:

شاعری کی بزم میں آ کر سخنور ہو گئے
تھے کبھی عبدالحفیظ اب قاضی اطہر ہو گئے

اللہ تعالیٰ نے اس چراغِ تہِ داماں کی ایسی حفاظت فرمائی کہ شاعری کے توسط سے

---

[1] تذکرہ علمائے مبارک پور۔ جون ۱۹۷۴ء (ص:۱۸۲-۱۸۳)

قاضی اطہر مبارک پوری کے قلمی نام سے مشہور ہی نہیں ہوئے انھوں نے اپنی خیال انگیز اور بصیرت افروز نگارشات کے زمزم و کوثر سے قلب ونظر کی ایسی تطہیر فرمائی کہ علمی وفکری دنیا عش عش کرتی رہ گئی۔ جس طرف ان کا اشہب قلم اپنا نورِ تحقیق لے کر پہنچا تاریخ کے چہرے پر امتداد زمانہ کی پڑی ہوئی موٹی موٹی تہیں صاف ہو گئیں اور قلتِ معلومات اور دقتِ مراجع کی شکایات ختم ہوتی گئیں۔ تلاش وتحقیق اور نئی دریافتوں کا جذبہ رکھنے والے افراد واصحابِ قلم کے ذہن وفکر میں علم وعرفان کے نور کی لکیریں پھیلتی چلی گئیں۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔

آپ کی پیدائش کے وقت مولانا احمد حسین رسول پوری ڈھاکہ میں درس و تدریس اور تعلیم وتعلم کے حوالے سے ذہن سازی وتعمیر شخصیت کا مبارک فرض انجام دے رہے تھے۔ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ:

> "وہاں کے مشہور ومعمر بزرگ حضرت شاہ عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن رمنہ نے نانا کو میری اور میرے ماموں عبدالباری مرحوم کی ولادت کی خوش خبری دی تھی اور ہم دونوں کے حق میں دعائے خیر بھی کی تھی۔"[1]

یہ دعائے درویش اور بشارتِ روحانی پوری عمر اپنا جلوہ روحانی دکھاتی رہی اور قاضی صاحب کی علمی وتحقیقی زندگی کو اسلام ومعاشرہ کے لیے باعثِ برکت بناتی رہی۔

قاضی صاحب اور بچوں کی طرح بازیچۂ اطفال اور لڑکپن کے کھیلوں میں اپنے ہم قبیلہ وہم محلہ ہم عمروں میں شریک رہتے تھے اور بعد کی سرگرمیوں سے ثابت ہوا کہ ان کھیلوں کے بنانے اور بگاڑنے میں تاریخی نشیب وفراز ثقافتی پیچ وخم، اور اقداری پیمانوں اور زاویۂ نظر کی بصیرت حاصل کر کے یہ خود کو آئندہ کے کارِ خلیلی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ کھیلوں سے عرفانِ زندگی حاصل کرنے کی اسی صلاحیت کی دین تھی کہ کھیل کود، سیر وشکار، صید مرغ وماہی اور کھیل کے سامان بنانے میں بھی اپنی کم سنی کے باوجود بڑے بوڑھوں کی طرح غلط طفلانہ شرارتوں اور ضرر رساں حرکتوں سے اپنے ہم جلیسوں کو منع کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ لڑکوں میں مولوی کے لفظ سے اتنے مشہور ہوئے کہ عمر درازوں میں بھی مولوی کی نسبت سے پکارے جانے لگے[2]۔ جب پڑھنے کی عمر ہوگئی تو گھر میں والد ووالدہ سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس کے بعد محلّہ کے ایک گھریلو مکتب میں کچھ دنوں تک زیرِ تعلیم رہے۔ جب تیسرے پارے کا سبق

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرہ ملیہ مبارک پور، ۱۹۸۷ء (ص:۹)　[2] ایضاً (ص:۱۰)

لے رہے تھے تو مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے حافظ علی حسن سے ختمِ قرآن کیا۔ اُردو زبان کی تعلیم منشی عبدالوحید لاہر پوری اور ریاضی کی واقفیت منشی اخلاق احمد املوی متوفی ۱۸/ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ کی توجہ خاص کا ثمرہ تھی۔ مولانا نعمت اللہ مبارک پوری متوفی ۲۸/ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ سے فارسی کتابوں کا درس لیا۔ اس کے علاوہ انھیں بزرگ سے اُردو اور عربی کی خوشنویسی بھی سیکھی۔ صفر ۱۳۵۰ھ تا شعبان ۱۳۵۹ھ تقریباً دس برس تک اسی مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کے باصلاحیت اساتذہ حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین متوفی ۲۲/محرم ۱۴۰۴ھ سے درسِ نظامی کی اکثر و بیشتر کتابیں۔ مولانا شکر اللہ مبارک پوری متوفی ۵/ربیع الاول ۱۳۶۱ھ سے منطق وفلسفہ کی زیادہ تعلیم یعنی مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، شرح جامی، ملاحسن، ہدیہ سعیدیہ، الجواہر العالیہ، میبذی، حمداللہ، قاضی مبارک۔ مولانا بشیر احمد مبارک پوری متوفی ۳/شوال ۱۴۰۴ھ سے علم منطق کی بعض کتابیں۔ مولانا محمد عمر مظاہری مبارک پوری متوفی ۱۳/اپریل ۱۹۹۵ء سے تفسیر جلالین وغیرہ اور اپنے حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری متوفی ۱۱/صفر ۱۳۸۷ھ سے عروض وقوافی اور ہیئت کے بعض اسباق کی تعلیم حاصل کر کے اُردو، فارسی اور عربی میں صاحبِ کمال ہوئے۔ آخری سال ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں دورۂ حدیث کے لئے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد گئے اور وہاں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد متوفی ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد۔ مولانا سید محمد میاں دہلوی متوفی ۱۶/شوال المکرم ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء سے سنن ترمذی اور مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی متوفی ۱۳۹۵ھ سے صحیح مسلم پڑھ کر ۱۳۶۰ھ میں سندِ فراغ حاصل کی۔ یہیں کے دورانِ تعلیم میں دو ماہ رہ کر مولانا محمد میاں صاحب سے دیوانِ حماسہ بابِ اول اور مقاماتِ زمخشری کو بھی پڑھا۔

قاضی صاحب کے سوانحی حالات پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کے ذوقِ مطالعہ کی قوتِ شامہ ایسی تیز تھی کہ وہ اچھی کتابوں کی مہک سونگھ لیتے تھے اور وہ کام کی کتابوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کتابوں کے عاشقِ صادق تھے اور کتابِ زندگی کے باذوق قاری بھی۔

قاضی صاحب نے اپنی طالب علمی کے دور ہی میں اپنی قوتِ مطالعہ، کثرتِ خواندگی، اور کتب بینی کی وجہ سے عربی زبان و ادب کے متعلقات و مبادی جیسے لغت، اشتقاق، ابواب، صِلات، نحو، صرف، خاصیات وغیرہ کے باب میں بڑی صلاحیت و بصیرت حاصل کر لی تھی۔ ان کا عربی ذوق

مقاماتِ حریری، دیوانِ حماسہ، دیوانِ متنبی، سبعہ معلقہ کے درس اور لغت وادب کی کتابوں کے مسلسل مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ابتداء میں کڑی محنت ومطالعہ کی برکت تھی کہ قاضی صاحب نے اپنی تعلیمی زندگی میں مشکل ترین مقامات اور ادق مضامین کو حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لی تھی۔ اپنی زندگی کے لمحاتِ سکوں کو کتاب ومطالعہ کے حوالہ کر دینے کی وجہ سے ان کا دورِ طالب علمی نہایت انبساط ونشاطِ علمی کی رفاقتوں میں گزرا۔ اس کڑی ریاضت علمی نے انھیں پتھر سے پارس بنا دیا اور حصولِ علم کے زمانے ہی میں مدرسہ احیاء العلوم کے عربی درجات کے تلامذہ کو بعض درسی ونصابی کتابوں کی تدریس وتفہیم کی ذمہ داری بھی ادارہ کے اربابِ بست وکشاد کی طرف سے اُنھیں تفویض کی گئی۔ جس کو مورخ مبارک پوری نے نہایت خوش اُسلوبی اور تمام تر علمی کامیابیوں کے ساتھ سرانجام دیا۔ اسی طرح جب طلباء کی ذہنی وفکری تربیت اور اضافۂ علم کے لیے احیاء العلوم میں جمعیۃ الطلباء کا قیام عمل میں آیا تو اس کے لیے کتب خانہ قائم ہوا اور جمعیۃ الطلباء کی طرف سے ایک قلمی رسالہ ''الاحیاء'' جاری کیا گیا۔ جس کی اِدارت قاضی صاحب کے ذمہ آئی۔ اس طرح حصولِ تعلیم کے زمانے ہی میں ان کے قلم کو اپنی آبیاری کا موقع ملا۔

مولانا کو ابتداء ہی سے علمی نوادرات وکتب کو جمع کرنے اور خریدنے کا شوق تھا۔ جو زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ انھیں کتب خانوں کی نازنینانِ حرم کے جھرمٹ میں حورانِ بہشتی کی رفاقت وناز برداری کی لذت محسوس ہوتی تھی اور افتادِ مزاج نے اس کتب بینی اور مطالعہ سے کبھی آشفتہ خاطری اور ضیق وکبیدگی کے احساس کو اُبھرنے نہیں دیا۔ جیسے محسوس ہوتا تھا کہ کتاب وقلم کے لیے ہی وہ پیدا کیے گئے ہیں اور کتاب وقلم ان کی دمسازی ورفاقت کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ واقعی حسبِ توفیق دونوں نے حقِ یاری خوب ادا کیا۔ قاضی صاحب کے گھریلو حالات ان کے کتاب وقلم کے ذوق کی آبیاری میں سدِراہ بن رہے تھے۔ انھوں نے جلد سازی کر کے اس کی رقم سے بڑی بڑی اور اہم کتابیں جمع کیں۔ کتاب ومطالعہ کے اسی ذوق کی وجہ سے ان میں مضمون نگاری اور شعروشاعری کا رجحان پیدا ہوا۔ اس طرح قاضی صاحب کا پہلا مضمون ''مساوات'' کے زیرِ عنوان رسالہ ''مومن'' بدایوں کے شمارۂ دسمبر ۱۹۳۴ء/۱۳۵۳ھ میں شائع ہوا جو ان کی تحصیلِ علم کا زمانہ ہے۔ اسی طالب علمانہ زندگی میں مولانا کی پہلی نظم ماہ نامہ ''الفرقان'' بریلی جلد ۵ر شمارہ ۶ر بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ کے صفحہ ۳۲ر پر ''مسلم کی دعا'' کے عنوان سے چھپی۔ بعد میں یہی نظم ''نالۂ اطہر'' کے زیرِ عنوان ماہ نامہ ''قائد'' مراد آباد کے شمارۂ دسمبر ۱۹۳۹ء/ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ میں صفحہ ۳۱ر پر بعض لفظی ترمیمات کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس وقت قاضی صاحب

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں دورۂ حدیث کے طالب علم تھے۔ یہ نظم مسدس کی صورت میں ہے، جس سے ان کی قادرالکلامی مترشح ہوتی ہے۔ اس نظم کا پہلا بند جو الفرقان میں مطبوع ہوا وہ یوں ہے:

الٰہی! پھر وہی ساقی، وہی میخانہ ہوجائے — حجازی وادیوں میں شورشِ مستانہ ہوجائے
شبستان جہاں توحید کا کاشانہ ہوجائے — ہر اک فردِ بشر اسلام کا پروانہ ہوجائے
الٰہی! پھر پتنگوں میں امنگ و سوز پیدا کر
الٰہی! پھر رخِ اسلام پر دنیا کو شیدا کر

مولانا مبارک پوری تکمیلِ تعلیم کے بعد شوال ۱۳۵۹ھ سے محرم ۱۳۶۴ھ تک یعنی ساڑھے چار سال تک اپنی مادرِ علمی احیاء العلوم مبارک پور میں درس و تدریس پر مامور ہوئے۔ وہ اپنی خفیہ صلاحیتوں سے عربی نصابِ تعلیم کے کامیاب مدرّس مانے گئے۔ پھر مدرسہ سے علیحدگی اختیار کرکے مولانا سید نورالحسن بخاری ملتانی سربراہ مرکزِ تنظیم اہلِ سنت امرتسر کے بلانے پر ۲۷، ۲۸ سال کی عمر میں ۲۴ نومبر ۱۹۴۴ء کو غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے امرتسر پہنچے۔ وہاں ۲۵ نومبر ۱۹۴۴ء سے ۱۲ جنوری ۱۹۴۵ء تک تقریباً ڈیڑھ ماہ مولانا بخاری کی شرکت میں مضمون لکھتے رہے۔ مولانا نورالحسن بخاری ملتان کے رہنے والے اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ وہ قاضی صاحب کے کلام کی وجہ سے ان کے علمی و شعری مقام سے پہلے ہی واقف ہوچکے تھے۔ ان کے بارے میں قاضی صاحب کا تاثر یہ ہے کہ:

''مولانا نورالحسن صاحب نہایت بااخلاق، قدرشناس اور حساس عالم تھے۔ ان کو اہلِ علم کی ضرورت کا پورا احساس تھا''[1]

۱۳ جنوری ۱۹۴۵ء کو مولانا فارقلیط اور منشی عبدالرحیم کے بلانے پر امرتسر سے لاہور گئے اور وہاں سہ روزہ ''زمزم'' کے دفتر سے مولانا فارقلیط کی نگرانی میں شائع ہونے والی تفسیر کی جمع و ترتیب میں ساٹھ روپیہ ماہوار پر لگ گئے۔ لیکن تیسرے ہی دن اس علمی کام کی اہمیت و دقت کے پیشِ نظر منشی عبدالرحیم نے سو روپیہ تنخواہ منظور کرلی۔ یہ تفسیر ''منتخب التفاسیر'' کے نام سے دن میں تقریباً دو صفحے لکھا کرتے تھے۔ اس کے بعد مولانا نے مبارک پور میں مدرسہ احیاء العلوم کی عارضی مدرّسی منظور فرمالی۔ کیوں کہ مولانا کے والد کی روانگیِ حج کی وجہ سے گھر پر ان کی موجودگی ضروری تھی۔ اسی دوران مولانا فارقلیط نے سہ روزہ ''زمزم'' کے روزنامہ ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے انہیں جلد لاہور پہنچنے کی تاکید فرمائی۔ قاضی صاحب

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ضیاء الاسلام شیخوپور (ص: ۵۴)

نے ۲۸ رجنوری ۱۹۴۷ء سے مولانا محمد عثمان فارقلیط کی تربیت میں صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور نائب مدیر کی جگہ سنبھالی۔ ملک کے سیاسی حالات کی اتھل پتھل نے انھیں لاہور کی علمی وادبی مجلس کو چھوڑنے پر مجبور کردیا جس کے نتیجے میں ۱۰ رجون ۱۹۴۷ء کو وطن واپس آگئے۔ تلاشِ روزگار میں بہرائچ گئے اور وہاں محرم ۱۳۶۷ھ تا رجب ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء) ہفتہ وار اخبار ''الانصار'' بہرائچ کے مدیر بن کر پرورش لوح وقلم کرتے رہے۔ حکومت اتر پردیش کی معاندت کی وجہ سے یہ اخبار سات ماہ میں بند ہوگیا۔ پھر کام کی تلاش ہوئی، اس وقت جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو مدرسین وطلباء کی تلاش تھی اور سفرِ خرچ بھی مدرسہ کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ انھوں نے وہاں کی مدرّسی قبول کرلی اور شوال ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء سے شعبان ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۹ء تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس وتدریس کے ذریعہ عہد سازی کے کام میں مصروف رہے۔ یہاں کا یک سالہ تدریسی دور مولانا کی علمی وقلمی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ ان کی مشہور کتاب ''رجال السند والہند'' کی داغ بیل یہیں پڑی۔ اس مدرسہ میں شرح جامی، مقاماتِ حریری، مختصر المعانی، سفینۃ البلغاء، النحو الواضح اور اسی قسم کی کتابوں کا درس قاضی صاحب کے ذمہ تھا۔ طلباء کی علمی استعداد بڑھانے کے لیے مولانا پوری دیانت داری اور معلمانہ ذمہ داری سے لغات وحواشی کی مدد سے پڑھاتے تھے۔ مگر یہاں کا نظام ہی کچھ ایسا تھا کہ بڑے بڑے نامی بزرگ ومدرّس یہاں سال بھر نہیں رہ پاتے تھے۔ چوں کہ یہاں افریقہ اور لندن وغیرہ جانے کے لیے گجراتی طلباء سند مولویت کی غرض سے پڑھتے تھے، تاکہ امامت وخطابت اور فتویٰ کے نام پر ان کو وہاں قیام مل جائے۔ اس لیے پڑھنے میں محنت بہت کم کرتے تھے[1] یہاں جو مدرّس گردن اٹھا کر لمبی چوڑی تقریر کرتا تھا اور اناپ شناپ حوالے دیتا تھا، وہ بہت قابل مانا جاتا تھا[2] اس صورتِ حال نے قاضی صاحب کے لیے مسائل پیدا کردیے۔ حالاں کہ بچپن ہی سے پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا اور اسی میں مزاج بنا تھا۔ اس لیے مدرّسی میں خوب جی لگتا تھا اور جم کر پڑھاتے تھے[3]

انھیں کا دوسرا بیان جو ان کے رجحانِ طبع پر روشنی ڈالتا ہے یہ ہے:

''میں خود اپنی مولویت سے دستبردار ہونے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ تھا مدرّسی اور تصنیف وتالیف میرا خاص ذوق تھا''[4]

مجبور ہوکر تلاش معاش میں قاضی صاحب بمبئی جیسے علم کش شہر میں ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ/

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور (ص:۸۲)

[2] ایضاً (ص:۸۳)   [3] ایضاً (ص:۴۴)   [4] ایضاً (ص:۹۴-۹۵)

نومبر ۱۹۴۹ء میں پہنچے اور وہاں جمعیۃ العلماء صوبہ بمبئی کے دفتر میں کام کرنے لگے۔ آٹھ مہینے گزر جانے کے بعد جب ۱۵ر جون ۱۹۵۰ء کو روزنامہ ''جمہوریت'' کا پہلا شمارہ اشاعت پزیر ہوا تو قاضی صاحب اس کے نائب مدیر تھے۔ ان کی محنت، لگن کی وجہ سے یہ روزنامہ جلد ہی بمبئی کا مقبول ترین اخبار بن گیا۔ جس سے روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی کی مقبولیت اور اس کا دائرۂ اثر بھی متاثر ہونے لگا۔ فروری ۱۹۵۱ء میں روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی سے منسلک ہوکر اس کے نائب مدیر بن گئے۔ قاضی صاحب کے مضامین اور قلمی نوادرات کی وجہ سے ''انقلاب'' کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس اخبار میں ہونے کو تو مولانا کے تین تین چار چار کالم ہوا کرتے تھے۔ مگر ان میں احوال ومعارف کو علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس میں ہر طرح کی معلومات ہوا کرتی تھی اور قدیم وجدید دونوں حلقوں میں اس کو مقبولیت حاصل تھی۔ ۲۳ر فروری ۱۹۵۱ء سے ۱۰ر اپریل ۱۹۹۱ء تک کے ''انقلاب'' میں مطبوع احوال ومعارف کو اگر کتابی صورت میں الگ الگ عنوانات کے تحت ترتیب جدید میں لایا جائے تو کئی معیاری کتابیں صورت پزیر ہوسکتی ہیں اور اس طرح یہ منتشر اور پھیلا ہوا کالم بھی علمی حلقوں میں مصادر ومراجع کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ مگر یہ کام ایک مردِ کار کی توجہ ہی سے تکمیلی صورت اختیار کرسکتا ہے۔

جب ۱۴ر مئی ۱۹۵۲ء کو ہفتہ روزہ ''البلاغ'' بمبئی کا اجراء ہوا تو اسی کے ساتھ ماہ نامہ ''البلاغ'' کی تاسیس بھی ہوئی اور دوسرے دو مدیروں کے ساتھ مولانا قاضی اطہر کو بھی اس کی ادارت میں شامل کیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد دونوں مدیران نے رسالہ سے ترکِ تعلق کرلیا۔ مگر مولانا مبارک پوری نے تقریباً ۲۶ر سال تک اس کو صحافت کی بلندی پر لے جانے کے لیے اپنا خونِ جگر پلایا۔

قاضی صاحب فنافی العلم قسم کے دانشور تھے۔ وہ بمبئی جیسے چکا چوند جدید وصنعتی شہر میں رہ کر بھی ایک مردِ درویش کی زندگی کا طرز وانداز اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرتے تھے۔ ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے علم ومعارف کی گتھیاں سلجھایا کرتے تھے۔ مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمی اعظمی اپنے مضمون ''قاضی اطہر مبارک پوری فکروفن'' مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ کے صفحہ ۲۴۹ پر مولانا قاضی اطہر کے بمبئی میں لکھنے پڑھنے والے کمرہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''میں ان کے ساتھ (یعنی معین الدین اعظمی کے ساتھ) دوسری یا تیسری منزل میں ایک غار میں گھسا۔ معلوم نہیں اصحابِ کہف کا تھا یا امام غائب کا۔ آگے چل کر روشنی نظر آئی۔

دیکھا تو قاضی صاحب تھے، چٹائی تھی، کتابیں تھیں اور قلم چل رہا تھا...... میں ہوں اور گوشۂ تنہائی ہے"۔

وہ زندگی کے ہنگاموں سے بے پروا ہو کر اپنی خلوتِ خاص میں تحقیق و تصنیف کی نازنینانِ حرم سے راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ سب سے کھلے ملے رہتے تھے۔ لیکن جب ان پر تخلیقی جذبہ غالب آ جاتا تو کوئی ان کو تنہائی کی قلمی عبادت اور علمی ریاضت سے نہیں روک سکتا تھا۔ وہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے تصنیف و تحریر کے خاکوں پر غور و فکر سے کام لینے کے عادی تھے۔ جیب میں ہر وقت کاغذ اور قلم کا اہتمام رکھتے تھے کہ مبادا کہیں کوئی خاص بات مل جائے اور وہ نقل کرنے سے رہ جائے۔ وہ زندگی میں معمولی اور کم حیثیت نظر آنے والی چیزوں کو بھی اہمیت دیتے تھے اور ان سے نتیجہ خیز کام نکالنے کی مہارت رکھتے تھے۔ وہ جب کوئی تحقیق کرتے تھے تو اس کے تمام بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی تڑپ کا اظہار بھی کرتے تھے۔ وہ علم کے بارے میں اتنے مخلص اور فراخ دل واقع ہوئے تھے کہ اپنے مضامین پر لکھے گئے استدراکات کو بھی اپنی کتابوں میں شامل کر لیا کرتے تھے۔ وہ کسی کی تحقیقی گرفت پر کبھی کبیدہ خاطر بھی نہیں ہوئے۔ جو ان کی علمی بلندی اور وسیع الظرفی سے عبارت ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے یہاں مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کے مضمون سے ایک حوالہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

> "جب خیر القرون کی درسگاہیں چھپ کر آئی تو...... اس کتاب میں حضرت ربیعۃ الرائے کا مشہور قصہ بھی شامل تھا۔ جس میں ربیعۃ الرائے کے والد کی ستائیس سال کے بعد خدمتِ دین اور جہاد سے گھر واپسی اور گھر کے دروازہ پر ربیعۃ الرائے سے ملاقات اور ان سے اختلاف کا تذکرہ تھا۔ (اپنے تبصرہ میں) راقم نے اس مشہور قصہ کے غلط اور بے بنیاد ہونے کا ذکر کیا۔ قاضی صاحب نے تبصرہ پڑھا اور پسند کیا اس وقت قاضی صاحب کے بڑے پن کا ایک اور نمونہ سامنے آیا۔ قاضی صاحب نے اسی وقت شیخ الہند اکیڈمی کو خط لکھا اور ہدایت کی کہ اس کتاب کی آئندہ اشاعت میں سے یہ روایت نکال دی جائے"[1]

وہ سوال کرنے والے کے مبلغ و ظرف سے زیادہ رہنمائی کرنے کے عادی تھے۔ ان میں اگر کوئی تحریص تھی تو علمی و دینی تھی۔ ان کے باطن کی علمی تحریک اور ذوقِ تجسس نے انہیں جہاں گرد اور

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۲۸۲-۲۸۳)

جہانیاں جہاں گشت بنا رکھا تھا۔ ان کے فقر میں دین و دانش کی سرمستی، ان کی بھوک اور پیاس میں مردِ قلندر کی بے نیازی، اُن کی جگرسوزی میں علمی نشاط، ان کے اضطرابِ ذہنی میں تحقیقی مزاج و مذاق رکھنے والوں اور علم کے جویا کے لیے طمانیت و لذت، ان کی تحقیقی سیماب پائی میں تہذیب و ثقافت کا مرکزِ ثقل نظر آتا تھا۔ یقیناً وہ شخصیت مجموعۂ کمالات تھی۔ ان کے کمالاتِ علمی پر کم سوادوں کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی، سو نہیں پہنچی، مگر جن پاک بینوں کو علم و معرفت کی بلند نگاہی حاصل تھی انھوں نے اس مردِ قلندر کی عظمتوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے میں اپنی عزت سمجھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کا ایک ایک حرف، ایک ایک جملہ، ایک ایک سطر صاحبانِ علم و بصیرت کی معلومات میں اضافہ کا سبب بن جایا کرتا تھا اور اہلِ قلم اُن کی تحقیقات سے جاں گسل اور استخواں شکن مرحلوں میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اُن کی طرف مراجعت کو ضروری سمجھتے تھے۔

وہ شخصیتیں جن سے مولانا متاثر ہوئے | مولانا کی ذہنی و فکری تشکیل اور دینی و مذہبی نفسیات کو سمجھنے کے لیے ان شخصیتوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جن سے اثر پزیری اور جن کے فیضِ صحبت کا اعتراف مولانا کو بھی ہے۔ اپنی تحریروں میں کہیں اجمالاً کہیں تفصیلاً انھوں نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

قاضی صاحب کی پہلی تربیت گاہ اور گہوارۂ علمی ماں حمیدہ بنت مولانا احمد حسین رسول پوری متوفیہ ۲۲رذیقعدہ ۱۳۵۲ھ کی آغوشِ شفقت ٹھہری۔ دوسرا مدرسہ نانی مرحومہ رحیمہ بنت حافظ شاہ نظام الدین سریانوی متوفیہ ۲۶ررمضان ۱۳۷۸ھ کی گود قرار پائی۔ مولانا کے حلق میں ان دونوں عابدہ و زاہدہ، پابندِ صوم و صلوٰۃ خواتین کا دودھ پڑا اور اس نے دل و دماغ کی ابتدائی ساخت میں اہم عنصر کی جگہ پائی۔ جب مولانا کے پڑھنے کی عمر آئی تو انھوں نے پہلے پہل اپنی والدۂ محترمہ اور والدِ مکرم ہی سے پڑھنا شروع کیا۔ مولانا اپنی والدہ اور نانی کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "والدۂ مرحومہ مجھے گود میں لے کر صبح کو قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتی تھیں...... نیز محلہ کے لڑکے اور لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں۔ اس وجہ سے بچپن سے مجھ کو دینی اور مذہبی معلومات سے دلچسپی ہوگئی تھی اور انبیاء علیہم السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، صحابۂ کرام رضی اللہ علیہم اجمعین اور بزرگانِ دین رحمہم اللہ کے حالات سے فی الجملہ واقفیت بھی ہوگئی تھی اور والدہ مرحومہ کی کتابیں الٹا پلٹتا تھا اس طرح ان کی گود میرا پہلا مدرسہ تھی

......الغرض والدہ مرحومہ اور نانی مرحومہ دونوں کی پرورش اور تربیت میں میرا بچپن گزرا ہے۔ جن کا ذہن ومزاج اور ماحول سراسر دینی، علمی، خدا پرستی اور خدا ترسی کا تھا''[1]

دوسری اہم شخصیت ان کے نانا مرحوم مولانا احمد حسین رسول پوری متوفی ۲۶ رجب ۱۳۵۹ھ کی ہے۔ جن سے مولانا کو بڑی تحریک ملی اور زندگی کے اچھے مقصد کو حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ ان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''مجھے ان کے علمی مشاغل کے دیکھنے کا زیادہ موقع ملا اور میرے ذوق کو بہت کچھ روشنی ملی جو میرے گھر ہی کی چیز تھی''[2]

وہ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''بچپن میں جب میں نانہال جاتا تھا تو کچھ پتہ نہ چلنے کے باوجود اسی کتب خانے اور الماریوں میں پڑا رہتا تھا۔ اسی زمانے سے مجھے کتابوں کا ذوق ہوا جو آگے چل کر کام آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا یہ علمی ذوق میرے نانہال کی دین ہے۔ جو والدہ کے ذریعہ مجھے نصیب ہوئی ہے''[3]

قاضی صاحب کے استاذ ومربی مولانا شکر اللہ مبارک پوری متوفی ۵ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء کا نام بھی انہیں محسنین علمی میں ہے۔ جنھوں نے قاضی صاحب کی دینی وملی، ادبی وعلمی اور ذہنی وفکری نشو ونما میں قطرۂ نیساں اور آبِ زلال کی حیثیت سے اہم حصہ لیا۔ مولانا کے درس نے قاضی صاحب کی جو فکری جہت اور علمی سمت متعین کردی تھی۔ قاضی صاحب نے زندگی کے کسی محاذ پر کبھی اس سے انحراف نہیں کیا۔ ایک جگہ ان کی احسان مندی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''میں ان کا آخری شاگرد ہوں، جسے نہایت ذوق وشوق سے پڑھایا۔ میری ہمت افزائی اور ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے''[4]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ طبع اول ۱۹۸۷ء (ص:۱۱) [2] ایضاً (ص:۱۴)

[3] تذکرۂ علمائے مبارک پور۔ دائرہ ملیہ مبارک پور جون ۱۹۷۴ء (ص:۱۸۵)

[4] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ طبع اول ۱۹۸۷ء (ص:۱۷)

''اگر مولانا شکراللہ صاحب اس طور سے میری دستگیری نہیں کرتے تو میں بہر حال مجبوراً کسی کام میں لگ جاتا اور سب کچھ کیا کرایا خاک میں مل جاتا''[1]

مولانا مفتی محمد یٰسین مبارک پوری متوفی ۲۲ر محرم ۱۴۰۴ھ بڑے نیک نفس، صاحب زہد و ورع، پابند شرع قسم کے بزرگ تھے۔ فقہ میں دور دور تک ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مولانا کی ذہن سازی میں دخیل تھے۔ ان کی عنایات معلمانہ کا حال یہ تھا کہ ۱۳۵۴ھ کے امتحان میں مقامات حریری میں اول آنے پر انھوں نے قاضی صاحب کو ایک روپیہ انعام بھی دیا تھا[2] وہ ان کے بارے میں مولانا اپنے تاثرات ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''مدرسہ احیاء العلوم کے عربی اساتذہ میں مولانا ... میرے سب سے پہلے استاذ ہیں اکثر و بیشتر کتابیں انہیں سے پڑھی ہیں۔ ان کی سادگی، نیک نفسی، خلوص اور شفقت سے مجھے بہت فیض پہنچا ہے''[3]

مولانا سید محمد میاں دہلوی بڑے پائے کے عالم تھے۔ کسی دور میں ان کا بڑا شہرہ تھا۔ عربی علوم پر گہری نگاہ تھی۔ مولانا قاضی اطہر نے ان سے مدرسہ شاہی مراد آباد میں جس کو جامعہ قاسمیہ بھی کہتے ہیں، حدیث کی اہم کتاب ''سنن ترمذی'' کے علاوہ درمیان میں دو ماہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہ کر ''دیوانِ حماسہ'' کا پہلا باب اور ''مقامات زمخشری'' بھی پڑھی تھی۔ مولانا قاضی اطہر ان کے تعلق سے اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں فرماتے ہیں:

''مولانا اپنے معاصرین میں کئی باتوں میں ممتاز تھے۔ زہد و تقویٰ، استغناء و بے نیازی، عزت نفس و خودداری کے ساتھ پوری زندگی تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف، علمی و دینی خدمات اور ملی و قومی کاموں میں بسر کی۔ مولانا مرحوم محدث، فقیہ، مفتی اور مصنف سب کچھ تھے۔ ان کے مختلف الجہات علمی و دینی کارنامے خصوصاً تصنیفی و تالیفی خدمات ایک اکیڈمی کی کارکردگی کے برابر ہیں''[4]

وہ ایک دوسری جگہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ (ص:۴۴)

[2] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ طبع اول ۱۹۸۷ء (ص:۲۸)　[3] ایضاً (ص:۱۷)

[4] ماہ نامہ ندائے شاہی۔ مراد آباد نومبر دسمبر ۱۹۹۹ء (ص:۴۳۶)

''مولانا عربی زبان کے ادیب، اُردو کے مصنف اور خالص دینی وعلمی مزاج کے آدمی تھے۔ان کے خلوص ومحبت اور ہمت افزائی سے مجھے بہت زیادہ فیض پہنچا ہے''۔[1]

مولانا آگے چل کر لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم اس سلسلے میں میرے اولین محسن اور مربی ہیں۔اگران کی توجہ نہ ہوتی اور رسالہ قائد میں مضامین شائع نہ ہوتے تو شاید میں تصنیف وتالیف کے لائق نہ ہوتا اور میری جولانی طبع نامساعد حالات کی نذر ہوگئی ہوتی''۔[2]

مولانا محمد یحیٰی رسول پوری متوفی ۱۱رصفر ۱۳۸۷ھ قاضی صاحب کے حقیقی ماموں بڑے ریاضی داں اور عربیت وادبیت میں نگاہ نکتہ رس کے مالک تھے۔ قاضی صاحب کی تربیت میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔مولانا قاضی اطہر نے ان سے فیض علم کی بات خود تسلیم کی ہے اور ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''نہایت ذہین وطباع اور جامع العلوم عالم تھے۔ان کی ذات سے مجھے بے حد فائدہ پہنچا اور انہوں نے میرے علمی ذوق کو بڑی جلا بخشی۔درحقیقت میرا علمی سرمایہ ننہال کی دین ہے اور وہیں سے میں نے یہ دولت پائی ہے''۔[3]

ملا رحمت علی مبارک پوری متوفی اندازاً ۱۳۶۰ھ جب ۱۹۱۷ء میں غلہ کیس ہار جانے کے بعد بمبئی سے مبارک پور آگئے تو قاضی صاحب عربی ادب میں ان کے خصوصی امتیاز کی وجہ سے ان کے بہت قریب ہوگئے اور ان کی صحبت سے عربی ادب میں رہنمائی حاصل کی۔ بقول قاضی صاحب ان کی علمی صحبت سے ادب وعربیت میں انہیں بہت فائدہ حاصل ہوا۔

مولانا محمد عثمان فارقلیط متولد ۱۹۰۱ء پلکھو ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔وہ عربی واُردو کے اچھے عالم ہونے کے علاوہ انگریزی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔اُردو صحافت میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ علم نفسیات میں خصوص وامتیاز کے مالک تھے۔جن سے اپنی صحافتی زندگی میں حالات وزمانہ کی رفتار اور اہم شخصیات پر لکھنے میں بڑا کام لیا۔مولانا کا اخبار''زمزم''نیشنلسٹ خیالات کا ترجمان ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کے خلاف پڑتا تھا۔وہ مسلم لیگ کے خلاف بڑی سنجیدگی ومتانت سے لکھا کرتے تھے۔قلم میں زور اور اسلوب میں تاثیر تھی۔اس پر نفسیات نے تحریر میں نشتر کی خوبی پیدا کردی تھی۔قاضی صاحب نے ان سے

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔دائرۂ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۷ء (ص:۱۸) [2] ایضاً (ص:۳۷)

[3] ایضاً (ص:۱۵)

صحافت میں ان کی باریکیوں کی آگاہی حاصل کی ادارت وغیرہ و لکھنے کا طریقہ سیکھا۔ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ

"۱۹۳۸ء دوری سے ۱۹۴۷ء تک مولانا مرحوم کی نگرانی اور زیر تربیت صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ مولانا میری صحافت کے استاذ ہیں اور املا و انشاء بھی میں نے ان ہی سے سیکھی ہے۔ انھوں نے لکھنا لکھانا سکھایا۔"[1]

قاضی صاحب کی تحریر میں مولانا فارقلیط کے طرزِ صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر نمایاں ہے۔

شادی | مولانا قاضی اطہر کی پہلی شادی مولوی احمد اللہ مبارک پوری متوفی ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جو مولانا قاضی اطہر صاحب کے فارسی میں استاذ بھی تھے۔ کسی وجہ سے ایک دو بار ہی کی رخصتی کے بعد علیحدگی ہوگئی۔ دوسری شادی محترمہ ساجدہ بنت محمد یعقوب صاحب ساکن ولید پور ضلع مئو کے ساتھ ہوئی۔ قاضی صاحب کی تمام اولاد انہی محترمہ کے بطن سے ہیں۔ ساجدہ کی پرورش و پرداخت ان کے نانا حافظ محمد زاہد ساکن محمد آباد گوہنہ ضلع مئو کے زیر تربیت ہوئی تھی۔ حافظ محمد زاہد مرحوم اپنے وقت کے اچھے حافظوں میں گنے جاتے تھے۔ بڑے نیک، متقی، پرہیزگار اور سادہ مزاج قسم کے بزرگ تھے۔ ان کے بیٹے مولوی حکیم محمد اکبر صاحب متوفی ۲۰۰۲ء مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور سے درسِ نظامی کے فارغ التحصیل تھے۔ لکھنؤ سے فنِ طب کی سند بھی حاصل کی تھی۔ حکیم محمد اکبر سہارن پور میں مولانا محمد عمر مظاہری مبارک پوری متوفی ۱۳ اپریل ۱۹۹۵ء کے ہم درس تھے۔ حکیم صاحب اپنے وطن محمد آباد گوہنہ میں آخری عمر تک مطب کر کے خلق اللہ کو فائدہ پہنچاتے رہے ہیں۔ ان کی طبابت کی بنیاد جلبِ منفعت نہیں، خلقِ خدا کی خدمت کا تصور تھی۔

قاضی صاحب کی حرمِ محترم ساجدہ بنت محمد یعقوب پابند صوم و صلوٰۃ ہونے کے ساتھ کثرتِ تلاوت سے خصوصی شغف رکھتی تھیں۔ قاضی صاحب کی والدۂ مکرمہ کی طرح انھوں نے بھی اپنے گھر پہ بچوں کے لیے مکتب کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور وہ محلے کے بچوں کو نہایت انشراحِ قلبی کے ساتھ قرآن مجید کی تعلیم اور دینی تربیت دیتی تھیں۔ انہیں دو بار حج بیت اللہ شریف کا شرف حاصل ہوا تھا۔ دوسری بار ہوائی جہاز سے اپنے فرزندِ اکبر مولانا خالد کمال (یکم دسمبر ۱۹۳۸ء - ۵ دسمبر[2] ۱۹۹۹ء) کے ہمراہ اس مقدس سفر پر نکلیں۔ دنیا سے ان کے جانے کی ادا بھی بڑی مبارک تھی۔ وہ اپنے میکے ولید پور اپنی بہن کو

---

۱ کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۵۸)

۲ یہ دسمبر کی تاریخ ہندوستان کے اعتبار سے ہے ورنہ نیوزی لینڈ میں جہاں انتقال ہوا ۶ دسمبر کی تاریخ تھی۔

سفرِ حج کے مبارک موقع پر الوداع کہنے کے لیے گئی تھیں۔ بہن کو رات گزار کر صبح میں سفرِ حج پر نکلنا تھا۔ انہوں نے نمازِ عشاء ادا کرتے ہوئے مصلے پر ہی بے ہوشی اختیار کر لی اور صبح ہوتے ہوتے بہن کے حج پر جانے سے پہلے ہی جہانِ گزراں کو الوداع کہتے ہوئے خود سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں:

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس طرح ان کی وفات بھی قاضی صاحب کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری اور ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کی متابعت میں گھر سے باہر ہوئی۔ انہوں نے مہاجرت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پایا۔ تینوں کی دنیا سے جانے میں کیسی یکسانیت ہے۔

انتقال سے کچھ پہلے مولانا قاضی سلمان مبارک پوری اپنی والدۂ محترمہ کو اپنے ساتھ گھر لانے کے لیے ولید پور گئے تھے۔ والدہ صاحبہ نے ان سے کہا کہ بہن کے حج پر چلے جانے کے ایک دو روز کے بعد گھر چلوں گی۔ وہ واپس آ گئے پھر چند ہی گھنٹوں کے بعد انہیں وفات کی اطلاع ملی۔ مولانا سلمان کے مقدر میں نہیں تھا کہ اپنی والدہ کو زندہ اپنے ساتھ گھر لاتے نوشتۂ تقدیر میں یہی تھا کہ مولانا سلمان اپنی ماں کی نعش کے ساتھ بادیدۂ تر مبارک پور آئیں۔ مبارک پور کے قدیمی قبرستان شاہ کے پنجہ میں قاضی صاحب کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔

اولاد و احفاد مولانا قاضی اطہر مبارک پوری دنیاوی نعمتوں کے اعتبار سے بھی خوش نصیب تھے۔ مولانا مرحوم کو کل آٹھ اولادیں ہوئیں۔ جن میں چھ اولادِ ذکور اور دو اولادِ اناث تھیں۔ مولانا کے دو بچے شریف انور اور انور جمال صغرسنی ہی میں فوت ہو گئے۔ مولانا نے علم و دینداری کی جو روایات آگے بڑھائیں، ان کی اولاد میں بھی تعلیم و تعلم اور دین و دیانت کی وہ وراثت پروان چڑھی اور سب کے سب لڑکے اور لڑکیاں تعلیم یافتہ اور صاحب صلاحیت ہوئے۔ بلکہ یہ سلسلہ اب اولاد سے گزر کر احفاد تک بھی آ گیا ہے اور ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کی بہترین مثال پیش کر رہا ہے۔

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم کے سب سے بڑے فرزند مولانا خالد کمال تھے۔ یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ان کی تاریخ ولادت ہے۔ بڑے ذہین و فطین اور خوش مزاج تھے۔ ابتدائی اردو کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی۔ اس کے بعد دو سال تک دارالعلوم دیوبند میں رہے اور دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے ۱۹۵۸ء میں سند فراغ

حاصل کی۔ تکمیل تعلیم کے بعد مدرسہ احیاء العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی میں درس وتدریس پر مامور ہوئے۔ جس کو آپ کے والد مرحوم نے ۱۹۵۱ء/۱۳۷۱ھ میں قائم فرمایا تھا۔ اسی دوران میں آپ کی خداداد صلاحیت وقابلیت سے متاثر ہوکر حکومت مصر کے قونصل جنرل عبدالمنعم النجار نے مشہور عالمی درسگاہ جامعہ ازہر میں سرکاری وظیفہ پر داخلہ کے لیے زور دیا۔ لیکن مولانا قاضی اطہر اسلامی تہذیب وثقافت کی اقدار پر دل وجان قربان کیے ہوئے تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر سخت ذہنی اذیت پہنچ رہی تھی کہ جامعہ ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے عموماً اسلامی لباس وتہذیب سے عاری اور بے ریش ہوا کرتے تھے اور اپنے رہن سہن میں یہود ونصاریٰ کا نمونہ بن جاتے تھے۔ اس لیے وہاں بھیجنے میں مولانا کو سخت تکلف وتامل تھا۔ مگر جب مدینہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو علمی وفنی کمالات اور دینی حمیت میں اضافہ کے لیے انتہائی نشاط وانشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں مولانا نے اپنے فرزند کا داخلہ کرادیا۔ ۵/برس تک لائق اساتذہ سے علم دین کی تکمیل کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں مدینہ یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ سے فارغ ہوئے اور حکومت سعودی عرب کی وزارتِ اسلامی امور کی طرف سے گھانا (مغربی افریقہ) میں مبعوث بناکر دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے مامور کیے گئے۔ مولانا خالد کمال کی علمی ودینی، اصلاحی وتبلیغی سرگرمیوں نے مغربی افریقہ کی قومی ودینی زندگی میں بڑی نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان کی کوششوں سے سعودی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر حج سے روکا۔ مولانا خالد کمال نے گھانا میں چودہ برس تک اہم دینی وعلمی خدمات انجام دیں۔ وہاں سے انگریزی میں "الطہر" کے نام سے ایک ماہ نامہ بھی جاری کیا۔ سعودی عرب نے مولانا خالد کمال کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۸۱ء میں نیوزی لینڈ تبادلہ کردیا۔ جہاں وہ اپنی وفات ۵/دسمبر ۱۹۹۹ء تک برسرِ کار رہے۔ آپ نے پندرہ بار حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔

مولانا خالد کمال عرب اہل زبان کی طرح متعلقات بلاغت کی شرائط کے ساتھ روانی سے عربی میں بات چیت کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی زبان دانی کے سلسلے میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اپنے مضمون "اہل حرمین سے ملاقاتیں" میں رقم طراز ہیں:

"بارہا ایسا ہوا کہ مدینہ منورہ کی ان علمی مجلسوں میں عزیزم خالد کمال ساتھ رہے اور اساتذہ وشیوخ سے گفتگو کے درمیان کہیں کوئی لفظ بروقت یاد نہیں آیا اور مطلب کی ادائیگی میں

وقت محسوس ہوئی تو وہیں باپ نے بیٹے کی طرف مراجعت کرلیا اور یہ بات بھی ان شیوخ واساتذہ کے نزدیک علمی شان کی ایک ادا بن گئی"۔[1]

احمد غریب مرحوم نے بھی اپنے ایک خط میں ہندو پاکستان کے علماء کے عربی میں بات چیت نہ کر پانے پر اظہار خیال فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"دو ہفتہ قبل مدینہ منورہ میں...... مولوی خالد کمال سے ملاقات ہوئی تھی۔ ماشاء اللہ دینی معلومات میں کافی ترقی کرلی ہے۔ ہمارے یہاں کے علمائے کرام وفضلائے عظام میں جو کمی محسوس کررہا تھا، انھوں نے وہ کمی بہت اچھی طرح پوری کرلی ہے۔ عربی میں گفتگو بہت اچھی کرلیتے ہیں اور اس چیز کی مجھ جیسے خادم علماء کو کھٹک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ہم بھائیوں نے یہاں ایک دعوت کی، جس میں چار پانچ ہندوستان و پاکستان کے علماء کو مدعو کیا۔ اسی موقع پر یہاں کے علماء کو بھی دعوت دی، عربی وعجمی دونوں پارٹیاں علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتی تھیں۔ کیوں کہ اپنے علماء عربی گفتگو پر قادر نہیں ہوتے ہیں"۔[2]

مولانا خالد کمال عربی زبان پر قدرت حاصل کرنے کے ساتھ علوم اسلامی میں بھی کافی درک رکھتے تھے۔

نیوزی لینڈ میں مولانا خالد کمال نے ایک عظیم الشان اسلامک سینٹر قائم کرکے اس میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کی یہ پہلی مسجد قرار پائی۔ اس کی تعمیر وتزئین کے لیے مولانا نے یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا۔

مولانا خالد کمال میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ ادیب وشاعر اور اسلامی دانشور بھی تھے۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں انھیں اپنے والد صاحب کی طرح قرطاس وقلم کی امانت حاصل ہوگئی تھی۔ ان کے مضامینِ نظم ونثر جو "البلاغ" اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے، ان سے ان کی علمیت اور ادبیت کا احساس ہوتا ہے۔ مولانا بڑی ہنس مکھ اور محفل کو زعفران زار بنادینے والی طبیعت کے مالک تھے۔ وہ جہاں بھی رہتے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ انہیں اداروں کو ترقی دینے اور ان اداروں کو قومِ مسلم کے لیے کارآمد بنانے کا بہت اچھا سلیقہ معلوم تھا۔

مولانا خالد کمال نے دعوت وتبلیغ اور دوسری دینی وملی مصروفیات کی وجہ سے فرصت کار بہت کم پائی۔ وہ عموماً مصروف رہا کرتے تھے۔ اس لیے صلاحیتوں کے باوجود ان کی ادیبانہ وشاعرانہ شان کا اظہار

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام (ص:۳۷۰) [2] ایضاً (ص:۳۶۲)

بہت کم ہو پایا۔ مولانا قاضی اطہر کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ توقع رکھتے تھے کہ تکمیل تعلیم کے بعد وہ تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوں گے اور ان کی توقعات کا اظہار بہت واضح ہوگا۔ مگر روزی کی عملی تگ و دو نے انہیں علم و قلم کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں دیا۔ پھر بھی مولانا خالد کمال نے نثر و نظم میں جو سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس سے ان کی علمیت و صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ مضامین کے علاوہ مقالہ نگاری اور شعر گوئی کی طرف بھی توجہ کرتے تھے۔ ان کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور ان کا شعری مزاج بہت شائستہ تھا۔

ان کی ایک نعت شریف بطور نمونہ کلام ذیل میں درج کی جا رہی ہے:

یہ کیا کم سارے عالم پر ترا احسان ہے ساقی — نہ جانے تشنہ لب کوئی ترا اعلان ہے ساقی
نہ بدلا ہے نہ بدلے گا کبھی دستور محفل کا — مرا کیا؟ ساری دنیا کا یہی ایمان ہے ساقی
وفاداری کی رسمیں چل رہی ہیں تیری بزم رنگیں میں — ہر اک مئے کش بذات خود ترا سلطان ہے ساقی
ترے در سے کوئی سائل کبھی داماں تہی اٹھا — ترے جود و سخا پر عقل کل حیران ہے ساقی
تری بزم محبت کی یہ یکسانی تعالی اللہ — نہ کوئی اجنبی ہے، نہ کوئی انجان ہے ساقی
امیری میں بھی راحت ہے فقیری میں بھی تسکیں ہے — غلامی کا تری نسخہ بہت آسان ہے ساقی
خوشی پر بھی وہ رقصاں ہے الم پر بھی خنداں ہے — گدائے کوچۂ غم کی نرالی شان ہے ساقی
گراں گزرے تو کیوں گزرے کسی کی عقل فطرت پر — موافق عقل و فطرت کے ترا فرمان ہے ساقی

تری بستی میں مدفن ہو ترے کوچے میں دم نکلے
تیری قربت کا خالد کو بڑا ارمان ہے ساقی

مولانا خالد کمال کو ہندوستانی تاریخ کے مطابق ۵/ دسمبر ۱۹۹۹ء کو نیوزی لینڈ میں غریب الوطنی کی موت آئی وہیں پیوند خاک ہوئے۔

مرتبہ بخشے شہادت کا
موت پردیش ہی میں آ دھمکی

مولانا خالد کمال کے ایک لڑکے فوزان طارق ہیں اور باقی اولادوں میں پانچ لڑکیاں ہیں۔ مولانا کی تمام اولادیں متاہل زندگی گزار رہی ہیں اور سب کی سب نیوزی لینڈ میں مقیم ہیں۔ ان کا وطن آنا جانا رہا کرتا ہے۔

فوزان طارق کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں ہوئی۔ پھر نیوزی لینڈ میں یونی ورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی اور عربی پڑھنے کے لئے قاہرہ بھی گئے۔ فوزان طارق اس وقت نیوزی لینڈ میں سرکاری صیغۂ ملازمت سے وابستہ ہیں۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے دوسرے صاحبزادے قاضی حاجی ظفر مسعود صاحب ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۴۱ء/ ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ ہے۔ اُنھوں نے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور سے پرائمری درجات پاس کرنے کے بعد ایم. پی. انٹر کالج سے ۱۹۶۰ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ جامعہ اُردو علی گڑھ سے ۱۹۶۱ء میں ادیب ماہر، ۱۹۶۲ء میں ادیب کامل کی سندیں حاصل کیں۔ پھر دینی و مذہبی تعلیم کے لیے مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم مئو سے پہلی پوزیشن میں عالم کا امتحان پاس کیا۔ دو مرتبہ شرف حج بیت اللہ بھی حاصل کیا۔ ۱۹۶۸ء میں فخر المحدثین علامہ سید فخر الدین شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند نے آپ کی علمی لیاقت سے خوش ہو کر خصوصی سندِ حدیث سے نوازا۔ قاضی ظفر مسعود کی علمی و دینی سرگرمیوں سے کئی میدان سرسبز ہیں۔ انھیں مشاعروں، ادبی تقریبات اور علمی گفتگو سے خاص تعلق خاطر ہے۔ مطالعہ کے موضوعات میں بڑا تنوع اور پھیلاؤ ہے۔ مبارک پور میں لڑکیوں کی پہلی انگریزی درسگاہ ''انصار گرلس انٹر کالج'' کے بانیوں میں سے ہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی انجمنوں، لائبریریوں اور اداروں کو وجود میں لانے کا فخر حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں موقع محل کے اچھے اور معیاری اشعار خوب از بر ہیں اور ان کے استعمال میں بڑی برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انھوں نے مولانا قاضی اطہر کے سلسلے میں کئی اشاریے ترتیب دیے ہیں۔ جو تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کا بہتر فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نو اولادوں کی ابویت کا شرف بخشا ہے۔ جن میں صرف ایک لڑکے مولوی قاضی فرحان سلمہٗ ہیں۔ ان کی ولادت ۱۱ر نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوئی۔ ان کی ابتدائی اُردو اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی اور ایشیا کی شہرۂ آفاق درسگاہ دار العلوم دیو بند سے انھوں نے فراغت پائی۔ گھر پر عائلی زندگی گزار رہے ہیں اور کاروبار میں اپنے والد کی مدد کر رہے ہیں۔

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری علیہ الرحمہ کے تیسرے فرزند مولانا قاضی سلمان مبشر مبارک پوری (ولادت یکم جنوری ۱۹۵۴ء) ہیں۔ اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم احیاء العلوم میں پانے کے بعد ایک سال کے لئے دار العلوم دیو بند گئے۔ وہاں سے سندِ فراغ لینے کے بعد ۱۹۷۴ء میں

جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں کلیۃ الدعوۃ واصول الدین کی تکمیل کی اس کے بعد حکومت سعودیہ عربیہ کی طرف سے مبلغ و مدرس کا امتیاز دے کر (گھانا) مغربی افریقہ میں مامور کیے گئے۔ وہاں اہل و عیال کے ساتھ چودہ برس رہ کر قوم و ملت کی اہم خدمات سر انجام دیں۔ ۱۹۹۲ء میں حکومت سعودیہ نے تبادلہ کر کے ہندوستان بھیجا یہاں کے مختلف مدارس میں اُنھوں نے تعلیم دی۔ اس وقت جامعۃ البنات جین پور ضلع اعظم گڑھ میں مدرس ہیں۔ آپ نے چھ مرتبہ حج کیا ہے۔ اپنے والد مورخ مبارک پوری کے علمی و دینی کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لیے دل میں تڑپ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں مختلف افراد و ادارہ سے مسلسل رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ مولانا مرحوم کی جن کتابوں کے ایڈیشن ختم ہوگئے ہیں ان کی اشاعت ثانی اور جو کتابیں منتظر اشاعت ہیں ان کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی تگ و دو میں اپنے وقت عزیز اور صرف کثیر کو لگا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعیٔ جمیلہ کو شرفِ قبولیت بخشے۔ مولانا قاضی سلمان مبشر کے حبالۂ عقد میں مورخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے حقیقی ماموں حضرت مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کی صاحبزادی ہیں جن کے بطن سے پانچ اولادیں ہیں ان میں تین اولادِ ذکور اور دو اولادِ اناث ہیں۔

بڑے صاحبزادے قاضی فیصل ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم (گھانا) مغربی افریقہ میں حاصل کی پھر ۱۹۸۸ء میں اپنے تایا مولانا خالد کمال کے سایۂ شفقت میں رہ کر نیوزی لینڈ میں تعلیمی مراحل کا آغاز کیا۔ وہاں کے مختلف اسکول، کالج اور یونی ورسٹی میں تعلیم مکمل کی۔ وکٹوریہ یونی ورسٹی ولنگٹن سے بی ایس سی کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ قابلیت حاصل کر کے اسی شعبہ میں ملازمت کر لی۔ پانچ سال کے بعد کمپنی نے انھیں اپنی نئی برانچ سڈنی (آسٹریلیا) میں کارِ منصبی کی انجام دہی کے لئے بھیج دیا جہاں اب تک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ برسرِ کار ہیں۔

دوسرے صاحبزادے قاضی محمد ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم گھانا میں ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ یہاں ۲۰۰۱ء میں ایم۔اے۔ ویسٹ ایشیا اسٹڈی میں ٹاپ کیا اور مڈل کے مستحق ہوئے۔ اس وقت سڈنی (آسٹریلیا) میں بسلسلۂ اعلیٰ تعلیم مقیم ہیں۔ تیسرے لڑکے قاضی ریان احمد ہیں۔ جنھوں نے گھانا میں پڑھنے کے بعد مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کے شعبۂ فارسی میں داخلہ لیا۔ اس وقت شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج اعظم گڑھ میں ایم کام کا کورس کر رہے ہیں۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی حسان احمد (متولد یکم

جمادی الآخر ۱۳۷۳ھ) ہیں۔ جنھوں نے مدرسہ احیاء العلوم سے اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کر کے شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج اعظم گڑھ سے بی۔اے۔کیا۔اس کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا۔اس وقت ''انصار گرلس انٹر کالج'' میں امور مفوضہ کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں۔ان کی پرورش و پرداخت میں آٹھ اولادیں ہیں، جن میں ۲؍ذکور اور ۶؍اناث ہیں۔ان کے بڑے بیٹے قاضی عدنان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی اور سندِ فراغ مظاہر العلوم سہارن پور سے حاصل کی۔اس وقت ''مرکز المعارف'' بمبئی میں انگریزی زبان دانی کا کورس کر رہے ہیں۔

امۃ الرحمٰن ام سلمہ (پ: یکم مارچ ۱۹۴۸ء/ ۱۹؍ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ) مولانا قاضی اطہر کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ جو اپنے ننہالی رشتے میں محمد آباد گوہنہ ضلع مئو کے رہنے والے ماسٹر مصباح الدین محمد رافع سے منسوب ہیں۔اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ ماسٹر مصباح الدین مولانا قاضی اطہر کی حرم محترمہ کے ماموں زاد ہیں۔شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی۔ایس۔سی۔کر کے گورکھ پور یونی ورسٹی سے ایم۔ایس۔سی۔کیا۔۱۹۶۷ء سے اسلامیہ انٹر کالج فیروز آباد میں بائیلوجی کے لکچرار ہوئے یہیں ۲۰۰۵ء سے پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں۔مع اہل و عیال فیروز آباد میں قیام ہے۔

مولانا قاضی اطہر کے نواسے سعد الدین نے فیروز آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے فیضِ درس اٹھایا۔اس کے بعد منی پال (کرناٹک) سے ڈینٹل کورس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے نیوزی لینڈ گئے۔تکمیل تعلیم کر کے وہیں ایک سرکاری اسپتال میں طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا کی چھوٹی بیٹی شمیمہ عائشہ (پ:۵؍شعبان ۱۳۷۹ھ) ماسٹر رضوان احمد علیگ نوادہ مبارک پور کے عقد مناکحت میں ہیں۔ جو مولانا کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کے نواسے ہیں۔ انھوں نے مبارک پور میں تحصیل علم کر کے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی راہ لی اور وہاں رہ کر بی۔اے۔کیا۔اس کے بعد ملک سعود یونی ورسٹی ریاض (عرب) میں تکمیل درس کی، بسلسلۂ تجارت بمبئی میں قیام ہے۔ چھ اولاد میں چار اولادِ نرینہ اور دو اولادِ اناث ہیں۔ان کے بڑے لڑکے صفوان ہیں۔جن کی ابتدائی تعلیم مبارک پور میں ہوئی انٹر فیروز آباد سے کیا۔اس وقت بمبئی میں الکٹرک انجینیرنگ کا کورس کر رہے ہیں۔دوسرے لڑکے شیبان ہیں انھوں نے مبارک پور میں تعلیمی سلسلہ شروع کر کے شبلی کالج اعظم گڑھ سے انٹر کیا۔اس وقت برہان پور (ایم۔پی) میں بی۔یو۔ایم۔ایس۔کا میڈیکل کورس

گزرے ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا قاضی اطہر کے علمی اخلاصِ نیت کے اثرات کو اللہ تعالیٰ نے اولاد و احفاد اور قریب کے رشتہ تک میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ خداوند قدوس کی بہت بڑی دین ہے۔

نظریۂ تعلیم نسواں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری تعلیم نسواں کے زبردست مؤید و حمایتی تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ذہن بہت کشادہ تھا اور صرف نظریۂ تعلیم ہی نہیں، ان کے تمام نظریاتِ حیات اور ذہنی وفکری ارتعاشات قرآن و حدیث سے مستفاد تھے۔ انہوں نے اسلام کی ابتدائی دینی و علمی سرگرمیوں، صحابہ وصحابیات کی نجی زندگی، قرن اوّل کے حالات و واقعات کا اتنی گہرائی اور ذہنی بیداری کے ساتھ مطالعہ کیا تھا کہ انہیں اپنے نظریات کی تائید میں فوراً مستند و معتبر حوالے مل جاتے تھے اور اس میں انھیں کوئی جاں فشانی یا کتابوں کی دیر تک ورق گردانی کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ ان کا حافظہ بہت قوی، ان کا مطالعہ بہت تازہ، ان کی نظر بہت باریک بیں تھی۔ اس لیے وہ ایسے ایسے نکتے بیان کرتے تھے اور حوالوں کے انبار لگا دیتے تھے کہ احساس ہونے لگتا تھا کہ یہ کوئی ایک عام انسان نہیں بلکہ ان کی حیثیت ایک چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا جیسی ہے۔ قاضی صاحب کا ایک خط جامعۃ الصالحات بھٹکل (کرناٹک) کے صحیفہ ''ترجمانِ جامعۃ الصالحات'' بابت نومبر ۱۹۸۰ء مطابق محرم ۱۴۰۱ھ کے صفحہ ۹ پر شائع ہوا ہے۔ جس سے مولانا کے نظریۂ تعلیم نسواں پر روشنی پڑتی ہے۔ اُس خط کے الفاظ یہ ہیں:

> ''مسلمان بچیوں کو براہِ راست عربی زبان میں دینی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ مسلمان بچوں کی تعلیم عربی زبان کے ذریعہ ضروری ہے۔ چناں چہ ''رجال وطبقات'' کی کتابوں میں مردوں کی طرح عورتوں کی علمی و دینی خدمات کے تذکرے موجود ہیں اور صنفِ نازک نے بھی قرآن و حدیث، فقہ و فتویٰ، زہد و تصوف اور ارشاد و تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ان میں ان اسلامی علوم و فنون میں بڑی بڑی عالمات و محدثات اور فقیہات و مفتیات گزری ہیں۔ معلوم نہیں بعد میں کن بنیادوں پر عورتوں کی تعلیم کے بارے میں جائز و ناجائز اور مقدار کی بحث چل پڑی''۔

اس اقتباس سے مولانا کی کشادگیِ فکر اور ان کی وسعتِ مطالعہ کے ساتھ اس نکتے کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ ہماری قومی وملی زندگی کے مسائل و مقتضیات کو قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ کی

روشنی میں دیکھنے کی تڑپ رکھتے تھے اور ان ہی مراتب و مصادر کی روشنی میں وہ زندگی کے رخ کا تعین چاہتے تھے۔ وہ ہر معاملہ میں مغرب کی طرف نظر اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ عورتوں کی گود بچوں کی پہلی درس گاہ اور اولین تربیت گاہ ہوتی ہے۔ اگر عورتوں میں تعلیم و مطالعہ کی کمی رہی تو اس کا اثر اولاد کی ذہنی و فکری زندگی پر بھی پڑے گا اور کم علم ماؤں کی آغوش میں تربیت پانے والے بچے سماج اور اپنے مذہب کے لئے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکیں گے۔

یہاں مولانا کے ایک اور مضمون مورخہ ۲۹ رجولائی ۱۹۷۴ء دوشنبہ سے چند سطریں پیش کی جارہی ہیں۔ جن سے مولانا کی بلند خیالی اور مطالعہ کی وسعت کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

"بنات اسلام نے دینی علوم اور کتاب و سنت کی تعلیم و ترویج پر مردوں کے دوش بدوش کام کیا ہے۔ ان میں محدثات، فقیہات، مفتیات، عابدات، زاہدات، صوفیات، مقریات، قرایات گزری ہیں۔ قرن اول میں احادیث و آثار کی روایت کا سلسلہ شروع ہوا تو صحابیات اور تابعین و تابعیات نے مل کر تحدیث و روایت میں کام کیا ہے اور کتنے ہی خاندانی شرعی علوم ان خواتین اسلام کی وجہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ جنھوں نے اپنے والدین، دادا، دادی، نانا، نانی، بھائی بھتیجے اور خاندانوں سے روایت کر کے دوسروں اور باہر والوں تک اسلامی تعلیمات پہنچائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دور اول میں عورتوں سے بڑا کام لیا ہے۔ جب کہ گھروں اور خاندانوں کے افراد سے احادیث و آثار کی روایت کی ضرورت تھی۔ پھر جب چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی میں مسلمانوں میں طرح طرح کے داخلی اور خارجی فتنے پیدا ہوئے اور خاص کتاب و سنت کے بجائے دوسرے علوم کا رواج ہوا، سیاسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہوا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بنات اسلام میں قرآن و حدیث اور خاص اسلامی علوم کا ذوق پیدا کیا اور ان ادوار میں بڑی شیخات اور مسندات پیدا ہوئیں۔ جن سے ائمہ دین اور حفاظ حدیث نے کسب فیض کیا اور بہت سے بلاد و امصار میں یہی محدثات اور عالمات و فاضلات علم حدیث کا ستون تھیں"۔

مولانا نے نظریۂ تعلیم نسواں کے بارے میں صرف مکتوبات ہی میں اظہار خیال نہیں فرمایا بلکہ انھوں نے اپنی کتاب "بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات" میں پوری تاریخ اسلام کا جائزہ لے کر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مسلمان عورتوں کی تعلیم کس قدر ضروری اور اہم مسائل میں سے ہے۔ انھوں نے

ان موضوع پر مکمل کر خامہ فرسائی کی ہے کہ ہمارے بہت سے لاینحل مسائل کا حل تعلیم نسواں میں ہے۔
انھوں نے انتہائی سنجیدگی اور پوری علمی متانت کے ساتھ کسی کا نام نہ لے کر ایسے تعلیمی خیالات ونظریات کی تردید کی ہے۔ جن سے عورتوں کی تعلیم اور ان کی مقدار تعلیم کے راستے میں رُکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔ مولانا نے اس باب میں قرن اول کو بنیاد بنا کر جو کچھ لکھا ہے اس کے حوالے سے انھوں نے موجودہ دور کی تمام نسوانی علمی بے بضاعتی، فکری کم مائیگی اور خواتینِ اسلام کی دینی بے بصیرتی کو دور کر کے عورتوں میں علومِ اسلامی کی تحصیل کا جذبہ پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہاں اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اوروں نے ان مسائل پر گفتگو کے لیے مستشرقین اور مغربی مفکروں کے نظریۂ تعلیم کا سہارا لیا ہے۔ مگر مولانا کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج تحقیق کے مطابق صرف اور صرف اسلامی شخصیتوں اور اَدوار سے استفادہ کر کے اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ ہر معاملہ میں جس طرح آرنلڈ، گوئٹے، ڈارون، فرائڈ، ہیگ، کمایاو، برگساں، برکلے، نطشے کے نظریے سے ہٹ کر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ وصحابیات اور تابعین ومحدثین کے طبقے سے استنباط کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کا انداز انھوں نے اس باب میں بھی اختیار کیا ہے۔ جس سے ان کی فکر، خالص اسلامی فکر بن گئی ہے۔ اس کی اثر پزیری سے کسی اہلِ علم کو انکار نہیں ہوسکتا۔

مولانا وحید الدین خاں اسلامیات پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ مگر اپنی تحریروں میں مستشرقین یورپ اور انگریز اسکالروں کے حوالے بکثرت لاتے ہیں۔ ان کے بارے میں علی گڑھ کے ایک سی می نار منعقدہ ۱۹۶۸ء کے حوالے سے قاضی ظفر مسعود چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''مولانا وحید الدین خاں کہتے تھے کہ قاضی صاحب! میرے سفر علی گڑھ کا حاصل یہ رہا کہ میں آپ کو سمجھ سکا۔ جب کسی معاملہ میں وہ کسی انگریز کا حوالہ دیتے تو والد صاحب ٹوکتے کہ خاں صاحب ہمارے اکابر میں فلاں صاحب نے اس معاملے میں یہ بات کہی ہے، اس کا حوالہ کیوں نہیں دیتے''[1]

ان کی اسی علمی گہرائی اور اسلامی ودینی تاریخ وثقافت اور عہد ورجال سے ان کی واقفیت کا مولانا وحید الدین خاں پر ایسا زبردست اثر ہوا کہ انھوں نے نہایت انشراح وانبساط کے ساتھ اعتراف کیا کہ علی گڑھ سی می نار کا حاصل یہ رہا کہ میں آپ کو آج پہلی بار پہچان سکا ہوں۔

---

[1] قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۲۷۵)

تلامذہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اپنی جوہر شناس نگاہوں سے سنگریزوں میں ہنر کی کرنیں دیکھ لیتے تھے اور اپنے فیضانِ نظر سے شبنم کو گہر بنا دیتے تھے۔ شاگردوں کے ساتھ ان کا یہ فیض جاری تھا۔

مولانا درس و تدریس کے باقاعدہ سلسلہ کو زیادہ دنوں تک جاری رکھنے کا موقع نہیں پا سکے۔ ان کی باضابطہ مدت مدرّسی مدرسہ احیاء العلوم اور ڈابھیل کی ملا کر کل پانچ سال گیارہ ماہ کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی میں ۱۹۶۰ء سے دس برس تک پڑھایا تھا۔ جس میں جز وقتی اور کل وقتی دونوں طرح کے درس شامل ہیں۔ اسی طرح بہرائچ کے دورِ قیام میں مدرسہ نور العلوم میں بھی بعض کتابیں طلباء کو پڑھانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ جب ''شیخ الہند اکیڈمی'' دیوبند کی دیکھ ریکھ کے لیے جاتے اور وہاں پندرہ دن یا ایک مہینہ قیام کرتے تو طلباء کو پڑھانا شروع کر دیتے تھے۔ اس نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو قاضی صاحب کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد نکل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کو اپنے مذاق و مزاج کے نشاط کی خاطر طلباء کو پڑھنے پڑھانے میں خاص لذت محسوس ہوتی تھی۔ کیوں کہ وہ بنیادی طور سے ایک اچھے مصنف ہی نہیں تھے، مشرقی درسیات کے علوم مروجہ پر حاوی ایک اچھے مدرّس بھی تھے۔ لیکن ان کے تلامذہ کے نام عام طور پر نہیں ملتے۔ ذیل میں ان کے چند مشہور تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے مدرسے میں یا کسی دوسری طرح سے ان کے درس سے استفادہ کیا اور ان کی نسبت شاگردی کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھا۔

مولانا محمد عثمان معروفی، اچھے مدرّس، خطاط، تذکرہ نگار، شاعر اور تقویم شناس عالم تھے۔ انھوں نے مولانا قاضی اطہر مبارک پوری سے مدرسہ عربیہ احیاء العلوم میں مقامات حریری کا درس لیا تھا۔ اس کے علاوہ مضمون نگاری میں بھی ان سے رہنمائی حاصل کی تھی۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی دعوت و اصلاح کے کارِ جہاں سازی میں خصوصی اہمیت و صلاحیت کے مالک ہیں۔ اچھے معلم و مربی، صاحب ذوق اور پختہ قلم مصنف اور دلوں کی دنیا بدل دینے والے خطیب بھی ہیں۔ مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ کی قیادت انھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی سرپرستی میں یہیں سے ایک علمی و دینی ماہنامہ ''ضیاء الاسلام'' بھی شائع ہو رہا ہے۔ اس کا قاضی اطہر مبارک پوری نمبر علمی و دینی حلقوں میں دستاویزی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مولانا اعجاز صاحب نے بھی مولانا قاضی اطہر صاحب سے ان کے گھر حاضر ہو کر ''مقاماتِ حریری'' پڑھ کر اپنی عربیت و ادبیت میں اضافہ کیا ہے۔

مُلّا محمد یونس شکیب مبارک پوری (۲۱ر مئی ۱۹۲۳ء/ ۲ر جون ۱۹۹۷ء) موجودہ دور میں

اصلاح پسند داؤدی بوہرہ جماعت کے سربراہوں میں بلند درجہ کے مالک تھے۔ انھیں عربی واُردو اور گجراتی زبان میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت تھی۔ کئی مذہبی کتابوں کے مصنف و مترجم اور صحافی بھی تھے۔ ''ادارۂ ادبیاتِ فاطمی'' کے نام سے ان کا ایک ادارہ بھی تھا۔ جو اُن کی کتابوں اور دوسری مذہبی کتابوں کی اشاعت کے لیے وجود میں آیا تھا۔ انھوں نے احیاء العلوم مبارک پور میں قاضی صاحب سے عربی کا درس لینے کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ السیفیہ سورت (گجرات) میں تعلیم کی تکمیل کی تھی۔ غزل، نوحہ، اور نعت بھی کہتے تھے۔ کئی جگہ علمی و دینی خدمات انجام دینے کے بعد آخر میں تصنیفی وتبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے افریقی ملک ماریشش میں اقامت گزیں رہے۔ انتقال سے چند روز پہلے مبارک پور آگئے تھے۔ ملا رحمت علی کے بیٹے تھے۔ ملا یونس کے اور بھائیوں نے بھی قاضی صاحب سے عربی کی تعلیم پائی تھی۔ جس کا تذکرہ قاضی صاحب نے اپنے حالات میں کیا ہے۔

ماسٹر الحاج سید محی الدین سے مولانا قاضی صاحب کو خاص تعلقِ خاطر تھا۔ وہ ماسٹر صاحب سے وطنی نسبت کی وجہ سے بڑا اُنس رکھتے تھے۔ قاضی صاحب نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''ان کا آبائی وطن الو ہے۔ پیر زادہ خاندان سے ہیں۔ اُس وقت وہ بمبئی میں اُردو ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ خاندانی آدمی ہیں۔ میں جس زمانہ میں کھانڈ امحلہ خان منزل کے اُوپر رات کو ''مفتاح القرآن'' پڑھاتا تھا۔ وہ بھی پڑھنے آتے تھے۔ حالاں کہ وہ ہیڈ ماسٹر تھے۔...... میری طرح وہ بھی وطن (سارین ضلع اعظم گڑھ) ہی میں رہنے لگے''۔[1]

محمد، احمد غریب متوفی ۶ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۶۷ء، حافظ محمد صدیق اور عبدالکریم موحد حق پرست میمن تھے۔ یہ چاروں بھائی میمنی، اُردو، انگریزی اور عربی زبانوں سے واقف تھے۔ یہ لوگ بہت بڑے تاجر تھے۔ مگر دل و دماغ میں خیر وصلاح اور تقویٰ کا جذبۂ وافر بھی رکھتے تھے۔ بمبئی میں جامع مسجد کے پاس اور مکہ مکرمہ میں شارع فیصل پر ۱۹۴۴ء سے ان کی دو دکانیں تھیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور علی میاں ندوی سے نسبت عقیدت رکھتے تھے۔ احمد غریب ''میمن ویلفیر'' اخبار میں مولانا دریابادی کے مضامین کا ترجمہ لکھتے تھے۔ مسافر خانہ صابو صدیق میں انجمن خدام النبی کی روحِ رواں تھے۔ ۹ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ/۱۴ مئی ۱۹۵۴ء کو ہفتہ وار ''البلاغ'' کا اجرا اور ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی کی تاسیس انہیں کی علم دوستی کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ یہ چاروں بھائی اس زمانہ میں بمبئی کے دینی وعلمی اور فلاحی وقومی رفاہ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ (ص:۱۰۱)

حصہ لیتے تھے۔ جب آزادی کے بعد مسلم اقلیت مسائل کی ریگستانی دھوپ میں ایک معمولی خیمے کی طرح بچھتی گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ ایک ذہنی وروحانی پست زندگی کا شکار ہوگئی تھی۔ اس دور میں مسلم عزائم کے تمام راستے مسدود کردیے گئے تھے۔ لیکن ان بھائیوں کی خوش حالی وسرمایہ داری ابرِ فیاض بن کر قوم کی شادابی کا سامان کرتی رہی۔ ان کی فیاضیوں اور کشادہ دلی کی علامتوں میں دینی تعلیمی کنونشن بمبئی منعقدہ [illegible] اہم ہے۔ جس نے مسلمانان ہند کے ذہنی وفکری اور تعمیری وتعلیمی رخ کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حافظ محمد صدیق تاجر ہونے کے ساتھ روحانیت کی طرف بھی مائل تھے۔ ان میمن برادران کے صاحبزادگان بھی نیک وصالح ہیں۔ حافظ محمد صدیق کے صاحبزادے حافظ محمد امین نہایت نیک وصالح اور جدہ کے بڑے تاجر ہونے کے علاوہ دینی وعلمی شغف بھی رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ قاضی صاحب کے بعد بھی ان کے لڑکوں سے وہی رشتۂ اخوت باقی رکھے ہوئے ہیں، جو قاضی صاحب کی زندگی میں نمو پذیر تھا۔ قاضی صاحب نے ان چاروں میمن برادران محمد، احمد غریب، حافظ محمد صدیق، اور عبدالکریم کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی ذات سے مجھے بے حد علمی فائدہ ہوا اور وہ لوگ میرے محسن اعظم ہیں اور انھوں نے اپنی خودنوشت "کاروان حیات" میں شرح وبسط کے ساتھ تفصیل سے لے کر ان کا تذکرہ کیا ہے۔[1]

قاضی صاحب نے ان بھائیوں کو "ریاض الصالحین" کا سبق دیا تھا اور یہ تعلیمی سلسلہ ان لوگوں کے بمبئی سے پاکستان چلے جانے تک باقی رہا۔ قاضی صاحب کی تحریر کے مطابق ان لوگوں نے ان سے "ریاض الصالحین" کو دو بار پڑھا، صحیح مسلم کا ایک خلاصہ، اور المنتقی لابن جارود کو بھی ان سے پڑھا اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں کے بھی اسباق لیے۔[2]

بمبئی میں مولانا بدرالدین اجمل قاسمی قاضی صاحب کے خصوصی شاگردوں میں خصوص وامتیاز کے مالک ہیں۔ انھوں نے قاضی صاحب سے مدرسہ امدادیہ چونا بھٹی بمبئی میں تعلیم پائی ہے۔ بڑے تاجر ہونے کے ساتھ دولت دین بھی کمارہے ہیں اور اس طرح عطریات کی خوشبو بانٹنے کے ساتھ ساتھ دینی وملی سرگرمیوں کو بھی اپنی جہد پیہم اور بارشِ جود وعطا سے سرسبز رکھے ہوئے ہیں۔ انھیں قاضی صاحب کی علمیت وعبقریت کا بڑا اعتراف واحساس ہے اور آج بھی قاضی صاحب کے صاحبزادوں سے ربط محبت واخوت استوار کیے ہوئے ہیں۔ اسلام اور اسلامی قدروں سے ان کی محبت وشیفتگی میں قاضی صاحب کی

[1] کاروان حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص:۱۰۳)

[2] ایضاً (ص:۱۰۳)

دین وابستگی کا اہم حصہ ہے۔ تعلیم وتعلم کی بساط علمی ہرا جڑے دیار میں بھی بچھے یہ مولانا بدرالدین اجمل قاسمی کی تمنائے دلی ہے۔ ان کی سرگرمیوں کو دیکھ کر زبان پر بے ساختہ یہ مصرع آجاتا ہے: ع

ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

اس وقت دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین اور شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے فعال ڈائرکٹر ہیں۔

یونس اگاسکر اُردو دنیا کا معروف نام، مراٹھی زبان وادب پر اہل زبان کی طرح عبور، اُردو کے مشہور محقق وناقد، اور لسانیات وسماجیات پر گہری نظر۔ اپنے والد محمد امین اگاسکر کے انتقال کے بعد ایک فرشتہ خصلت حاجی محمد ابراہیم جعفر کے سایۂ عاطفت میں بچپن کے داغ یتیمی کو بھول گئے۔ حاجی صاحب کی مربیانہ شفقتوں نے ان کو کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ یونس کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو بھیونڈی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں کی ہے۔ رئیس ہائی اسکول سے ایس. ایس. سی. کے بعد سینٹ زیویرس کالج بمبئی میں داخل ہوئے۔ بمبئی یونی ورسٹی سے اُردو اور عربی کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں بی. اے. کیا اور اچھے نمبر لانے پر یونی ورسٹی سے گولڈ میڈل کے مستحق بنے۔ جرنلزم کا ڈپلوما ۱۹۶۷ء میں کیا، ۱۹۶۹ء میں سماجیات سے ایم. اے. کیا۔ اُردو، فارسی کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں مکرر ایم. اے. ہوئے اور اپنی صلاحیتوں سے اول رہے۔ ۱۹۷۴ء میں بمبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے دوسالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان لنگوسٹکس کا امتحان دیا۔ ڈاکٹریٹ کے لیے ''اُردو کہاوتوں کے سماجی ولسانی پہلو'' پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ ملازمت کا آغاز ۱۹۶۸ء میں رئیس ہائی اسکول کی معاون مدرّسی سے ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر میں ریسرچ فیلو کرنے لگے اور ''بنیادی ہندوستانی لغت'' پروجیکٹ پر کام کیا اور ''بنیادی ہندوستانی'' کی ریڈرس تیار کیں۔ ۱۹۷۳ء میں مہاراشٹر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس بمبئی کے شعبۂ اُردو سے متعلق ہوئے۔ مراٹھی زبان وادب اور تاریخ وتہذیب کو مضامین وترجمہ کے ذریعے اُردو میں پیش کر رہے ہیں۔ مختلف ادبی، تنقیدی، سماجی، لسانی موضوعات پر قلم اُٹھانے کے ساتھ افسانے پر بھی توجہ کی۔ مقبول استاد، محنتی ادیب ومحقق، معروف صحافی، ماہ نامہ ''نقش کوکن'' کے مدیر، ماہ نامہ ''شاعر'' بمبئی کے معاون مدیر کی حیثیت سے ان کی اہم خدمات ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''مراٹھی ادب کا مطالعہ'' ان کی علمیت ومحققانہ بصیرت کا قطب نما ٹھہری۔ انہیں اُردو، مراٹھی کے سماجی، ثقافتی، لسانی پس منظر کا گہرا شعور حاصل ہے۔ مراٹھی شعروادب کے ترجمہ میں اصل کی روح اور طرز کو باقی رکھ کر اپنی لسانی مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اُنھوں نے قاضی صاحب سے بمبئی میں فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

قاضی صاحب کے قدیم اور خصوصی شاگرد مولانا شہاب الدین اعظمی بھی ہیں۔ جو بچپن سے بھیونڈی میں مقیم ہیں۔ عربی کی تعلیم وہیں مدرسہ مفتاح العلوم سے حاصل کی اور فراغت دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی۔ تقریباً بیس سال تک اس مدرسہ کے ناظم رہے۔ ان کی سرگرمی اور خصوصی زرِ تعاون سے ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ کے ''مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نمبر'' کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

موضع بسہم ضلع اعظم گڑھ سے نسبت وطنی رکھنے والے اُردو کے اہم محقق عبدالرزاق قریشی بمبئی کے علمی وادبی اور تعلیمی حلقوں میں معروف تھے۔ وہ انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی سے متعلق اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں برسرِ کار تھے اور اس کے اہتمام میں شائع ہونے والے علمی وتحقیقی جریدہ کے مدیر بھی تھے۔ ان کی کتاب فنِ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہترین رہنما ثابت ہوئی ہے۔ وہ قاضی صاحب سے عربی کا درس لیتے تھے اور اس زبان میں انھوں نے اچھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے شاگردوں میں مولانا عبدالحنان اعظمی (پ: جنوری ۱۹۳۲ء) جامعہ رشیدیہ بمہور ضلع اعظم گڑھ کے ناظم کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ انھوں نے مدرسہ احیاء العلوم میں قاضی صاحب سے نحو وصرف کا درس لیا، مظاہر العلوم میں بھی تعلیم پائی ہے اور دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۵۴ء/ ۱۳۷۳ھ میں تحصیل فراغ کی۔ صوبہ بنگال کے مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مدرسہ قرآنیہ اور مدرسہ حسینیہ جونپور وغیرہ میں منطق وفلسفہ، اصول فقہ، نحو وصرف، عربی ادب وانشا کی تعلیم دی۔ انھوں نے اپنی مادرِ علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے طلباء کو بھی باقاعدہ درس دیا۔ اُن کے شاگردوں میں بعض کی عالمانہ ومعلمانہ حیثیت بہت بلند وو قیع ہے۔

قاری انوار الحق مبارک پوری متوفی ۷؍جنوری ۲۰۰۱ء/ ۱۱؍شوال ۱۴۲۱ھ فارغ دیوبند نے بھی قاضی صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔ وہ بڑے اچھے قاری اور خوش الحان نعت خواں بھی تھے۔ قاضی صاحب کا کلام دینی اجلاس میں سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے احیاء العلوم مبارک پور اور جامعہ اسلامیہ بنارس میں تدریسی خدمت انجام دی تھی اور احیاء العلوم مبارک پور کی نظامت بھی فرمائی تھی۔

مولانا عبدالمنان باسو پاری کی پوری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری۔ وہ احیاء العلوم کے اچھے مدرّس شمار کیے جاتے تھے۔ بعد میں اس کے شیخ الحدیث ہوئے اور تاحیات یہیں رہے۔ انھوں نے قاضی صاحب سے احیاء العلوم میں فیضِ درس اٹھایا تھا۔ ۱۸؍رمضان ۱۴۱۷ھ/ ۲۸؍جنوری ۱۹۹۷ء میں وفات پائی۔

مولانا عبدالرؤف منصف مبارک پوری بڑی علمی گہرائی اور پرانے نصابِ تعلیم کے شرائط پر

حاذق علم رکھنے والے عالم دین ہیں۔ جامعہ علوم میں انتصاص کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو کے شاعر بھی ہیں اور مفتی بھی۔ کبھی جامعہ الفلاح بلریا گنج کے نامور اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علمی و دینی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے بھی قاضی صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی ہے۔

حضرت مولانا مفتی ظہور احمد خاں صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے صدر شعبۂ افتاء نے عربی کی تعلیم اپنے مولد و منشاء مبارک پور کے مدرسہ احیاء العلوم میں حاصل کی۔ مورخ اسلام کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ فراغت ندوہ سے ہوئی۔ ابتداء سے ہی یہاں افتاء اور تدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ اس وقت ندوہ کے مفتی، مدرس اور نائب مہتمم کے ساتھ شعبۂ تعمیرات کے ناظم بھی ہیں۔ نیک طبیعت، سادہ دل، انتہائی خلیق اور ملنسار ہیں۔ کارِ مفتی کو بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

مولانا قمر الدین رسول پوری (متوفی جمعہ ۲۲ مئی ۱۹۹۱ء) کو بھی قاضی صاحب سے نسبت شاگردی کا امتیاز حاصل ہے۔ ان کا شمار مدرسہ منبع العلوم خیرآباد ضلع مئو کے لائق اساتذہ میں ہوتا تھا۔ مولانا عبدالباری قاسمی کی حیات میں احیاء العلوم کے نائب ناظم تھے۔ ان کی وفات ۵ دسمبر ۱۹۸۱ء کے بعد انہیں مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کی انتظامی ذمہ داری سونپی گئی۔ پھر جلد ہی مدرسہ حجازیہ میں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔

مولانا محمد عوف پیلتے پور ضلع سیتا پور کے متوطن و متولد احیاء العلوم کے اچھے طالب علم ہونے کے علاوہ یہیں سے دورۂ حدیث کر کے فارغ ہوئے۔ قاضی اطہر صاحب کے نمایاں شاگرد رشید ہیں۔ درس و تدریس کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں، امام جمعہ اور مقرر و خطیب ہونے کے ساتھ حکمت میں بھی دست گاہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مدرسہ تعلیم القرآن پیلتے پور کا اجراء کیا۔ اس کی زمام کار بھی انہیں کی چابک دستی سے اپنا سلسلۂ جنبش رکھتی ہے۔ تحریکی ذہن کے مالک ہیں۔ تبلیغی و دینی اور اصلاحی و فلاحی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں اور معاشرہ کا روحانی و جسمانی علاج بھی کرتے ہیں۔ یہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں جامع مسجد کی تعمیر کے لیے ہونے والے چندہ میں اپنے استاد گرامی مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی پر جوش نظمیں وجد آفرین ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ یہ مبارک پور میں بیرونی طالب علم بن کر نہیں بلکہ گھر کی طرح رہتے رہے ہیں۔

مسٹر خالد انصاری (فرزند عبدالحمید انصاری) مشہور صحافی اور روز نامہ ''انقلاب'' بمبئی کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں مولانا قاضی اطہر سے اپنی دینیات کی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔

مسٹر خالد موجودہ میڈیا اور نشریات کی جدید دنیا میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں صحافت کے اسرار وغوامض کی ماہرانہ واقفیت اپنے والد گرامی سے ورثے میں ملی ہے۔

مولوی محمد شعیب محشر صادقی نظام آبادی اُردو کے اچھے شاعر وادیب اور صحافی تھے۔ نظام آباد کے اسکول میں اُردو کے اتالیق مقرر تھے۔ مولانا عبدالحمید اعظمی صدر جمعیۃ العلماء ضلع اعظم گڑھ کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑی ملنسار اور متواضع طبیعت تھی۔ نعمتِ اولاد سے محروم رہے۔ انھوں نے احیاء العلوم میں قاضی صاحب کی تدریسی نکتہ سنجیوں کے جواہر پارے اپنے دامن میں سمیٹے تھے۔

انھیں کے دوست اور ابراہیم پور ضلع اعظم گڑھ کے مشہور شاعر وادیب وصحافی محمد عمر سیفی الاعظمی مدیر سادات اور کئی دوسرے اخبار ورسائل کی ادارت کو سرسبز کرنے والے مشاعروں کے ناظم تھے۔ وہ عمر کے آخری حصے میں احیاء العلوم کے صیغۂ تدریس سے متعلق ہوگئے تھے۔ قاضی صاحب کے چشمۂ علم سے احیاء العلوم میں اپنی علمی پیاس بجھائی تھی اور علمِ دین کے ساتھ کارِ ادب سے واقفیت حاصل کی تھی۔ بڑے زودنگار اور خوش گو شاعر تھے۔ علامہ کیفی چریاکوٹی کے دبستان شاعری سے اکتسابِ فن کیا تھا۔

قاضی صاحب نے ایک جگہ اپنے سلسلۂ تدریس پر اظہارِ خیال فرمایا ہے، جس میں انھوں نے بعض تلامذہ کا نام بھی لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”علمی سلسلے کی درازی اور افادیت کس قدر عام ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس مدرسہ (مدرسہ فلاح دارین ترکیسر، سورت) میں یوں ہوا کہ راقم کے حلقۂ تلامذہ کے کئی نوجوان عالم یہاں درس وتدریس میں مشغول ہیں۔ اس کے اولین مدرّس حافظ عبدالغفور انتولے مدرسہ مفتاح العلوم بھیمڑی کے ابتدائی طالب علموں میں ہیں۔ جسے راقم نے قائم کیا تھا اور مدتوں اپنی نگرانی میں چلایا تھا۔ یہ تو براہ راست میری علمی خدمت کا ثمرہ ہیں۔ میں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں قیامِ بمبئی سے پہلے تعلیم دی تھی۔ یہاں جن طلباء نے مجھ سے تعلیم حاصل کی اور خصوصیت سے تعلق رکھا، ان میں دو عزیز مولانا عبداللہ اسمٰعیل مہتمم فلاحِ دارین ترکیسر (سورت) اور مولانا احمد ابراہیم بیمات استاد حدیث فلاحِ دارین ہیں جو اَب تک اس علمی ودینی رشتہ کو جگائے ہوئے ہیں“[1]

ان کے علاوہ بھی اس دیارِ گجرات میں مولانا کے متعدد تلامذہ نے ان سے تعلیم پائی تھی۔ مگر ان کے

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے۔ قاضی اطہر اکیڈمی لکھنؤ ۲۰۰۵ء (ص: ۲۲۴)

نامُوں کا علم نہیں ہوسکا۔ مولانا کے سفرنامہ میں ایک خالص دینی سفر کے عنوان سے ۷رنومبر ۱۹۶۴ء کے ایک سفر کا ذکر آیا ہے، اس میں انھوں نے گجرات کے متعدد مقامات پر اپنے شاگردوں کی اطلاع دی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

> ''نوساری اور سورت کے درمیان ڈابھیل کی بستی ہے۔ جسے ایک زمانہ میں بڑی علمی مرکزیت حاصل تھی۔ عالم اسلام میں اچھی خاصی علمی ودینی شہرت رکھتا تھا۔ مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثانی جیسے فضلائے دہر اس میں کتاب وسنت کا درس دیتے تھے اور عرب وعجم کے طالبانِ علم وفیض یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے بمبئی آنے سے پہلے سفر سے پہلے راقم نے بھی ایک سال یہاں تاریخ وادب عربی اور دوسرے دینی علوم کی مدرسی کی ہے اور اس کی برکت سے اسے علاقۂ گجرات سے ایک علمی ودینی نسبت قائم ہوگئی ہے۔ یہاں کے متعدد مقامات پر راقم کی نسبت ظاہر کرنے والے اہل علم موجود ہیں جنہوں نے اس زمانہ میں تلمذ کیا۔''[1]

عربی وفارسی میں مولانا کی علمی صلاحیت قابل رشک حد تک اچھی تھی۔ وہ کتابوں کے نکات ودقائق خوب سمجھتے تھے اور سمجھا بھی دیتے تھے۔ اس طرح کے لوگ جو اُن سے وقتاً فوقتاً افہام وتفہیم میں رہنمائی حاصل کرتے تھے ان کی تعداد تو بہت ہے مگر نامعلوم ہے۔ ایک واقعہ سے مولانا کے تبحر علمی کا اندازہ ہوسکتا ہے:

> میں امرتسر سے مرکز تنظیم اہل سنت کے نشریات کے سلسلے میں لاہور جایا کرتا تھا اور اکثر رات کو اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں سوجاتا تھا۔ اسی درمیان میں پنجاب کے کسی کالج کے پروفیسر پنجاب یونی ورسٹی میں امتحان دینے کے لیے آئے اور اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں قیام کیا۔ ایک رات وہ ''دیوانِ غنی کشمیری'' کا مطالعہ کر رہے تھے، جو نصاب میں داخل تھا۔ ایک غزل کے اشعار حل کرنے میں ان کو مشکلات درپیش تھیں اور دیر تک اُلجھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی پریشانی دیکھ کر کہا کہ کتاب لائیے میں بھی ذرا دیکھوں اور تھوڑی دیر مطالعہ کرنے کے بعد میں ـ نے پوری غزل کا مطلب ان کو سمجھا دیا۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے جب اپنا وطن اعظم گڑھ بتایا تو انھوں نے کہا کہ جبھی آپ نے ان مشکل اشعار کو اتنی جلدی حل کر دیا''۔[2]

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے۔ قاضی اطہر اکیڈمی لکھنو ۲۰۰۵ء (ص: ۱۲۷-۱۲۸)

[2] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۵۳)

بمبئی میں سید اشفاق حسین (ایکسپریس ٹاک) کے دونوں لڑکے سید آصف حسین اور سید ثاقب حسین بھی قاضی صاحب کے تلامذہ میں ہیں اور ان دونوں نے زندگی بھر ان سے خصوصی تعلق رکھا۔ جب مدرسہ تجارتیہ کا اجراء [illegible] میں ہوا تو یہ دونوں بھائی تعاون میں پیش پیش رہے۔[1]

قاضی صاحب کا بڑا کمال یہ ہے کہ بمبئی جیسے معاش و تجارت کے شہر میں رہنے کے باوجود ان کا دامن استغناء آلودہ نہیں ہوا اور روسا کے آستانوں کی گرد سے ان کی پیشانی محفوظ رہی۔ اس شہر نگاراں میں بڑے بڑے دنیا بیزاروں کے زہد و اتقاء بھی دولت کی میزان میں تولے جاتے ہیں اور ان کی عظمت بھی زر اندوزی کی قدر سے ناپی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے طریقے سے تجارت پیشہ طبقے کے دل و دماغ میں دینی علوم کے حصول اور ان میں اسلاف کی گم شدہ پونجی کو پانے کی جوت جگا دی۔ اس لیے بڑے بڑے تاجران سے شرف تلمذ حاصل کرنے میں سعادت محسوس کرنے لگے اور رونقِ بازار جن کی نگاہوں کے اشارے پر رقص کرتی تھی، ان کے بھی لڑکے ان سے علم و حکمت کا درس لے کر ان کے احترام میں پوری عمر اپنے سر کو جھکائے رہے۔ معاش و تجارت اور دین و دانش کے درمیان بامعنی رشتوں کی دریافت اور ان کی بارآوری قاضی صاحب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے تجارت کی میزان کے ایک پلڑے میں علم کو رکھ کر تاجروں کو یہ دکھا دیا کہ مال کے مقابلے میں علم کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہا کرتا ہے اور بڑائی قد میں نہیں قدر میں ہوتی ہے۔

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات   تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان تینوں شعر کا مصداق و عملی نمونہ قاضی صاحب کی تنہا ایک ذات تھی۔

لباس قاضی صاحب کی تعلیمی زندگی کے بعد تدریسی زندگی جب شروع ہوئی تو وہ کم تنخواہی کے سبب اسبابِ زندگی کی فراہمی میں پریشاں خاطری محسوس کرتے تھے اور ان کا بچپن بھی عسرت و تنگ دستی کا شکار تھا۔ ان سب عواملِ حیات نے ان کو طبعی اور مزاجی طور پر خود کفیل، سادگی پسند، قناعت پیشہ، کم خرچ اور اسراف بیزار بنا دیا تھا۔ مگر وہ عملاً دنیا بیزار نہیں ہوئے تھے کہ اس کی سرگرمیوں اور دنیا کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ان کی عملی زندگی کسل و تساہل کی پرچھائیوں سے گریزاں رہی اور کارِ حیات کی تکمیل میں انھوں نے اپنی مجاہدانہ لگن کا مظاہرہ کیا۔ بہر حال

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۱۳۳)

عموماً انھوں نے جوانی میں سفید گزی گاڑھے کے کرتا پائجامہ کو استعمال کیا۔ شیروانی بہت کم پہنتے تھے۔ کرتے کے اوپر شیروانی کے بجائے صدری کو پسند کرتے تھے۔ اونچے کپڑے کی کشتی نما ٹوپی زیب سر ہوتی تھی۔ جوتا اس زمانے کے رواج سے چپل پہنتے تھے۔ عطر کی شیشی ہمیشہ جیب میں رکھتے تھے۔ کپڑے کو دھوتے[1] یہ وضع قطع ان کی آخری عمر تک باقی رہی۔ البتہ جب وہ معاشی طور سے آسودہ حال ہو گئے تو گھر سے جب نکلتے عموماً شیروانی زیب تن ہوتی۔ وہ جوتا ہمیشہ عمدہ قسم کا استعمال کرنے کے عادی تھے اور اس کی صفائی اور پالش کے سلسلے میں بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ گھر میں چپل کا استعمال کرتے تھے۔ مگر باہر اس کو سخت نا پسند کرتے۔ ایک بار شام کو انھوں نے راقم سے فرمایا کہ چلو بازار چلیں، میں ان کی جھجک سے نکل کر اپنی چپل پہنے لگا، تو انھوں نے قدرے مربیانہ اکراہ کے لہجے میں مجھے ٹوکا اور فرمایا کہ اہلِ علم کو اتنی سادگی بھی زیبا نہیں۔ وہ اپنے لباس کے بارے میں لکھتے ہوئے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں کہ:

> "اب احساس ہوتا ہے کہ اتنی سادگی بھی اچھی نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات مضر، موہم بخل اور باعث تحقیر ہو جاتی ہے۔"[2]

مولانا کے خمیر میں صفائی ستھرائی شامل تھی۔ وہ بال، ناخن تراشنے اور حجامت بنوانے میں بہت زود حسی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی ریشِ مبارک اور مونچھیں اعتدالی انداز لیے ہوئے ان کے چہرے کی وجاہت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ بینائی کی کمزوری کی وجہ سے موٹا چشمہ لگاتے تھے۔ ان کے کپڑے اوسط قیمت کے صاف ستھرے اور بے گرد ہوتے تھے۔ گھر میں تہبند ان کی ستر پوشی کرتا، باہر پائجامہ ان کی علمیت کی گواہی دیتا۔

خورد و نوش قاضی صاحب کو جو وقت پر میسر ہو جاتا تھا، اسی کو نعمتِ خداوندی سمجھ کر کھاتے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ انھیں کھانوں کے تکلفات سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ احیاء العلوم کی مدرسی کا زمانہ ان کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔ جو تنخواہ ملتی تھی اسی میں گزر بسر کرنی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "اس دور میں ایسا بھی ہوا کہ آٹا گھول کر اور نمک کے ساتھ پکا کر وقت کاٹ لیا گیا۔ بسا اوقات سالن کی جگہ پیاز، لیموں، مرچ اور نمک کا کچومر استعمال کیا۔ ..... ایک آنے کا گڑ (بھیلی) صبح کو لاتا اور چائے بن جاتی تھی اور رات کی بچی کچھی روٹی ناشتے میں کام آتی۔ بعض اوقات اس کا بھی انتظام نہیں ہوتا تھا۔"[3]

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ بار اول ۱۹۸۷ء (ص: ۴۵) [2] ایضاً (ص: ۴۵)

[3] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۴۵-۴۶)

اس تنگ دستی نے قاضی صاحب میں سادگی اور کفایت شعاری کی خصلتیں پیدا کر دی تھیں۔ ان کے لڑکے قاضی ظفر مسعود کا بیان ہے کہ کھانا نہایت سادہ کھاتے تھے۔ کبھی دو سالن ایک ساتھ نہیں کھاتے تھے۔ اگر گوشت روٹی سے کھایا، تو چاول پر دال استعمال کرتے تھے۔ اگر کباب رہتا تو ایک آدھ لے لیتے بقیہ اور کوئی سالن یا مرکبات بالکل نہ لیتے تھے اور جب ہم لوگ کہتے کہ ابا! یہ بھی ہے تو فوراً کہتے کہ ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے کہا کہ ابا! دسترخوان پر اور چیزیں بھی رہتی ہیں، آپ بالکل نہیں کھاتے، جس سے ہم لوگوں کو تکلیف بھی ہوتی ہے اور اس کے کھانے میں تکلف بھی۔ کہنے لگے تم سب اس معاملہ میں میرا بالکل خیال نہ کرو۔ ہمارے محدثین واسلاف کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا اٹھا کر اور روکھی سوکھی کھا کر دنیا سے گزر گئے۔ ہم لوگ ہر دم پیٹ ہی بھرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔[1]

عادات و خصائل علمی وجاہت کے دوش بدوش قاضی صاحب میں انسانی واخلاقی کمالات بھی بدرجۂ اتم موجود تھے۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں سادگی پسند، مگر نظیف الطبع تھے۔ وہ ''کاروانِ حیات'' میں اپنے سفر امرتسر کا ایک واقعہ بتاتے ہیں۔ جس سے ان کی طبعی نفاست پسندی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے:

> ''بھوک کی شدت تھی..... مگر بالکل اجنبی تھا راستہ بھول جانے کے ڈر اور زبان نہ جاننے سے قریب ہی ایک دُوکان دیکھی، اندازہ ہوا کہ کھانا ملتا ہے۔ اوپر گیا، یہ انتہائی گندا اور عامی ہوٹل تھا۔ چٹائی کی درازوں میں کالی کالی مٹی جمی ہوئی تھی۔ اس پر بیٹھنا اور کھانا بڑی بدذوقی کا مظاہرہ تھا۔ مگر اجنبیت اور بھوک نے اس کو گوارا کیا''۔[2]

مولانا بڑے محنتی، جفاکش اور صابر انسان تھے۔ اُن کے دوست صدیق احمد صاحب خلد آبادی نے قاضی ظفر مسعود صاحب کو جو تعزیتی خط لکھا ہے، اس سے قاضی صاحب کی عادتوں اور خصلتوں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اس خط کی تحریر کے مطابق مولانا جنجیکر اسٹریٹ بمبئی کے روم میں ۶۰-۱۹۵۶ء کے درمیان جب قلم کی ریاضت میں محو ہو جاتے، تو شدید گرمی اور اُمس سے ان کی بنیائن تر ہو جاتی۔ مگر کہنے پر بھی پنکھا لگوانے پر راضی نہیں ہوئے۔ برسوں کرافوڈ مارکیٹ سے مدن پورہ تقریباً تین میل جاتے اور تین میل آتے۔ مگر سرد و گرم موسم کے شدائد کے باوجود اہلِ تعلق کی ٹیکسی میں اصرار کرنے پر بھی نہیں بیٹھتے اور کہتے

[1] قاضی ظفر مسعود۔ محترم والد صاحب۔ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۲۶۸)

[2] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۴۹)

کہ آج تو بیٹھ جاؤں اور کل کیا ہوگا۔ یہ مہینوں دال پر گزر بسر کرتے۔ صدیق احمد اور مولانا عبید الرحمٰن قمر مبارک پوری کا کھانا معلم کے دفتر میں کام کرنے کی وجہ سے اچھا ہوتا، لیکن ہزار گزارش پر بھی دسترخوان پر نہیں بیٹھتے۔ البتہ دعوت میں پندرہ منٹ پہلے پہنچ جایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی احتیاط کی وجہ ایک بار یہ بتائی کہ مبارک پور میں میرے بچے تو ایسا نہیں کھاتے ہوں گے اور میں یہاں کھایا کروں۔ یقیناً بہت کم باپ کے سینے میں اتنا شفقت سے بھرا دل ہوگا۔ وہ بدعتوں سے سخت متنفر تھے۔ ایک بار امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کی نیاز کے لوازمات کے سلسلے میں ان کے عمل کا ایک ایسا اثر کن پہلو سامنے آیا کہ صدیق احمد کی زندگی کی سمت بدل گئی۔ قاضی صاحب کو دوسرے سے کام لینا پسند نہیں تھا۔ وہ اپنی کتابیں، مقالات و خطوط سب کچھ خود لکھتے تھے۔ اس میں کبھی کسی اور کی مدد نہیں لی۔ وہ دوستوں میں کسی کے اندر اخلاقی کمزوری دیکھتے تو اس کا زبردست نوٹس لیتے۔ غلطیوں کے اِرتکاب پر معافی چاہنے والے کی غلطیاں بار بار معاف کرتے تھے۔ دوستوں کو قدم قدم پر ان کی اصلاح و تربیت سے ہدایتیں نصیب ہوا کرتی تھیں۔ ان کی زندگی کا رکھ رکھاؤ اہتمام و احتشام سے بے نیاز تھا اور بڑی سے بڑی مجلس میں ان کو اپنی سادگی پر کبھی شرمندگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس دور کی انسانی بھیڑ میں ایک نمایاں مردِ درویش اور رجلِ صالح تھے۔ اگر وہ دارالعلوم دیوبند کے مشرب و مسلک پر نہ رہتے تو تقدس مآب سمجھ کر لوگ ان کے دست و پا کو چومتے اور اظہارِ عقیدت کے ایسے ایسے طریقے اختیار کرتے کہ بس استغفر اللہ!

اپنی تدریسی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع نہ ملنے کا غم، ان کے تحت الشعور میں اس طرح سما گیا تھا کہ جب بھی کوئی موقع آتا تو ان کے شعور کی سطح پر غم کے گہرے نقوش ابھار جایا کرتے تھے۔ وہ اپنے طبعی رُجحان تعلیم و تدریس کے بارے میں ایک مقام پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''میرا مزاج مدرسوں اور کتابوں کا تھا اور اسی فضا میں زندگی بسر کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی صورت میں اس سے منسلک رکھا۔ البتہ مدرسوں کی سیاست کی وجہ سے ظاہری دوری رہی۔ بمبئی میں کوئی عربی مدرسہ نہیں تھا۔ محلہ محلہ انجمنوں اور مسجدوں میں مدرسہ عربیہ جاری تھا۔ جس میں قرآن شریف اور دینیات کی معمولی تعلیم ہوتی تھی''[1]

ایک موقع پر انہوں نے اپنے اس دکھ کا اظہار کیا ہے کہ انھیں مدرسے کی پُر سکون اور صاف ستھری فضا نہیں ملی ورنہ وہ اچھے مدرّس ہو گئے ہوتے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۸۹)۔

''تعلیم وتدریس کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے جاری تھا اور اسی میں زندگی بسر کرنے کا
ارادہ تھا۔ مدرسوں کی فضا صاف ہو تو یہ زندگی بڑی پرسکون اور خیر وبرکت کی ہے۔
اگر مدرسہ والے مجھے قبول کر لیتے تو میں بہترین مدرس ہو گیا ہوتا۔ اس کے باوجود ہر حال
میں کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ جاری رکھا''[1]

مولانا بمبئی میں صحافت کے ذریعہ کسب معاش کرتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنے مزاج اور ذہنی ماحول کو معاش پر کبھی قربان نہیں کیا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ مدرسوں کا ماحول پاتے تو ان میں بڑا انشاط پیدا ہوتا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''الحمد للہ کہ شہروں کی ہنگامی زندگی میں رہ کر اور بمبئی جیسے علم وتحقیق سے کورے شہر میں
مدتوں زندگی گزار کر بھی اپنا ذہن ومزاج نہ بدل سکا۔ اس لیے مجھے آج بھی مدرسوں اور ان
کے ماحول سے بے حد دلچسپی ہے۔ مدرسہ فلاح دارین میں پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ
میری پچھلی زندگی لوٹ آئی ہے''[2]

کبھی کبھار وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں بمبئی سے دولت کمانا چاہوں تو میرے چار لڑکے ہیں، چاروں کے لیے الگ الگ بنگلہ اور کار کا ایک سال کے اندر انتظام کر سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھ پر جو شرعی ذمہ داری ہے تعلیم کی، شادی کی اور روزگار کے ساتھ لگا دینے کی وہ انشاء اللہ سب پوری کروں گا۔ وہ ضرورت مندوں کی حاجت روائی کی تاکید خطوط میں اہتمام کے ساتھ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ گھر میں نہ ہو تو بازار سے لا کر دے دیا کرو، وہ کچھ سمجھ کر تمھارے پاس آیا ہے۔ وہ ضرورت مندوں کی چیزیں خریدنے سے بھی سخت منع کرتے اور کہتے تھے کہ کبھی دیکھے گا تو اس کے آبگینۂ دل کو ٹھیس لگے گی۔ بلکہ حسب توفیق اس کی مدد کر دیا کرو۔ وہ اپنے بچوں کو سمجھاتے کہ بمبئی میں بننے کے مواقع کم اور بگڑنے کے راستے زیادہ ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو کبھی احساسِ محرومی کا شکار نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہمیشہ ضرورت کی چیزیں پہلی فرصت میں بھیجا کرتے تھے۔ ان کے لڑکے قاضی ظفر مسعود صاحب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ والد صاحب کے ساتھ شبلی منزل گیا، تو شاہ معین الدین ندوی صاحب کہنے لگے کہ قاضی صاحب آپ ایک صدی پہلے کے لوگوں میں ہیں، لیکن ایک صدی کے بعد دنیا میں آئے ہیں۔ ایک دفعہ قاضی ظفر مسعود صاحب

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۱ء (ص: ۴۸)

[2] قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے۔ قاضی اطہر اکیڈمی لکھنؤ ۲۰۰۵ء (ص: ۲۲۴)

سے حاجی عبدالغنی اطلس والا کہنے لگے کہ قاضی صاحب کا بمبئی میں یہ حال تھا کہ وہ آگے آگے اور بمبئی ان کے پیچھے پیچھے چلتی تھی، مگر وہ بمبئی کو اپنے پیروں سے جھٹک جھٹک کر چلتے تھے۔ وہ ایک ملاقات میں ایک لیڈر نما شخص عبدالعزیز سے فرمایا کہ میں نے مہاراشٹر جمعیۃ العلماء کی صدارت قبول کر کے الجھنیں لے لی ہیں۔ آپ زندگی بھر جمعیۃ العلماء میں رہے ہیں۔ میرا یہ کام بھی عارضی طور سے سنبھالیں۔ ۱۹۸۰ء میں جب صدر جمہوریہ ایوارڈ انہیں دیا گیا تو ہوٹل میں ان کے اور قاضی ظفر مسعود دونوں کے لیے جو کھانا آیا اس میں سے بچ گیا۔ میرے سے قاضی صاحب نے دوسرے وقت کہہ دیا کہ ایک آدمی کا لایا کرو سب خراب ہوتا ہے۔

اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں ان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا اپنی عملی زندگی میں صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کو پسند کرتے تھے۔ انھوں نے پوری عمر کتاب و مطالعہ اور قرطاس و قلم کی رفاقت کا حق ادا کیا۔ ابتدائی دور میں شوقِ علمی کا ان کی زندگی سے جو قول و قرار ہوا تھا، مولانا کو اس کا ہمیشہ پاس و لحاظ رہا اور خوش حالی و فارغ البالی سے انھوں نے سمجھوتہ کر کے قلمی محاذ سے کبھی ہلنا گوارہ نہیں کیا۔ اپنے شانۂ قناعت پر کبھی کسی کے بار احسان اٹھانے کو انھوں نے پوری عمر اپنی غیرت و خودداری کے جنازہ سے تعبیر کیا۔ اس لیے وہ کسی نہ کسی بہانے منتِ احباب سے اپنے کو بچاتے رہے۔

ان کی متاہل زندگی کی اخلاقیات نے انھیں بے مثال باپ اور دردمند مربی کی صورت میں پیش کر کے قابلِ تقلید بنا ڈالا تھا۔ اتباعِ سنّت، تصلّب فی الدین اور غیرتِ ایمانی کا جذبہ ان کی سیرت کا بہت نمایاں پہلو تھا۔ ان کے احتساب سے صراطِ مستقیم اور راہِ نجات کو اختیار کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ رنگینیِ کائنات اور لذّتِ دنیا کے حصول کو انھوں نے ابنِ آدم کو سپرد کیے گئے تکمیلِ کائنات اور کارِ جہاں سازی کے فرضِ منصبی سے روگردانی تصور کیا۔ ان سب سے ان کے کردار کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

مولانا احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں مردِ آہن تھے۔ مصر سے بچوں کے لیے سیرت پر محمد برانق کی ایک باتصویر کتاب بہت مفید اور سہل زبان میں چھپی۔ اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، صحابۂ کرام اور دوسری اسلامی شخصیتوں کی تصویریں تھیں۔ مولانا کو کتاب دیکھ کر بے پناہ تکلیف ہوئی اور انھوں نے ''انقلاب'' میں سخت مضمون لکھا۔ اُن کی مخالفت میں مصریوں نے بھی عربی میں مضامین لکھے۔ بات بڑھ گئی، لوگوں نے آپ کو سمجھایا کہ ہند و مصر کے تعلقات بہت اچھے ہیں، حکومتِ ہند آپ کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے۔ ان دنوں عبدالعزیز عزّت ہندوستان میں مصری حکومت کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے

قاضی صاحب کے اعتراضات ترجمہ کرا کے مجمع البحوث الاسلامیہ مصر کو بھیجا اور جواب طلب کیا۔ کئی مہینے بعد عربی اور انگریزی میں اس کا طویل جواب آیا۔ جس میں تاویل کے باوجود یہ اقرار تھا کہ آئندہ ان تصویروں کے نیچے نام نہیں دیے جائیں گے۔

خردنوازی قاضی صاحب کی پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ ان کا مزاج خالص علمی و تحقیقی تھا۔ وہ علم کا کوہ گراں تھے اور تحقیق کا بحر بے پایاں بھی۔ مگر انھوں نے کبھی اور کسی مقام پر اپنی بلندی عظمت اور تکبر و نخوت کے بت نہیں سجائے۔ لوگوں سے اپنے فکر وفن کے آستانے پر سجدوں کے نذرانے نہیں چاہے۔ وہ ہمیشہ سچے خادم علم کی صورت بنائے اپنی منکسر المزاجی، عجز وانکساری اور خردنوازی کے نمونے پیش کرتے رہے۔ مولانا سے استفادہ کرنے والوں میں اساطین علم کے پہلو بہ پہلو ایسے کم علم اور نوآموز بھی تھے، جنھوں نے تحقیق کی پیتا ماری اور علمی کاموں کی سنگلاخی کا درد نہیں جھیلا تھا۔ لیکن مولانا نے وجاہتوں کے مینار کی طرح عظمت کی بلندی رکھنے کے باوجود کسی خرد یا نو وارد بساط علم و تحقیق میں یہ احساس نہیں پیدا ہونے دیا کہ مولانا کی علمی حریم ناز سے استفادہ کے لیے شخصیتوں کی کوہ قامتی اور فکر وشعور کی بڑائی کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے سے چھوٹوں سے بھی اسی انشراح قلبی اور ابتزاز علمی سے ملتے تھے، جو بڑوں سے ملنے کا ان کا اپنا ایک خاص طریقہ تھا۔ مولانا کی سیرت کا یہ کردار اتنا نمایاں اور روشن ہے کہ ان کے قریب آنے والے ہر طالب علم کو اس کا احساس ہو جاتا تھا۔ مولانا جس میں بھی علمی ذوق، تحقیقی وفنی رغبت اور قرطاس وقلم کی خدمت کا جذبہ پاتے اس کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھتے تھے۔ خود راقم کے ساتھ ان کا اخلاقی وعلمی سلوک اتنا مشفقانہ تھا کہ وہ اپنے دوران مطالعہ میرے کام کی کوئی چیز دیکھتے تو اس کو نوٹ کر لیتے اور پھر صبح میں نماز اور زیارت قبرستان کے معمولات کے بعد جب اہل تعلق کی مزاج پرسی اور احوال طلبی کے لیے نکلتے تو میرے حوالے کر کے غریب خانہ کے دروازے سے ہی لوٹ جاتے۔ گھر میں داخل ہونا اور کچھ اپنی خاطر مدارات کرنے کا موقع دینا انہیں پسند نہیں تھا۔ غالباً ان کی صوفی منشی اور زہد و درویشی ایسے مواقع پر چائے ناشتہ کے لوازم کو بھی رشوت ہی کی بدلی ہوئی شکل جانتی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس طرح کی کرم فرمائیوں اور خردنوازیوں کے صلہ میں اظہار شکریہ کے علاوہ کسی اور طریقہ عقیدت کو قبول نہیں کیا۔ آج ان کی سیرت کے اس روشن پہلو پر نظر جاتی ہے تو ہم خردوں کی اپنی علمی یتیمی کا کرب اور شدت اختیار کر جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے دعائے مغفرت وترقی درجات اخروی وازدیاد حسنات نکلتی ہے: ع

خدا بخشے ہزاروں خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مولانا ضیاء الدین اصلاحی قاضی صاحب کی سیرت واخلاق کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"وہ کسی امتیاز و تفریق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بڑوں کی طرح چھوٹوں سے، علماء و اہل علم لوگوں کی طرح ناخواندہ اور اصحاب جاہ و ثروت اور اہل دنیا لوگوں کی طرح غریب اور مفلوک الحال اور کم حیثیت لوگوں سے ملنے میں انہیں عار نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے خردوں اور نیاز مندوں سے بھی بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ملتے تھے اور ہمیشہ ان کی تحسین و حوصلہ افزائی کر کے ان کا دل بڑھاتے اور ان کی دل جوئی کرتے تھے۔"[1]

مولانا محمد نعیم صدیقی قاضی صاحب سے اپنے تعلقات کے حوالے سے ان کی شفقت و مرحمت اور خورد نوازی کی شہادت ان لفظوں میں دے رہے ہیں:

"ظاہر ہے عمر کے اعتبار سے میں ان کے کئی صاحبزادوں سے بھی چھوٹا ہوں۔ مگر قاضی صاحب کی خورد نوازی اور محبت و شفقت کا یہ عالم ہے کہ ہر ملاقات میں اپنی باغ و بہار طبیعت اور بے تکلفانہ انداز گفتگو سے عمر و علم کے امتیاز و تفریق کو مٹا دیتے ہیں۔ میرے لیے بعض وقت یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ قاضی صاحب کے کردار و اخلاق کا پلہ بھاری ہے، یا ان کے علمی و تصنیفی فضل و کمال کا۔"[2]

تذکرہ علمائے اعظم گڑھ کے مصنف مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی جگدیش پوری نے بھی اپنے تعزیتی مضمون میں مولانا کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ان کی وفات اگرچہ علمی دنیا کے لیے ایک حادثہ ہے، جس کا تدارک بہ آسانی نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اس ناچیز کے لیے یہ ایسا ہی ذاتی نقصان ہے، جیسے ان کے قریبی اعزہ کے لیے۔ اس لیے کہ وہ اس ناچیز پر اس درجہ شفیق و مہربان تھے کہ الفاظ کے ذریعہ اس کا بیان ممکن نہیں۔ کم و بیش ۲۵ رسال تک قاضی صاحب کی صحبتیں نصیب رہیں۔۔۔۔۔ ہر حال میں مرحوم کی شفقتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی علمی عظمتوں کو نظر انداز کر کے، مجھ جیسے چھوٹے کے ساتھ بے تکلف نہیں بلکہ بالطف چھوٹے بن جاتے تھے۔ قاضی صاحب ہی کی بے پناہ شفقتوں اور مخلصانہ ہمت افزائیوں نے مجھے قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا۔"[3]

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ضیاء الاسلام شیخوپور (ص: ۱۸۵) [2] ایضاً (ص: ۳۰۱) [3] ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔ اگست ۱۹۹۶ء (ص ۳۰-۳۳)

مولانا نور عالم خلیل امینی مدیر رسالہ "الداعی" (عربی) واستاذ ادبِ عربی دارالعلوم دیوبند بھی کچھ اسی سے ملتی جلتی بات کہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ:

"ان سے دوسری ملاقات دارالعلوم دیوبند کے تاریخی اور بے مثال اجلاسِ صدسالہ (منعقدہ ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء) کے موقع سے اچانک ایک روز صدر دروازے پر محشر نما بھیڑ میں ہوئی۔ دیکھتے ہی پہچان گئے۔...... ان کی اس یادداشت پر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ آٹھ/نو سال کے بعد بھی مجھے اپنے خانہ خیال میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ مجھ کو پہچان لینے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوا۔ میں ان کی بلند اخلاقی سے بہت متاثر ہوا کہ وہ اس بھیڑ میں دیکھتے ہی شفقت سے لپٹ گئے۔ ورنہ ان سے بہت کم درجہ کے لوگ اپنا علمی رعب ودبدبہ قائم رکھنے کے لیے عموماً چھوٹوں کو پہچان کر بھی طرح دے جاتے ہیں اور اگر از خود پیش رفت کر کے تعارف کرائیے تو تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں"۔[1]

مولانا اعجاز احمد اعظمی اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ بڑے تھے، بہت بڑے تھے، مگر اپنے چھوٹوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ انھیں شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انھیں پڑھنے لکھنے کی تاکید کرتے تھے۔ جب وہ تھے تو انھیں ڈھونڈھنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے مل جاتے تھے۔...... جو پوچھنا ہوتا ان سے پوچھ لیتے اور وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے بتا دیتے"۔[2]

اس عہدِ قحط الرجال میں مولانا کا وجود دھوپ کے ریگستان میں شاخِ طوبیٰ کی ٹھنڈی چھاؤں جیسا تھا اور حالی کا یہ شعر بار بار زبان پر آیا کرتا تھا کہ:

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر　　ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

قاضی صاحب کے شاگرد زادہ مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی نے بھی "قاضی اطہر مبارک پوری بحیثیت مربی ومعلم" کے زیرِ عنوان اپنے مضمون میں مولانا کی خرد نوازی کی کئی مثالیں دی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلہ ترجمان الاسلام بنارس (ص:۱۹۶)

[2] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص:۲۳۶)

''قاضی صاحب بڑے ہی متواضع، شفیق اور حق گو تھے۔ اس حد تک علمی بلندی کے باوجود وہ عام لوگوں سے ان کے گھر کے ایک فرد کی طرح ملتے اور کبھی علمی تفوق اور اپنے افتخار کو جتاتے نہیں تھے۔......اہل علم کے ساتھ اس طرح پیش آتے اور ایسا اکرام کرتے کہ خود ان کی عظمت کا احساس تک نہ ہوتا۔ بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔......یہ ان کی عظمت تھی کہ وہ چھوٹوں اور خردوں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ان کو پکڑ کر چلنا سکھاتے تھے''[1]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب نے مجھے تلاش و تحقیق اور لکھنے پڑھنے کا طریقہ سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک مجھے اس سے بڑھ کر کوئی رنج نہیں ہوا، جتنا قاضی صاحب کی وفات سے ہوا''[2]

سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ اپنے مشاہدے کی بناء پر لکھتے ہیں کہ:

''قاضی صاحب ہر طالب علم خاص طور سے علمی ذوق رکھنے والے ہر فرد سے ربط رکھتے تھے اور ان کا ہر طرح تعاون کرتے تھے۔ خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ ان کے موضوع کے لائق چیزیں بتاتے۔ مبارک پور میں ان کے پاس طلباء کے وفود آتے اور ایک نیا جوش و ولولہ اور تازہ عزم و ہمت لے کر واپس جاتے''[3]

مہمان نوازی قاضی صاحب حقیقی معنی میں معنیٔ لفظِ آدمیت تھے۔ وہ بڑے سیر چشم اور مہمان نواز قسم کے بزرگ تھے۔ ان کا دسترخوان ہمیشہ اہلِ علم اور صاحبانِ قلم کے لیے وسیع رہا۔ وہ مہمانوں کی خاطر و تواضع میں اپنی توفیق اور استطاعت بھر کوئی کمی نہیں آنے دیتے تھے۔ وہ خود بھی اہلِ علم تھے اس لیے صاحبانِ علم کے قدرداں تھے۔ وہ اکثر دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رفقاءِ قلم کو اپنے دولت کدے پر مدعو کرتے تھے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک زمانے میں ان کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ سال میں کسی نہ کسی بہانے ہم نیازمندوں کو اپنے دولت کدہ پر ضرور بلاتے اور بڑی پرتکلف اور وسیع دعوت کرتے''[4]

مولانا کا گھر اہل علم کا مرجع تھا۔ اس لیے دوسروں کی بہ نسبت ان کے یہاں لوگوں کی آمد بہت

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۳۰۷)

[2] ایضاً (ص: ۳۰۹) [3] ایضاً (ص: ۳۱۱-۳۱۲) [4] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ضیاء الاسلام شیخوپور (ص: ۲۸۵)

تھی۔ دور دراز کے علاقوں سے آنے والے اپنی علمی وتحقیقی اور تصنیفی وتالیفی غرض لے کر حاضر ہوتے مولانا ان کی مدارات میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔ اس پر مستزاد اپنی علمی ودینی گفتگو سے بھی نوازتے۔ علم کے متلاشی حضرات کو حوالے کی کتابیں نکال کر دکھاتے، پڑھ کر سناتے اور قابل تحریر عبارت لکھاتے ہی نہیں تھے، بلکہ کتابوں سے نقل بھی کر دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی غیر مسلم اسکالر بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو ان کی بھی پزیرائی میں انہیں کچھ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ گیا نندر پانڈے انگریزی کے بہترین اسکالر ہیں۔ وہ جن دنوں انصاری برادری پر تحقیق کر رہے تھے، لندن سے مبارک پور آئے۔ وہ اُردو، عربی اور فارسی نہیں جانتے تھے۔ مولانا نے ان کی تواضع کے بعد علمی وتحقیقی مدارات بھی کی۔ وہ کتابوں سے پڑھ کر عبارتوں کے مطلب سمجھاتے۔ کہیں خود بھی کچھ لکھ کر دے دیا۔ وہ کئی بار مبارک پور تشریف لائے۔

انھوں نے مہمان نوازی کے سلسلے میں اپنی زندگی کے آخری لحات میں بھی اپنے لڑکوں سے بڑی تاکید فرمائی اور بطور وصیت اس پر عمل کرنے کے لیے کہا۔ قاضی ظفر مسعود کا بیان ہے کہ ابا کی آخری وصیت یہ تھی کہ:

> "رشتہ داروں اور مہمانوں کا خیال رکھنا اور اس گھر کی روایت کو باقی رکھنا۔ اب میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں، کسی وقت کوئی بات ہو سکتی ہے۔"[1]

توکل واستغناء | قاضی صاحب کی دینی حمیت، غیرت اسلامی، عزت نفس اور دنیا بیزاری ان کی داستان حیات کے روشن ابواب وفصول ہیں۔ اُن کی اُفتادِ طبع کچھ اس نہج کی تھی کہ وہ دین ودیانت، خدا ترسی، اور دینداری کو ترجیح دیتے تھے اور دنیاوی ومعاشی لذت کوشی وراحت اندوزی کو پسِ پشت ڈال دیا کرتے تھے۔ انھیں نانِ جویں میں بوئے اسد اللہی محسوس ہوتی تھی اور انھیں اپنی آسودگی کے تمام سوتے اسی خوئے فقیری سے پھوٹتے نظر آتے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنی دینی خودداری کا سودا دنیاوی اغراض ومصالح اور منفعت کے ساتھ نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے واقعات کے ذکر میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ جس سے ان کی غیرت اور خودشناسی کا اظہار ہوتا ہے:

> "مراد آباد گیا تو ابتداء میں ایک گھر سے کھانا لانا پڑتا تھا۔ ایک آدھ ہفتہ ضمیر پر جبر کر کے چھپتے چھپاتے یہ کام کیا۔ پھر ڈھائی روپیہ ماہوار مدرسہ سے وظیفہ لے کر اس سے نجات حاصل کر لی اور ایک معمولی ہوٹل میں چھ پیسہ فی وقت کے حساب سے کھانا کھانے لگا۔"[2]

---

[1] قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۲۷۷)

[2] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرہ ملیہ مبارک پور۔ باراول ۱۹۸۷ء (ص: ۴۶)

شاہ اُردن ہندوستان کے دورے پر آئے۔ اُن کا ورود جب بمبئی میں ہوا تو ہیرے جواہرات کے ایک مشہور عرب تاجر نے شاہ اُردن کی تکلفات سے آراستہ دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں قاضی صاحب کو بھی دعوتِ شرکت ملی۔ کیوں کہ عرب مہمانوں کی ترجمانی کے لئے عموماً قاضی صاحب یاد کیے جاتے تھے اور شاہ اُردن کی ترجمانی کے فرائض بھی قاضی صاحب نے انجام دیا تھا۔ اس لیے عرب جوہری قاضی صاحب کی عربیت و ادبیت اور علمی لیاقت کا واقف کار تھا۔ ڈنر کسی فائیو اسٹار (پانچ ستارہ) ہوٹل میں شاہی انداز و اہتمام کا تھا۔ مولانا کی نظر جب ڈنر کے پروگراموں پر گئی تو شعائرِ اسلامی اور تہذیب دینی سے ان کی سچی اور بے ریا وابستگی نے انہیں اس دعوت کی شرکت سے روک دیا۔ کیوں کہ اس شاہی دعوت میں محفلِ رقص وسرود کی نشاط انگیزی کو بھی نمایاں حیثیت دی گئی تھی۔ جس میں مشہور فلمی اداکارائیں اور رقاصائیں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی تھیں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ مولانا کی سیرت اور مقصدِ زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کا ذکر مولانا کی زبان سے سنیے:

> ''مصر کے صدر جمال عبدالناصر (۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء) میں ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے۔...... گورنر ہاؤس میں ان سے ملاقات کی۔ ''رجال السند والہند'' اور ''دیوان احمد'' (عربی) پیش کیا میں اور وہ برابر برابر بیٹھے تھے، باتیں کرتے رہے۔ اس وقت جمہوریہ عربیہ متحدہ مصر کے قونصل عبدالمنعم النجار تھے۔...... انھوں نے رئیس جمال عبدالناصر کی آمد پر یادگار کے طور پر قرآنِ کریم مع تفسیر ''صفوۃ البیان فی المعانی القرآن'' مصنفہ شیخ حسنین مخلوف مفتی الدیار مصریہ ہدیہ کی اور شیخ القراء عبدالباسط کی قرأت سے پورا مسجل قرآن دیا اور بار بار تقاضا کیا کہ اپنے دونوں لڑکوں خالد کمال اور ظفر مسعود میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو میں جامع ازہر میں داخل کرادوں۔...... سفارتی سطح کی یہ تجویز بہت وزنی ہے۔ ...... مگر میں اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ کیوں کہ جامع ازہر کے بارے میں معلوم تھا کہ وہاں کے تعلیم یافتہ حد سے زیادہ متنور اور آزاد خیال ہو جاتے ہیں''[1]

عروس البلاد بمبئی جسے دولت کا شہر بھی کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ جس کی آغوش میں سب کو رزقِ روزی نصیب ہو جاتی ہے، مولانا کی نظر میں علم کُش شہر ہے۔ یہاں مولانا کی علمی و تصنیفی زندگی کا

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۱۲۹-۱۳۰)

زریں دور گزر رہا ہے۔ وہ چاہتے تو دولت کمانے کے ہزاروں حیلے بن سکتے تھے۔ مگر مولانا میں جو دنیا بیزاری، علم پروری اور اخلاص دینی تھا، اس نے دولتِ دنیا کمانے کے تمام راستوں کو مسدود کر رکھا تھا۔

مولانا کی شہرت بمبئی میں فلم والوں تک پہنچی تو بار بار اس دنیا سے نائیکلش کی گئی۔ مگر انھوں نے فواحش و منکرات کے اس اہم ذریعہ کو پائے حقارت کی ٹھوکروں میں رکھا اور اپنی نانِ جویں پر قناعت کی۔ سعودیہ عربیہ اور دوسرے ممالکِ اسلامیہ کے سلطانوں، شہزادوں، رئیسوں، تاجروں اور قدر دانوں میں علمی اثر و نفوذ رکھنے کے باوجود انھوں نے اس طرح کی تمام پیشکش کو ٹھکرا دیا، جس سے دنیاوی زندگی کی وجاہت و ریاست تو حاصل ہو سکتی تھی۔ مگر علمی خسران اور دینی افلاس کی راہیں کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا اپنے دینی و علمی اشغال اور فنی و قلمی انہماک میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ قوت لا یموت سے صرف تعلق باقی رکھا۔ دنیا داری کے دوسرے تمام رشتوں، اور رسمِ دل بستگی و دل جوئی کو اپنی ذاتی زندگی میں داخل ہونے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ وہ عملاً حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے اس شعر کی تفسیر بنے رہے:

رضينا قسمة الجبار فينا   لنا علم وّ للجهال مالٌ

(ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمارے حصے میں علم رکھا اور جاہلوں کو مال دیا)

غیر مسلک کے اہلِ علم سے تعلقاتِ علمی | مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے ہر مکتبۂ فکر کے علماء سے ذہنی وابستگی کا سلسلہ رکھا اور ان کے اکتسابات و افادات سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ جن اہلِ علم سے بالواسطہ یا بلا واسطہ ان کی ذہنی و فکری تشکیل ہوئی، ان کا ذکر انھوں نے اپنی خود نوشت میں جا بجا نہایت انبساط و نشاط کے ساتھ کیا ہے۔ جو اُن کی کشادہ دلی اور احسان شناسی کا زبردست ثبوت ہے اور اسی کے ساتھ ان کی تصنیفی و تالیفی بلند اخلاقی و عظمتِ کردار کا روشن منظر نامہ بھی ہے۔

مولانا کو اہلِ علم کی صحبت و رفاقت اور ان کی علمی مجلس سے بہت تعلق خاطر تھا۔ وہ دوسرے جماعتی و گروہی عصبیت کے شکار علماء کی تنگ دلی اور اخلاقی پستی سے کوہ و مینار کی طرح بہت بلند تھے۔ ان کے دامنِ دل کو مسلکی تعصب کی ہوا کبھی نہیں چھو سکی۔ وہ سب سے علمی نشاط اور اخلاقی انشراحِ قلب کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ اس باب میں انھیں دوسری جماعت کے صاحبِ نظر اور اہلِ علم و فضل علماء سے کبھی کسی وحشت و اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ وہ سب کی خدمات علمی و دینی کا دل سے اعتراف کرتے تھے اور ان کی علمیت و اہلیت کے بیان و اظہار میں کبھی بخل اور کتمانِ حق سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی شگفتہ اور پُر وقار تھے۔ یہی نہیں ہر طرح کے لسانی، قومی اور مسلکی تعصبات سے بالاتر بھی تھے۔ اس

جذبۂ رواداری کی بدولت ہی ان کی فکر و نظر کی وسعت اور اتحاد کی ایک ایک لفظ سے محسوس ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی یہ شہادت قابل توجہ ہے:

"یہ بڑے فراخ دل، کشادہ قلب، اور وسیع المشرب تھے۔ ان کے دل میں ہر طبقہ، مسلک اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے یکساں گنجائش تھی۔ تعصب، تنگ نظری، گروہ بندی اور فرقہ آرائی کی لعنتوں نے ان کے قلب کو داغدار نہیں کیا تھا، وہ ہر طبقۂ فکر اور ہر جماعت و خیال کے لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے تھے اور ان کے اصحاب فضل و کمال کی قدر کرتے تھے۔ ان کو ملت واحدہ کی تلاش اور شرافت محبت کا جادو جہاں کہیں دکھائی دیتا اس کے سامنے بلا امتیاز فرقہ و قوم اپنی گردن بالکل خم کر دیتے تھے۔"[1]

مبارک پور کے اہل علم عالموں میں ملا رحمت علی اپنی عربی شاعری اور ادبیت کی وجہ سے بڑا اہم درجہ رکھتے تھے۔ وہ زمانے تک بوہرہ جماعت کی ایک قوم کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں مولانا اپنے تاثرات اور اپنے تعلقات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"وہ اپنا مذہبی لباس آخر تک استعمال کرتے رہے...... چوں کہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب و شاعر تھے اور عرب ممالک کی سیر و سیاحت کر چکے تھے۔ اسی لیے ان کی مجلس بڑی معلوماتی ہوتی تھی۔ میں طالب علمی کے زمانے میں ان کے یہاں زیادہ آتا جاتا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے بے تکلف ہو گئے اور مجھ پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنی خاص مذہبی کتابیں جو لکھ کر پڑھی جاتی تھیں مجھے پڑھنے کو دیں اور میں اسمٰعیلی مذہب سے براہ راست اس کی کتابوں سے واقف ہوا۔ مجھ پر ان کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ جب بیمار ہوتے تو بوہروں کے نکاح پڑھانے کے لیے مجھے بھیج دیا کرتے تھے...... مجھے ان کی علمی صحبت سے ادب و عربیت میں بہت فائدہ حاصل ہوا ہے اور مدرسہ احیاء العلوم میں مدرسی کے زمانے میں ان کے کئی لڑکوں نے مجھ سے عربی کی تعلیم اور اہل سنت کی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ کہتے تھے کہ مذہبی اصطلاحات اور مسائل عام طور سے ایک ہی قسم کے ہیں۔ کہیں کوئی اختلاف ہے تو اسے اپنی کتاب میں دیکھ لیں گے۔"[2]

۱۔ قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص:۲۸۶)

۲۔ تذکرہ علمائے مبارک پور۔ دائرہ ملیہ مبارک پور، جون ۱۹۷۴ء (ص:۲۰۰-۲۰۱)

۱۹۴۴ء میں مولانا کا قیام امرتسر بہت مختصر رہا مگر مشہور صاحب تصنیف وقلم اہل حدیث عالم ومفتی مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ملاقات کو انھوں نے اپنے لیے باعث سعادت سمجھا۔ ان سے اپنے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا تھا...... ایک صاحب فتوی لکھنے پر مامور تھے۔ مولانا بولتے تھے اور وہ لکھتے تھے۔ جب میں پہنچ جاتا تو مولانا ان سے کہتے کہ ان کو لکھنے کو دیدو۔ یوپی والوں کا خط اور ان کی زبان دونوں اچھے ہوتے ہیں۔ اس طرح مولانا نے کئی فتوے مجھ سے لکھوائے۔ میرے لیے یہ شرف باعث فخر ہے''[1]

یہاں یہ بات بھی خاص طور سے یاد رکھنے کے لائق ہے کہ فن صحافت میں ان کے استاد ومربی مولانا محمد عثمان فارقلیط بھی مسلکا اہل حدیث تھے۔ مولانا کی اس وسعت قلبی، اخلاص علمی اور جماعتی لاسلکی ولامسلکی کا نتیجہ ہے کہ ان کے قلم سے مبارک پور کی دینی وصنعتی، علمی وادبی، تہذیبی وسماجی اور سیاسی ومعاشی تاریخ ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' کے نام سے جون ۱۹۷۴ء میں اپنی محققانہ بصیرتوں کا آئینہ خانہ سجائے ہوئے منظر عام پر آئی۔ مولانا کے اندر کچھ بھی شائبۂ عصبیت رہا ہوتا تو پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس اہم علمی اثاثہ اور تحقیقی سرمایہ کی تبویب وتسوید معرض خطر میں پڑ جاتی اور مبارک پور کی بہت سی علمی ودینی خصوصیات وانفرادیت ماہ وسال کے پردۂ غبار میں یوں چھپی رہتی کہ پھر بڑے بڑے محقق ودانشور کی گورکنی واستخواں شناسی بھی اس کمی کو دور کرنے سے قاصر رہتی اور ہماری علمی ودینی مجلس اپنی بزم رفتہ کی بساط علمی کے بارے میں کچھ بتانے کے سلسلے میں اپنی لاچاری وبے زبانی کا اظہار کرتی۔ مولانا کے کھلے دل ودماغ نے علم وفن کی دہلیز اور آنگن میں بصیرتوں کے چراغ روشن کرنے میں اپنا اہم کردار پیش کیا ہے۔ جس کا اعتراف بھی خود اپنی ہی قدر شناسی اور اپنی ہی حسن بینی کے مترادف ہے۔ اس لیے مولانا کی خصوصیات کی قدر شناسی دل سے ہونی چاہیے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

فتوی نویسی قاضی صاحب جب یوم جمعہ ۲۸ر ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ/ نومبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی پہنچے تو انھیں دفتر جمعیۃ العلماء وزیر بلڈنگ بھنڈی بازار بمبئی میں جگہ ملی۔ دفتر کی دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ انھیں فتوی نویسی کی خدمت بھی سونپی گئی۔ قاضی صاحب نے پہلے ہی اپنی طالب علمانہ زندگی میں علوم متداولہ کی

[1] کاروان حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارکپوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص:۵۲)

تمام نصابی کتابوں پر زبردست محنت کی تھی اور علم ومطالعہ سے اپنے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کر لی تھیں کہ انہیں آگے کے علمی سفر کے لیے چراغ راہ کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ وہ فقہ حنفی کے علاوہ دوسرے مسالک ائمہ کے اصول ونظریات اور اختلافات ومباحث سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ حالات وزمانہ کے مقتضیات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ فقہ کی ایک خاص قدر اور پیمانہ وقت وحالات کی حاجیات اور عمرانی تصورات میں بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ قاضی صاحب اس بصیرت سے بھی بے بہرہ نہیں تھے۔ اس لیے وہ فتویٰ نویسی میں کامیاب رہے۔ فقہ سے ان کی کتنی دلچسپی اور اس باب میں ان کا علم کتنا زندہ تھا، اس کا اندازہ ان کے ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی کے ان مضامین ومقالات سے بھی بخوبی ہوجاتا ہے، جوان کے قلم سے مختلف موقعوں پر نکلے ہیں۔ امام محمد کی کتاب ''الآثار'' جنوری ۱۹۶۷ء، ''اسلامی شریعت اور حالات وزمانہ'' جون ۱۹۷۲ء، ''چند مسائل رمضان'' اکتوبر ۱۹۷۳ء، ''فقہ اہلِ سنت کی ابتدائی تاریخ'' جولائی ۱۹۵۸ء، ''فقہ اہل سنت کی ترویج واشاعت'' ستمبر ۱۹۵۸ء، ''امام سرخسی اور اصول سرخسی'' جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے ہی عنوانات کے مضامین ہیں جوان کی فقہی بصیرت کی شہادت میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی کتاب ''ائمۂ اربعہ'' بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ جس سے ان کی فقہی معلومات پر روشنی پڑتی ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب اہلِ سنت کی فقہ کے چاروں مسلک حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کے اصول واختلافات سے کماحقہ واقف ہیں۔ ''فقہ اہلِ سنت کی ابتدائی تاریخ'' کے عنوان سے ان کا مقالہ جو ''البلاغ'' کے شمارہ نمبر ۲ ذیقعدہ ۱۳۷۷ھ/ جولائی ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے، اس کا ابتدائی انداز یوں ہے:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں شریعت کا دارومدار وحی الٰہی کے تازہ ارشادات تھے چاہے وہ ارشادات کتاب اللہ (قرآن) کی صورت میں ہوں۔ چاہے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (حدیث) کی صورت میں ہوں۔ انھوں نے مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے عالی کے ساتھ ممتاز صحابۂ کرام، اس کے بعد چاروں امام اور دوسرے فقہاء اور ان کی فقہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔ انھوں نے اس مضمون کے آخر میں ائمۂ اربعہ کے اصول کے ضمن میں چاروں مسلک فقہ کے اماموں کے اصول پر گفتگو کی ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصولِ فقہ کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ مسائل کا حل پہلے قرآن میں تلاش کرتے ہیں۔ جب اس مسئلے کا حل

نہیں ملتا تو احادیثِ شریفہ سے رجوع کرتے ہیں۔ جب حدیثِ رسول میں بھی حل نہیں
پاتے تو آثار صحابہ کو انتخاب کرتے ہیں۔ اس کے بعد اجتہاد و قیاس سے کام لیتے ہیں۔
امام مالک کے بارے میں کہتے ہیں کہ پہلے دونوں اصول کے ساتھ تعاملِ اہلِ مدینہ کو بھی
بہت اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات اس تعامل کی وجہ سے حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔
ان اصولوں کے علاوہ اُن چاروں مسلک کے ائمۂ فقہ کے یہاں ایک اور بات بھی ملتی
ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض معاملات میں کسی مسئلے میں قیاس کے خلاف عمل کیا جاتا ہے۔ حنفیہ
اس کو ''استحسان'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور قریب قریب یہی مفہوم امام مالک کے لفظ
''استصلاح'' کا ہے اور امام شافعی کے نزدیک اسی معنی میں ''استدلال'' کا لفظ مروج ہے۔

تفسیر نگاری مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے حسناتِ قلم میں قرآن فہمی کی سعادت بھی شامل تھی۔ انھیں اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز ہی میں کتابِ الٰہی کی خدمت اور کلامِ ربانی کے سمجھنے سمجھانے کا زرّیں موقع حاصل ہو گیا تھا۔ جب وہ لاہور گئے تو انھوں نے اخبار و جرائد میں لکھنے کی شروعات کی۔ اسی دور میں انھیں یہ اطلاع دی گئی کہ ''زمزم'' کمپنی لاہور کی طرف سے ہندوستانی مفسرین کی تفسیروں کی روشنی میں ایک ایسی تفسیر کی اشاعت و ترتیب کا منصوبہ بنایا گیا ہے، جس میں ہندوستانی مفسروں کی اُردو تفسیروں کا خلاصہ کتابی شکل میں مرتب کیا جائے گا۔ وہاں ''زمزم'' لاہور کی طرف سے مولانا محمد عثمان فارقلیط کی نگرانی و رہنمائی میں تفسیر ''منتخب التفاسیر'' کی جمع و ترتیب کے لیے مولانا کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اِس تفسیر کے سلسلے میں انھوں نے اپنے خودنوشت حالات ''کاروانِ حیات'' میں تفصیل کے ساتھ اہم اطلاعات دی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اِس میں ہندوستان کی تمام مروّجہ اور متداولہ تفسیروں کا خلاصہ یکجا کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ایک ایک آیت کے تحت کئی کئی صفحات کا احاطہ کر رکھا تھا، جو عوامی ذہنوں کے لیے انتشار کا سبب تھا۔ بعض علمائے تفسیر نے بہت اختصار سے کام لیا تھا یہ بھی عوام کی ذہنی سطح سے بالاتر چیز تھی۔ نتیجتاً عوام الناس کے لیے دونوں طرح کی تفسیریں اطمینان بخش نہیں تھیں، اس لیے طویل تفسیری مباحث و مسائل کا اختصار اور مختصر و اہم مضامین و مقاماتِ تفسیر کی تشریح و تفہیم کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ ''منتخب التفاسیر'' میں آیت کے لیے جو جگہ پہلے سے متعین کر دی گئی تھی اتنی ہی جگہ میں ہر آیت کے تحت تفسیری مباحث و مفاہیم اور تشریحات و توجیہات کا کام مرتب کو مکمل کر لینا تھا۔ یہ کام بڑی دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور علمی بصیرت کا متقاضی تھا۔ اسی کے ساتھ قلم کی پختگی اور زبان و بیان

پر قدرت بھی درکار تھی۔ قاضی صاحب اپنی علمی استعداد اور اللہ کی بخشی ہوئی توفیق سے تلخیص وتوضیح کی اِس جاں گسل اور نازک ذمہ داری سے بھی بطریقِ احسن عہدہ برآ ہوگئے۔ انھوں نے ہر مفسر کے مقصد ومنشاءِ عبارت کو سمجھ کر مختصر لفظوں میں اپنی بات مکمل کرلی اور کوئی تشنگی بھی باقی نہیں چھوڑی۔ اُن کی اِس تفسیر کی یہ خصوصیت تھی کہ پہلے عربی متن اور ٹھیک اِس کے نیچے اُردو ترجمہ ہوتا تھا، تفسیر حاشیے پر تھی۔ متن ترجمہ اور حاشیہ کو الگ الگ رنگوں میں چھاپنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اِس طرح یہ تفسیر تین رنگوں میں منظرِ عام پر آنے والی تھی۔

''منتخب التفاسیر'' کے کام کا جب آغاز ہوا تو قاضی صاحب کو مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجمہ کا ''حمائل شریف'' دیا گیا اور تفسیروں میں ''تفسیر بیان القرآن''، ''تفسیر حقانی''، ''تفسیر ثنائی'' ''ترجمان القرآن''، ''تفہیم القرآن'' اور ''تفسیر ماجدی'' کے مطبوعہ حصے فراہم کیے گئے۔ کام کا آغاز ہوا تو وہ روزانہ تقریباً دو صفحے اِس تفسیر کے لکھ لیا کرتے تھے۔ مولانا کے بیان کے مطابق ۱۵؍ جنوری ۱۹۴۵ء سے یکم جون ۱۹۴۶ء تک سولہ ماہ کی قلیل مدت میں انھوں نے اپنے بڑے تفسیری کام کو بڑے سائز کے ساڑھے نو سو صفحات میں سمیٹ کر مکمل کرلیا۔ کتابت کا کام بھی ان کی موجودگی میں شروع ہوگیا اور ساڑھے تیرہ پارہ کی کتابت ہوچکی تھی کہ تقسیم ملک کے ہنگامے شروع ہوگئے اور ہر طرف سرخ آندھیاں چلنے لگیں۔ مولانا ان حالات میں یہ سوچ کر وطن واپس لوٹ آئے کہ جب ماحول سازگار ہوگا اور انسانی ذہن ودماغ سے فرقہ واریت کے گرد وغبار ہٹیں گے تو پھر لاہور آکر اپنے علمی شغل کو جاری رکھا جائے گا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی ختم نہیں ہوئی اور ملک میں خون آشامی کا سلسلہ دراز تر ہوتا گیا۔ مولانا کو پھر لاہور جانے کی نوبت نہیں آئی اور ''منتخب التفاسیر'' ان مکروہاتِ زمانہ کی نذر ہوگئی اور وہ اشاعت پزیر نہیں ہوسکی۔ مولانا کو اپنی جوانی کی اِس مذہبی ودینی اور علمی وقرآنی محنت کے ضائع ہوجانے کا قلق عمر بھر ستاتا رہا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے دورِ شباب میں قرآن کی خدمت کا کام لیا، گو کہ وہ زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا۔ لیکن میری آئندہ کی علمی زندگی کے لیے باعث خیر وبرکت ثابت ہوا۔

اگرچہ ''منتخب التفاسیر'' مطبوع نہیں ہوسکی لیکن مولانا کو تفسیر نگاری سے جو حظِ نفس حاصل ہوچکا تھا اُس کی لذّت کو وہ بھول نہیں سکے تھے۔ اِس لیے انھوں نے روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی سے اپنی وابستگی کے بعد ''جواہر القرآن'' کے عنوان سے قرآن فہمی کی روایت کو پھر زندہ کیا۔ اُن کے اِس سلسلۂ قلم کو مسلمانوں کے ہر طبقے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ ان ہی مباحث پر مبنی مولانا کی کتاب

[illegible]

ہو سکے تو ان کو پھر ان کی محنت میں اس حال کے بعد کی بات ہے۔ اپنے بزرگوں اور
وطن کا علاج اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان
کی خاطر دعا ہی کی جائے۔

علمی و دینی اسفار | علمی انہماک میں رہنے اور کتاب و قلم سے پیمانِ وفا باندھنے کے باوجود قاضی صاحب نے بہت سے علمی و دینی سفر کیے۔ جہاں بھی گئے انہوں نے اپنے علم و عرفان و آگہی میں اضافہ کی کوششیں کیں۔ ان کی سفری روداد "[illegible] اسفار حج" وغیرہ میں شائع ہوئی جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر دور میں علم و معارف کے خریدار رہے اور پوری عمر انہوں نے طالب علم بن کر گزارنی چاہی۔ ان کے غیر ملکی سفر کی ابتداء ۱۳۷۵ھ میں حج و زیارت کے مبارک سفر سے ہوئی۔ دوسرا حج ۱۳۸۵ھ میں، تیسرا ۱۳۹۳ھ میں اور چوتھا حج ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء میں کیا۔ ان کے بیٹے مولانا خالد کمال (۱۹۳۸ء-۱۹۹۹ء) نے اس سفر میں انہیں بلادِ اسلامیہ کی سیر کرائی۔ اس طرح مکہ، مدینہ، جدہ، طائف، الخبر، دمام، ریاض اور درعیہ (محمد بن عبد الوہاب کے شہر) کے اہل علم اور کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ دمشق میں حکامِ بالا نے انہیں ہوٹل والے سے باہر نہیں جانے دیا۔ کویت کے کتب خانوں کو دیکھا اور علمی شخصیتوں سے ملاقات کی۔ پھر شام سے مصر گئے تو جامعہ ازہر کی زیارت کی اور اہم علمی و دینی شخصیتوں سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ قاہرہ ان کی نظر میں دار العلوم و آثار معلوم ہوا۔ فراعنۂ مصر کی حنوط کی ہوئی لاشوں، اہرام مصر اور ابوالہول سے عبرت حاصل کی۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات پر حاضری دی۔ کتب خانوں سے علمی استفادہ کیا۔ قاہرہ سے اردن گئے تو بیت المقدس کی زیارت کرنی چاہی مگر اسرائیل نے اجازت نہیں دی۔ اردن یونیورسٹی کے اساتذہ سے مذاکرہ رہا اور کتابوں کا تحفہ ملا۔ اردن میں رومتہ الکبریٰ کے قدیم مدرج و آثار بہت ہیں، عجائب خانوں میں اموی خلفاء و امراء کے لباس و ظروف موجود تھے۔ پانچواں حج ۱۴۰۲ھ میں امیر الحج کی حیثیت سے کیا۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں تنظیم فکر و نظر سکھر (پاکستان) کی دعوت پر ہندوستان کے ایک علمی وفد کے ساتھ سندھی ادبی میلہ کے اجلاس میں شرکت ہوئی اور انہیں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے ہاتھوں اعزازات حاصل ہوئے۔ ۱۴۰۰ھ میں اسلام آباد میں تیسری عالمی قرآن کانفرنس اور پاکستانی حکومت کی سیرت کانفرنس میں شرکت ہوئی اور دونوں میں جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے بعد بھی ان سے مختلف تقریبات میں بار بار ملاقات ہوتی رہی۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے تحائف سے اپنی نیازمندی کا اظہار کیا۔ اگست ۱۹۸۶ء میں اسی تنظیم نے قاضی صاحب کی کئی کتابیں شائع کیں اور ان کتابوں کی رسم اجراء میں انھیں خصوصی دعوت شرکت دی۔ صاحبان فکر و نظر نے قاضی صاحب کی علمی شخصیت اور کارنامے پر اظہار تحسین کیا اور انھیں اپنے علاقہ علمی کا محسن عظیم قرار دیا۔

اداروں سے تعلق قاضی صاحب کی زندگی علوم و معارف سے عبارت تھی۔ اس لیے ان کا علمی تعلق بھی علمی اداروں سے بہت گہرا اور مثبت تھا۔ ضلع اعظم گڑھ اور آس پاس کے ضلعوں میں جو معروف مدارس ہیں سب سے ان کا لگاؤ رہا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اداروں کی رکنیت بھی انھیں حاصل تھی۔ وہ انجمن تعمیرات ادب مزنگ لاہور کے معتمد، ادارہ التراث العربی کویت کے مشیر علمی، جمعیۃ العلماء مہاراشٹر بمبئی کے صدر، دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر کے صدر، انجمن خدام النبی کے رکن، رویت ہلال کمیٹی جامع مسجد بمبئی کے رکن، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے سربراہ، دار المصنفین اعظم گڑھ کے رفیق اعزازی، ماہ نامہ ''برہان'' دہلی کے مدیر اعزازی، دار العلوم تاج المساجد بھوپال، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ اشرفیہ نیا بھوج پور (بہار) کے رکن مجلس شوریٰ تھے۔ وہ اپنے علاقہ کے تمام مدارس سے گہرا ربط رکھتے تھے۔ ان کے ذمہ داروں کی حوصلہ افزائی، نظام تعلیم میں دلچسپی اور ان کی جملہ رہنمائی کے لیے ہمہ وقت تیار رہا کرتے تھے۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کا بیان ہے کہ:

> ''قاضی صاحب کی عنایت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ دیوبند کے سفر کے دوران اس نواح میں اپنے نیازمندوں اور رابطہ رکھنے والوں سے ملاقاتیں کرکے خوش ہوتے تھے اور جو لوگ قاضی صاحب سے گزارش کرتے ان کے مدارس کا سفر کرتے، جس کے لیے نہ موٹر کی ضرورت تھی، نہ زادراہ، نہ نذرانہ کا سوال''[1]

مولانا جب بہرائچ میں الانصار سے متعلق تھے اس وقت مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کے ساتھ کاغذ خریدنے کے سلسلے میں لکھنؤ جایا کرتے تھے۔ راستہ میں مدرسہ فرقانیہ گونڈہ سے بھی تعلق ہو گیا تھا۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں میونسپل لائبریری لاہور سے متعلق ہوئے اور وہاں سے کتابیں لاکر ان سے استفادہ کرنے لگے۔ ان کی کتاب ''ائمۂ اربعہ'' میں ''طبقات الشافعیہ الکبریٰ'' اور ''تاریخ ابن عساکر'' کے جو حوالے دیے گئے ہیں وہ اسی لائبریری سے حاصل کی گئی کتابوں کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں اقتباسات کی مدد سے بعد میں ''افادات امام احمد ابن حنبل'' کے نام سے

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۲۸۲)

ایک کتاب بمبئی میں کاتب سے لکھوائی جو ابھی تک غیر مطبوع صورت میں ان کے اخلاف کے پاس پڑی ہوئی ہے۔اس کے علاوہ ابنائے مولوی محمد بن غلام سورتی کے کتب خانہ بمبئی سے ان کا گہرا تعلق تھا۔قاضی صاحب نے اس کتب خانہ سے حاصل معلومات واقتباسات سے اپنی علمی وتصنیفی زندگی میں کافی فائدہ اٹھایا۔اسی طرح انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی میں کریمی لائبریری کے نام سے قدیم اردو، عربی، فارسی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا،اس سے بھی استفادہ کیا اور قدیم اُردو اخبارات سے مبارک پور اور اعظم گڑھ کے بارے میں اہم معلومات حاصل کیں۔گزشتہ صدی میں یہاں کے فسادات وغیرہ کے بارے میں کافی مواد جمع کیا۔

اداروں کا قیام مولانا کے اندر تحریکِ علمی اور فلاح قومی کی جو تڑپ قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ جہانِ علم ودانش کے گہواروں سے ربط وتعلق رکھیں، وہیں جہل وغباوت کے اندھیروں کے خلاف جنگ چھیڑنے کی تیاری بھی کریں اور اپنی زندگی کے چراغ سے ایسے چراغ راہ روشن کرجائیں، جو ان کے چراغ حیات کے گل ہوجانے کے بعد بھی اسلامی اقدار وروایات کی روشنی کو ہر دور میں محفوظ رکھنے کی ضمانت بنیں۔اسی جذبے کے تحت بھیونڈی میں ایک مدرسہ مفتاح العلوم کے نام سے ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۱ء میں بھیونڈی کے کچھ دینی خدمات کا جذبہ رکھنے والے افراد کے تعاون سے قائم کیا۔ بھیونڈی میں مبارک پور اور آس پاس کے کچھ لوگ آباد وخوش حال تھے۔وہ لوگ اس کے قیام پر رضامند ہوئے۔قاضی صاحب کے دوست مولوی محمد یٰسین ابراہیم پوری اس کے پہلے مدرّس قرار پائے۔اب یہ مدرسہ ترقی واستحکام حاصل کرکے دین کا قلعہ بن چکا ہے اور خیر وفلاح کے کام میں لگا ہوا ہے۔

ادارہ احیاء المعارف:- ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۶۰ء میں معہد ملت مالیگاؤں کے اوّلین مدرّسین مولانا بشیر احمد مبارک پوری، مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری اور مولانا حبیب الرحمٰن خیرآبادی تھے۔انھیں دنوں میں مولانا قاضی اطہر ایک ہفتہ تک مالیگاؤں میں ادارۂ احیاء المعارف کے قیام کے سلسلے میں مقیم رہے۔اس کے قیام کے پیچھے یہ مقصد تھا کہ عربی کی نادر ونایاب کتب اور مخطوطات شائع کئے جائیں۔اس زمانے میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث کبیر متوفی ۱۹۹۲ء بمبئی زیادہ آتے جاتے تھے۔انھیں اس کی سربراہی کے لئے منتخب کیا گیا۔علماء اس کے ارباب حل وعقد بنائے گئے اور ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء میں اس ادارے کی طرف سے پہلی کتاب ''انتقاء'' (اختصارِ کتاب الترغیب والترہیب للمنذری لابن حجر متوفی ۸۵۲ھ) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تعلیق وتصحیح کے ساتھ عربی ٹائپ میں شائع کی گئی، انھیں مولانا اعظمی کی تعلیق وتصحیح سے حضرت عبداللہ ابن مبارک کی کتاب ''الزہد والرقائق'' چھپی۔مولانا عبدالحمید نعمانی

بانی معہد ملت مالیگاؤں اور دوسرے مالیگانوی علماء مثلاً مولانا محمد عثمان، مولانا عبدالقادر وغیرہ کی کوششوں میں یہ بات شامل ہوگئی کہ جو مبارک پوری علماء معہد ملت کی مدرّسی پر مامور ہیں، ان کی جگہ پر مقامی مدرّسین کی تقرری کی جائے اس علاقائی عصبیت نے ادارۂ احیاء المعارف کے سلسلے میں مستقبل کے لیے اندیشے پیدا کردیے مولانا قاضی اطہر اس سے علاحدہ ہوگئے اور دو کتابوں کی اشاعت کے بعد ادارہ بھی ختم ہوگیا۔ احیاء المعارف سے مولانا اعظمی کی شہرت و ناموری کو بڑا فائدہ پہنچا اور وہ علمی دنیا میں پہچانے جانے لگے۔

دائرۂ ملیہ:- مورخ اسلام مبارک پوری نے تصنیف و تالیف کی غرض سے ایک ادارہ ''دائرۂ ملیہ'' اپنے وطن مبارک پور میں قائم کیا اس ادارے سے قاضی صاحب نے ۱۹۵۰ء میں ''افادات حسن بصری'' کے نام سے چھپن صفحات کا ایک رسالہ شائع کیا۔ یہ رسالہ مولانا نے احیاء العلوم کی اپنی عارضی مدرّسی کے وقت میں لکھا تھا۔ اس کے مقدمہ میں تاریخ ۸؍ذوالقعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۱؍ستمبر ۱۹۴۷ء درج ہے۔ مولانا کی دوسری کتابیں تذکرۂ علمائے مبارک پور وغیرہ بھی اسی ادارہ کے اشاعتی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ:- مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث مئوی، مولانا عبداللطیف نعمانی مہتمم جامعہ مفتاح العلوم مئو (۱۸۹۸ء-۱۹۷۲ء) اور قاضی صاحب میں ایک ایسے ادارہ کے قیام کی بات چل رہی تھی، جو قدیم علمی و دینی کتابوں اور صدرِ اسلام کے محدثین و فقہا کے مخطوطات کو تعلیق و تحشیہ کے ساتھ جدید مذاقِ علمی کے مطابق چھاپے۔ اس کے ساتھ موجودہ دور کے عصری تناظر میں بعض فقہی مسائل میں تحقیق کرے اور اسلامی دنیا کے مستند علماء سے استصوابِ رائے کرے۔ تقاضائے وقت کے مطابق تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا کام بھی اس کے ذریعہ ہو۔ اس کے تمام کاموں کی سرپرستی مولانا اعظمی فرمائیں۔ پہلی میٹنگ ۱۵؍مئی ۱۹۶۵ء کو مئو میں ہوئی، دوسری نشست ادری میں، اسی مئی میں ہوئی، مگر یہ خواب اپنی تعبیر نہیں پاسکا۔ اس کا نام ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ تجویز ہوا تھا۔ اسی کے تعلق سے ''انقلاب'' بمبئی کی ایک اشاعت میں دو فاضل اساتذہ قاضی اطہر مبارک پوری اور سید عبدالعزیز عزت مبعوث الازہر بمبئی نے ثقافتِ اسلامی اور اصلاحِ امت کے[1] سلسلے میں ایک بحث شروع کی تھی، اسی میں قاضی صاحب نے بمبئی میں دارالمعارف اسلامیہ کے قیام پر بھی توجہ دلائی تھی۔ جس کو پڑھ کر الاستاذ احمد فرید الیمانی نے لکھا تھا:

> ''استاد مبارک پوری نے مغربی علماء کی اسلام کے خلاف دشمنانہ حرکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے''[1]

[1] ماہنامہ البلاغ بمبئی ستمبر ۱۹۶۷ء 'اصلاح امت اور ہماری ذمہ داری' (ص:۴۲)

آگے چل کر وہ دارالمعارف کی تجویز کے بارے میں کہتے ہیں:

"میں جناب مولانا قاضی اطہر مبارک پوری سے کہتا ہوں کہ آپ اپنی تجویز میں حق اور حقیقت پر ہیں اور اس میں اخلاص کی بڑی فراوانی ہے۔ مگر میرے محترم! آپ اپنے اخلاص وافکار میں تنہا ہیں۔...... جس بستی کو آپ نے آواز دی ہے وہ نہ آپ کو ہی سنتی ہے اور نہ آپ کے اُن خیالات کو جانتی ہے، جنھیں آپ نے دارالمعارفِ اسلامیہ کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔ یہ دنیا نئی دنیا ہے، جو نئی راہوں پر چلا رہی ہے اور اپنے شاندار ماضی اور پرشکوہ روایات سے یکسر نابلد ہو کر جدید تمدن اور نئے ماحول پر اپنے ذہن و مزاج کو قربان کر رہی ہے"[1]

جامعہ حجازیہ:- ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں مولانا نے جامعہ حجازیہ کے نام سے مبارک پور میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس کی شاندار مسجد اور عمارت کی تعمیر ہوئی۔ پرائمری تعلیم سے آغاز ہوا اور بعد میں عربی، فارسی اور حفظ کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا، مگر اس کے بعد کچھ اس طرح کے حالات پیش آئے کہ اس کی علمی مجلس کا رنگ باقی نہ رہا۔ لیکن اب قاضی صاحب کے لڑکے قاضی ظفر مسعود نے اس کی نشأۃ ثانیہ کے طور پر تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ چوں کہ ظفر مسعود بھی علم و تعلم کے سلسلے میں گرمیِ اخلاص کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ اس کے حوالے سے ان کی خدمات بھی لائقِ تحسین ہیں۔ ان سے بجا طور سے یہ توقع کی جانی چاہیے کہ یہ باپ کے ادھورے کاموں کی تکمیل اور ان کی علمی و تعلیمی یادگاروں کو باقی رکھنے میں کوئی دقیقہ فراموش نہیں کریں گے۔ وہ اپنی جہد مسلسل سے نئی روح پھونکیں گے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے (اقبال)

کتب خانۂ قاضی:- یہ مولانا کا بڑا قیمتی کتب خانہ ہے۔ مولانا بچپن ہی سے کتابوں کی فراہمی میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جلدیں باندھ باندھ کر پیسہ جمع کر کے ان سے عربی کی قدیم کتابیں خریدتے تھے۔ اس کی تفصیلات قاضی صاحب نے "قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک" میں لکھی ہیں۔ مولانا کے یہاں عربی کی قدیم کتابوں، تاریخ و رجال، سیر و مغازی اور جملہ علوم و فنون پر ایک قیمتی ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے۔ سفر میں بھی کہیں آتے جاتے تو اپنے ذوق کی کتابیں خرید لیا کرتے تھے۔ جب ان کی شہرتِ علمی دنیا میں ہوئی تو بہت سے اداروں، قلمکاروں، حکومتوں نے بھی انہیں اپنی مطبوعات ہدیتاً پیش کیں۔ آج

[1] ماہ نامہ البلاغ بمبئی ستمبر ۱۹۶۷ء "اصلاح امت اور ہماری ذمہ داری" (ص:۴۴)

انھیں کتابوں پر مشتمل ان کا ''کتب خانۂ قاضی'' ایک اہم تحقیقی و علمی ادارہ بن چکا ہے۔ کوئی بھی علم و تحقیق کا متلاشی، خصوصاً مشرقی علوم پر تحقیق کرنے والا اس کتب خانے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مولانا کا یہ صدقۂ جاریہ ان کے وفات کے بعد بھی اہلِ علم کی پیاس بجھا رہا ہے۔

انصار گرلس انٹر کالج:- حاجی عبدالغنی اطلس والا مبارک پور کے پارچہ بافوں سے وطنی نسبت رکھنے کے علاوہ قومی و فلاحی، تعلیمی و تہذیبی تصورات کے اطلسی تانے بانے سے عملی دنیا کی کارگہِ شیشہ گری کے نازک عمل میں، ایسے فلاحی و رفاہی اداروں کی زرتار قباء گلگوں تیار کرتے ہیں، جو آگے چل کر تعلیمی و تہذیبی ملبوسات و زیورات سے عاری بلکہ نیم برہنہ قومی و ملی زندگی کے لیے سولہ سنگھار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ معاشی اعتبار سے نہایت مصروف اور ہنگامہ خیز زندگی گزارتے ہیں۔ مگر وہ اپنی خدمات و جذبات کے حوالے سے تاجروں کے اس بے غرض، بے باک، بے لوث، دردمند، عوام دوست، دیانت دار، باضمیر اور دوراندیش قبیلے سے تعلق و علاقہ رکھتے ہیں، جو اَب دن بدن ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کی جتنی ضرورت بڑھ رہی ہے، اتنی ہی ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ ان کے دونوں بھائی مرحوم محمد سیٹھ اطلس والا، اور عبدالشکور اطلس والا بھی اپنی خاندانی روایتوں کے امین ہیں۔ اسی طرح ان تینوں بھائیوں کے اخلاف بھی صالح اور نیک ہیں۔ مختلف ملی، سماجی اور قومی میدان میں سرگرمِ عمل ہیں۔ یہ پورا کنبہ قاضی صاحب کا معتقد اور قدر شناس بھی ہے۔ چوں کہ مبارک پور میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کوئی دانش گاہ نہیں تھی۔ حاجی عبدالغنی اپنی مادرِ وطن کی گود میں ایک ایسی تربیت گاہ کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے اس اضطراب ذہنی کا ذکر قاضی صاحب سے کیا۔ اس طرح حاجی صاحب کی تحریک اور قاضی صاحب کی تنظیم پر تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں ایک خواب دیکھا گیا۔ جس کی تعبیر بھی دیکھنے کے لیے مبارک پور کے چند باحوصلہ نوجوانوں پر مشتمل ''انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی'' وجود میں آئی۔ جس کے تحت ۱۰؍اپریل ۱۹۷۶ء کو انصار گرلس اسکول کی بنیاد گزاری کے لیے قاضی صاحب کے ہمراہ حاجی عبدالغنی اطلس والا، شبیر احمد راہی اور مولانا عبدالرحمٰن قمر مبارک پوری بمبئی سے مبارک پور تشریف لائے۔ جلسۂ سنگ بنیاد کی صدارت قاضی صاحب کے حصے میں آئی۔ حاجی عبدالغنی اطلس والا اس تعلیمی ادارے کے بانی سرپرست اور قاضی ظفر مسعود بانی صدر ہیں۔ حاجی عبدالغنی اطلس والا کی سرپرستی میں یہ اسکول انٹر کالج بن چکا ہے۔ حاجی صاحب کے بھائی مرحوم حاجی محمد سیٹھ اطلس والا بار بار بمبئی سے آکر اپنے ذہنی خاکہ کے مطابق اس عمارت کے نقش و نگار میں رنگ بھرتے رہے اور اب اس کی عمارت

حاجی صاحب کے ذوقِ تعمیر کی تصویر بنی مسکرا رہی ہے۔ ضلع اعظم گڑھ کے حسنِ صورت رکھنے والے تعلیمی اداروں میں اس کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں تقریباً سترہ سولڑکیاں زیرِ تعلیم ہیں۔ اس کی حنابندی ولالہ کاری میں قاضی صاحب کا بھی خونِ جگر شامل ہے۔ ایوب مبارک پوری متوفی ۳ر نومبر ۲۰۰۵ء مطابق ۲۹ر رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ نے اپنی تعزیتی نظم کے ایک شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

بانیِ انصار کی خدمت عظیم الشان ہے دخترانِ قوم پر یہ آپ کا احسان ہے

تصانیف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے مضمون نگاری کرنے لگے تھے۔ اس دور میں ان کے مضامین دینی و مذہبی رسالوں میں چھپنے لگے تھے۔ مولانا کا بیان ہے کہ:

> ”قلم پکڑنے اور کچھ نہ کچھ لکھنے کا شعور اُردو تعلیم کے زمانہ ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ عربی شروع کی تو اس کا شوق زیادہ ہو گیا اسی زمانہ میں رسالہ ”مومن“ بدایوں کے اڈیٹر مولوی محمود الحسن صاحب توسیع اشاعت کے لیے مبارک پور آئے، میں ان سے ملتا رہا۔ انھوں نے میرے شوق کو دیکھ کر کہا کہ تم مضمون لکھو میں شائع کروں گا“[۱]

اس سے پہلے اخبار الجمعیۃ دہلی میں ”واردھا کی خطرناک تعلیمی اسکیم“ کے عنوان سے مولانا کا ایک مختصر مضمون چھپا۔ پھر ۱۳۵۳ھ میں رسالہ ”مومن“ بدایوں میں ایک مضمون ”مساوات“ کے زیرِ عنوان اشاعت پذیر ہوا۔ پھر اسی رسالہ میں ”رہا دین باقی نہ اسلام باقی“ کے عنوان سے دو صفحے کا دوسرا مضمون چھپا۔ اسی زمانہ میں ہفتہ وار ”العدل“ گوجرانوالہ (پنجاب) میں مولانا کا ایک مضمون ”بلاکشانِ اسلام“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس طرح مولانا اپنی طالب علمی ہی میں اچھے خاصے مضمون نگار کی حیثیت سے نام کما چکے تھے۔

مولانا کی مضمون نگاری بھی ان کی شاعری ہی کی طرح بے منتِ استاد صرف اپنے اعتماد و یقین کی بنیاد پر تھی۔ انھوں نے اس فن میں کسی کی شاگردی قبول نہیں کی۔ ان کے اساتذہ و شیوخِ علم میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کی ادیبانہ و شاعرانہ حیثیت رہی ہو۔ اپنے اساتذہ کے سلسلے میں مولانا ارقام فرماتے ہیں:

> ”مدرسہ احیاء العلوم کے مدرّسین و اراکین کو تصنیف و تالیف کا ذوق بالکل نہیں تھا۔ ایک مرتبہ ”بزم احباب“ احمد آباد نے ”ائمۂ اربعہ“ کے سوانح پر مدرسہ کے طلباء سے مضمون طلب کیا تو بڑی مشکل سے بعض اساتذہ نے اس کو ترتیب دیا“[۲]

---

[۱] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۷ء (ص:۳۹) [۲] ایضاً (ص:۳۴)

مولانا نے قدیم اساتذہ سے قدیم طرز کی مکمل تعلیم احیاء العلوم میں پائی تھی۔ جن میں کوئی مدرس تصنیف وتالیف، مضمون نویسی ونظم نگاری کے میدان میں چند قدم بھی نہیں چلے تھے۔ اس لیے کسی سے انہیں کوئی رہنمائی نہیں ملی۔ مولانا اپنی مضمون نویسی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''مضمون نویسی کے بارے میں صرف میرا ذوق رہنما ہوا اور خود اعتمادی نے ہمت افزائی کی۔ معلومات کی فراہمی، ان کی ترتیب اور اسلوب نگارش وغیرہ میں کسی کی رہنمائی حاصل نہ ہو سکی۔ اس لیے ایک مضمون کئی کئی بار لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا اور کافی محنت کے بعد میرے ذوق کے مطابق ہوتا''[1]

مولانا کی یہی محنت اور جاں فشانی مضمون نگاری میں رنگ لائی۔ وہ اپنے علم ومطالعہ کے سہارے آگے بڑھے اور مضامین وکتب لکھنے کے لائق ہوئے۔ چوں کہ اس زمانہ میں مولانا سید محمد میاں مدرسہ شاہی جامعہ قاسمیہ مرادآباد سے رسالہ ''قائد'' نکالتے تھے۔ انھوں نے مولانا کے مضامین نظم ونثر کو اپنے رسالہ میں جگہ دی اور انھیں علمی دنیا میں متعارف کرایا۔ اس لیے مولانا کے لکھنے پڑھنے کا شوق مسلسل ترقی کرتا گیا۔ اسی حقیقت کو یاد رکھتے ہوئے مولانا مبارک پوری نے مولانا سید محمد میاں کا اعترافِ احسان ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم اس سلسلے میں میرے اولین محسن اور مربی ہیں۔ اگر ان کی توجہ نہ ہوتی اور رسالہ قائد میں مضامین شائع نہ ہوتے تو شاید میں تصنیف وتالیف کے لائق نہ ہوتا اور میری جولانیٔ طبع نامساعد حالات کی نذر ہوگئی ہوتی''[2]

مولانا کو مصنف ودانشور بنانے میں رسالہ ''قائد'' اور دوسرے جرائد کا جیسے اہم رول رہا ہے، بالکل اسی طرح مولانا کا نام بھی جب رسالوں میں مضمون نگار کی حیثیت سے شائع ہونا شروع ہوا تو اس نے بھی مولانا کے علمی وفکری ذوق کو مہمیز کیا اور ان میں وہ انہماک پیدا ہوا کہ قلم کی روانی پر رنگِ شباب آتا گیا اور یہ ایک اچھے مصنف بن کر دنیا کے سامنے آئے۔ اگر رسالوں میں ان کے مضامین ان کے نام سے نہ چھپتے تو ان کی شخصیت کی تکمیل اور ان کی فکری تشکیل اس نہج پر نہیں ہوئی ہوتی، جس نہج پر ہوئی۔ جب ۱۵ر جون ۱۹۵۰ء کو روزنامہ ''جمہوریت'' بمبئی کا اجراء ہوا، تو مولانا حامد الانصاری غازی اس کے مُدیر اور مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اس کے نائب مدیر ہوئے۔ مولانا تقریباً پورا رسالہ مرتب کرتے

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۹ء (ص: ۳۵-۳۶) [2] ایضاً (ص: ۳۷)

تھے اور اس کے مشمولات کو وقیع بنانے کے لیے محنت سے مضامین لکھتے تھے، جس کی وجہ سے ''جمہوریت'' کو علمی حلقوں میں اعتبار و وقار نصیب ہوا۔ مگر مولانا کا نام ہمیشہ پردۂ خفا میں رہتا تھا۔ اس کے بارے میں مولانا کا بیان ہے کہ:

''میں چار چار پانچ پانچ کالم میں علمی، تاریخی، دینی اور سیاسی مضامین لکھنے کے ساتھ اکثر و بیشتر طول طویل مضامین بھی لکھتا تھا۔ مگر میرا نام کہیں نہیں آتا تھا۔ مولانا حامد الانصاری غازی مجھے اخلاص سے دینی خدمت کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ نام و نمود اور ریا سے منع کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ بنیاد کا پتھر نیچے ہوتا ہے آپ بنیاد کے پتھر ہیں۔ اگر میں اپنا نام اوپر یا نیچے لکھتا تو قلم زد کر دیتے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ عمارت جس قدر بلند و بالا ہوتی جائے گی، بنیاد کا پتھر اُتنا ہی زیر زمین ہوتا جائے گا'' [1]

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ادیب یا شاعر کو آگے بڑھانے میں اس کے نام کا اظہار ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس لیے تشجیع اور داد و تحسین کی بہت اہمیت ہے اور اس داد و تحسین کی ذہن سازی اور شخصیت آفرینی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ مولانا کا نام جب سے رسالوں میں آنے لگا تو ان کا حوصلہ بھی بڑھنے لگا اور تصنیفی و تالیفی صلاحیتوں کی عملاً صیقل گری بھی ہونے لگی۔ مولانا کے نام سے جب مضمون شائع ہوتا تو وہ عموماً رسالوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے دوستوں کی محفل میں جاتے اور اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے۔ دوسرے دوست احباب کچھ پوچھتے تو مولانا رسالہ ان کے ہاتھ میں دے دیتے۔ اس طرح جب ان کے احباب کی نگاہ ان کے مضمون پر پڑتی اور وہ پڑھنے لگتے تو مولانا کو ایک ذہنی لذت محسوس ہوتی اور طبیعت میں انشراح پیدا ہوتا۔ مولانا کا بیان تھا کہ ابتدائی دور مضمون نگاری میں مجھے اس قسم کی نمائش نے بڑا فائدہ پہنچایا اور اس نے میری خفتہ صلاحیتوں کو بیدار ہونے کا بہترین موقع فراہم کیا۔ دھیرے دھیرے میرے اندر کا مصنف اپنے ساز و سامان اور نئے برگ و بار کے ساتھ سامنے آتا گیا۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے قیامِ لاہور کا زمانہ یعنی ۱۳؍ جنوری ۱۹۴۵ء سے ۱۰؍ جون ۱۹۴۷ء کی مدت (یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء سے جنوری ۱۹۴۷ء کل پانچ ماہ چھوڑ کر جب مولانا اپنے والد گرامی کے سفرِ حج پر روانگی کی وجہ سے اپنے گھر پر رہنے کو ضروری خیال کر کے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں عارضی مدرّس ہو گئے تھے۔) مولانا اطہر کی شاعرانہ حیثیت کو نکھارنے اور سنوارنے کے اعتبار سے بھی اور ان کی

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۹۰)

ادیبانہ ومورخانہ صلاحیتوں کو ابھارنے کے نقطۂ نظر سے بھی بہت زرّین زمانہ ہے۔ سب سے زیادہ اسی زمانے میں مولانا کو اپنی شخصیت سازی کا بہترین موقع ملا۔ قیامِ لاہور نے ان کی علمی وفکری اور ادبی وشعری سمت وجہت کو ایسا متعین کیا کہ مولانا پھر کبھی اس سے انحراف نہیں کر سکے وہ پوری عمر اسی سمت میں اپنے علمی سفر کو آگے بڑھاتے رہے اور ترقی کے مرحلے طے کرتے رہے۔ مولانا نے بمبئی میں جا کر جو ہمہ گیر حیثیت وشہرت حاصل کی اس کی بنیاد لاہور ہی میں پڑ چکی تھی۔ لاہور مولانا کے خوابوں کا شہر تھا۔ اس شہر اور اس کی علمی وادبی فضا کے بارے میں مولانا کا بیان ہے کہ:

''لاہور علم وادب کا مرکز تھا۔ ادباء وشعراء اور مصنفوں اور صحافیوں کی چہل پہل تھی۔ معمولی قسم کے شاعر وادیب ہوٹلوں میں شعر وشاعری اور چائے نوشی کیا کرتے تھے۔ جہاں چار ادیب وشاعر بیٹھے کوئی نہ کوئی ادبی پروگرام بن گیا اور فوراً اس پر عمل بھی ہونے لگا۔ مصنف تیار، کاتب تیار اور کام چالو۔ مصنف روزانہ لکھ کر کاتب کو دیتا اور دوسرے دن پھر یہی ہوتا اور ماہ دو ماہ میں کتاب مارکیٹ میں آجاتی۔۔۔۔۔۔ نئے نئے موضوعات سوچ کر نکالے جاتے تھے۔ منشی عبدالرحیم صاحب نے ایک موضوع یہ رکھا کہ لاہور میں جتنے قبرستان ہیں ان کے کتبات نقل کر کے ایک بہترین معلوماتی کتاب تیار ہو سکتی ہے''[1]

مولانا قاضی اطہر نے لاہور میں جو کتابیں لکھیں یا دوسروں کے کہنے پر کوئی کتاب لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو اس سے ان کے علمی تجربات میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے نئے نئے موضوعات پر مسوّدے کی صورت میں معلومات جمع کیں اور بعد کی تصنیفی زندگی میں ان سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ مولانا نے جن موضوعات کو عنوان بنا کر معلومات جمع کی تھیں اور بعد میں ان سے ان کی کئی کتابوں کو وجود اور پیرہن ملا ان کی تفصیل یوں ہے:

(۱) الطبابۃ عند العرب:- (عربوں کا علم طِب) اس موضوع پر مولانا نے اچھی خاصی معلومات جمع کر لی تھیں۔ اور اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا ان کا ارادہ تھا۔ مگر کثرتِ کار کے ہجوم میں اس موضوع پر کام آگے نہیں بڑھ سکا۔ مولانا نے بہت بعد میں ''نذرِ حمید'' (حکیم عبدالحمید دہلوی مالک ہمدرد دواخانہ دہلی) کے لیے اُردو کے مشہور محقق اور ماہر غالبیات مالک رام کی فرمائش پر ''عرب وہند کے طبی تعلقات'' کے عنوان سے ایک مضمون سپردِ قلم فرمایا۔ جو شائع ہو کر علمی وتحقیقی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ یہ مقالہ ''نذرِ حمید'' میں صفحہ ۴۳۹ر سے صفحہ ۴۵۱ر تک پھیلا ہوا ہے اور کافی تحقیقی وعلمی انداز کا ہے۔ یہ مقالہ

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۷۵)

مولانا کے خاص اندازِ تحقیق اور محاسنِ تحریر کا نمائندہ ہے۔

(۲) کتب اور کتب خانے:- اس عنوان سے بھی مولانا نے مختلف کتابوں سے اہم معلومات اکٹھا کی تھیں۔ اس موضوع پر بھی وہ لکھنے کا ارادہ کررہے تھے۔ اگر انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہوتا تو اس کا حق ادا ہوگیا ہوتا اور کوئی اہم تحقیقی کتاب تیار ہوگئی ہوتی۔

(۳) حیات امام احمد بن حنبل:- اس موضوع پر مولانا کی تلاش و تحقیق نے بہت کچھ جمع کرلیا تھا، وہ بتاتے ہیں کہ ''تاریخ ابن عساکر'' اور ''طبقات الشافیۃ الکبریٰ'' سے انھوں نے کافی مواد حاصل کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ لاہور کی میونسپل لائبریری سے بھی امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں تقریباً پوری کتاب جو جرمن یا انگریزی یا فرنچ میں لکھے گئے حاشیہ سے مزیّن تھی، نقل کرلی تھی۔ مولانا ذکر کرتے ہیں کہ ''ائمۂ اربعہ'' کی تصنیف میں اس مسوّدے سے بڑی رہنمائی حاصل ہوئی۔

(۴) حیاتِ لیث بن سعد:- اس موضوع پر حافظ ابن حجر کی کتاب ''الرحمۃ الغیثیہ فی ترجمۃ اللیثیہ'' ان کا خاص ماخذ قرار پائی۔ اور وہ ۳؍ مارچ ۱۹۴۷ء کو اس دور میں اس امام جلیل پر تذکرہ مرتب کررہے تھے، جب لاہور فرقہ وارانہ فساد کی آگ میں جل رہا تھا اور گولیوں کے چلنے کی آوازیں مولانا کے کمرے میں بھی آرہی تھیں۔

(۵) اقوالِ حکماء:- اس موضوع پر مولانا نے قرآن و حدیث، ائمۂ دینِ متین، حکماء، سلاطین اور ادباء کے اقوال جمع کیے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ خاصے کی چیز بن گئی تھی۔[1]

اسی طرح مولانا جب لاہور چھوڑنے کے بعد بہرائچ آئے اور اخبار الانصار سے وابستہ ہوگئے تو ''تذکرہ مشاہیر اعظم گڑھ و مبارک پور'' کے عنوان سے جمادی الاول ۱۳۶۷ھ میں کتاب لکھنے کی ابتداء کی اور کافی ضخیم سرمایہ فراہم ہوگیا تھا۔ جو بعد میں جون ۱۹۷۴ء میں ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' کے نام سے مرتب ہوکر اشاعت پزیر ہوا۔ مولانا جب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گئے تو وہاں ''رجال السند والہند'' کے لیے معلومات جمع کرنے لگے۔ بہت بعد میں اسی مسوّدہ سے اپنی اہم کتاب ''رجال السند والہند'' مرتب کرکے شائع کی۔ اور علمی حلقوں میں عزت و ناموری کے مالک ہوئے۔

مضمون نگاری سے ان کے اسی شغف کا نتیجہ ہوا کہ مولانا کو اپنی طالب علمانہ زندگی ہی میں مصنف ہونے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ اس دور کے بارے میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۷۵)

''مضامین واشعار شائع ہونے کے بعد شاعری اور مضمون نگاری کے ساتھ تصنیف وتالیف اور تلاش وتحقیق کا ذوق جرأت وہمت دکھانے لگا۔ چناں چہ میں نے زمانۂ طالب علمی میں پانچ کتابیں لکھیں دو عربی میں اور تین اُردو میں'' [1]

ان کے اس دَور کے قلمی آثار میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) خیر الزاد فی شرح بانت سعاد:- طالب علمی کے زمانے میں ان کی تصنیفی کوششوں کا نقشِ اولیں ''خیر الزاد فی شرح بانت سعاد'' (عربی) ہے جو بڑے سائز کے بیس صفحات کو محیط ہے اور حضرت کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ کے مشہور قصیدہ بانت سعاد کی شرح میں ہے۔ یہ شرح مولانا نے شوال ۱۳۵۵ھ میں عربی میں لکھی تھی۔ اس کے تین صفحے کے مقدمہ میں حضرت کعب بن زُہیر کے حالات، قصیدہ کا واقعہ اور اس قصیدہ کی تقطیع ہے۔

(۲) مرآۃ العلم:- اُس دَور کی دوسری کتاب ''مرآۃ العلم'' (عربی) ہے۔ جو متوسط سائز کے ۵۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ''فہرست ابن ندیم''، ''وفیات الاعیان'' اور ''تذکرۃ الحفاظ'' سے ائمۂ علم وفن اور علمائے سلف کے واقعات مختلف عنوانات پر جمع کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے آخر کے ۶ صفحات میں علم وعلماء کے بارے میں اشعار درج ہیں۔

(۳) ائمۂ اربعہ:- ان کی تیسری کتاب تقریباً سوا سو صفحات پر مشتمل ''ائمۂ اربعہ'' ہے۔ مولانا نے رسالہ ''قائد'' مرادآباد میں ''ائمۂ اربعہ'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ جس میں ''ائمۂ اربعہ'' کے حالاتِ زندگی ''وفیات الاعیان''، ''تذکرۃ الحفاظ''، ''فہرست ابن ندیم'' اور ''تہذیب التہذیب'' وغیرہ سے جمع کیے گئے تھے۔ قیامِ لاہور کے زمانہ میں مرکز تنظیم اہلِ سنت کے اہتمام میں شائع کرنے کے لیے کتابت ہوئی ۱۹۴۷ء تقسیم ملک کے بحرانی دَور میں مولانا نے تصحیح کر کے کتاب روانہ کردی مگر اس کو شائع ہونے کی عزت نہیں ملی۔ اس کا مسوّدہ مولانا کے پاس تھا۔ بمبئی جانے کے بعد مولانا نے اس مسوّدہ کو سلطانی پریس بھیونڈی بازار بمبئی کو چھاپنے کے لیے دیا تھا۔ اس کے مالک سلطان احمد مشرقی پاکستان چلے گئے اور یہ بھی نہیں چھپ سکا تھا۔ بعد میں مولانا نے دوسری کتاب اسی نام سے مرتب کر کے اس کی تلافی کردی۔ اس کو ۱۹۸۹ء میں شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے دوسو پچپن صفحات میں شائع کیا ہے۔

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۷ء (ص: ۳۷)

(۴) الصالحات:- چوتھی کتاب ''الصالحات'' کے نام سے مرتب کی گئی۔ جس میں اہم عربی کتابوں سے صحابیات رضی اللہ عنہم جمعاء کے سبق آموز واقعات جمع کیے گئے تھے، لیکن یہ کتاب بھی تشنۂ اشاعت رہ گئی۔ بعد میں یہی کتاب انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی مبارک پور کی طرف سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔

(۵) اصحاب صفہ:- اس سلسلے کی پانچویں کتاب کا نام ''اصحاب صفہ'' تھا، جو منظوم تھی اور اس میں سوا دو سو اشعار شامل تھے۔ ''شاہ نامۂ اسلام'' کے طرز پر یہ نظم لکھی گئی تھی اور اس کا انداز نہایت عقیدت مندانہ اور والہانہ تھا۔ یہ بھی مطبوع نہیں ہوسکی اور ضائع ہوگئی۔

لاہور میں جن کتابوں کی تدوین وتسوید ہوئی، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۶) منتخب التفاسیر:- مولانا نے اپنے قیامِ لاہور کے زمانہ میں ''منتخب التفاسیر'' کے نام سے جنوری ۱۹۴۵ء میں ایک کتاب لکھنا شروع کی۔ جس میں ہندوستان کے اہم اُردو مفسرین کی تفسیروں کا خلاصہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ۱۵ر جنوری ۱۹۴۵ء سے یکم جون ۱۹۴۶ء کی مدت میں پوری ہوگئی۔ یہ بڑے سائز کے نو سو پچاس صفحات میں تھی۔ ساڑھے تیرہ پارہ کی کتابت بھی ہوچکی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ شروع ہوگیا اور مولانا لاہور چھوڑ کر وطن واپس آگئے اور پھر اس کی اشاعت وطباعت نہیں ہوسکی۔ اسی کتاب کی تدوین کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے مولانا قاضی اطہر کی ملاقات بھی لاہور میں ہوئی تھی۔ اور انھوں نے ''منتخب التفاسیر'' پر قاضی صاحب کو دعاؤں سے نوازا تھا۔

(۷) افاداتِ امام احمد بن حنبل:- امام احمد بن حنبل پر اُردو میں بہت کم کام ہوا ہے۔ مولانا کو اس کا زبردست احساس تھا۔ اس لیے مولانا کی ایک کتاب ''افاداتِ امام احمد بن حنبل'' کے نام سے معرضِ وجود میں آئی۔ جس کی کتابت بھی بمبئی میں ہوچکی تھی، مگر وہ شائع نہیں ہوسکی۔ یہ کتاب آج بھی کتابت شدہ حالت میں مولانا کے اخلاف کے پاس محفوظ ہے۔ اگر یہ چھپ جائے تو کام کی چیز ہوگی۔

(۸) علمائے اسلام کی خونیں داستانیں:- قیامِ لاہور کے زمانہ میں مرحوم احسان دانش کے اصرار پر انھیں کے مکتبۂ دانش گاہِ پنجاب مزنگ لاہور سے شائع کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ جس میں پہلی صدی ہجری سے موجودہ دور تک کی اسلامی تحریکوں اور فتنوں میں علمائے اسلام پر ہونے والے مظالم کا ذکر تھا۔ قاضی صاحب نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے مرتب کیا تھا۔ اور احسان صاحب نے بھی اہتمام سے اس کی عبارت کی نوک پلک درست کی تھی۔ یہ کتاب بہت ضخیم تھی اور تقریباً ساڑھے چار سو صفحات تک اس کی کتابت ہوچکی تھی۔ مگر تقسیم کے ہنگاموں میں یہ کتاب بھی شائع ہونے سے رہ گئی۔

(۹) اسلامی نظامِ زندگی:- یہ مولانا کی پہلی ایسی تصنیف ہے جو اشاعت پزیر ہوئی۔ مولانا نے روزنامہ ''زمزم'' لاہور کی نائب اڈیٹری کے زمانے میں جو دینی واصلاحی مضامین لکھے تھے۔ ان کے تراشے ان کے پاس محفوظ تھے۔ انھیں کی مدد سے اس کتاب کی ترتیب عمل میں آئی۔ جو ۱۹۴۹ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس پر مولانا سید محمد میاں کا مقدمہ بھی ہے۔ اس کی تاریخ تقدیم ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء ہے۔ یہ کتاب دو ہزار کی تعداد میں سلطانی پریس بمبئی سے ۱۹۵۰ء میں چھپی تھی اور حاجی عبداللہ صاحب نے اپنی مرحومہ بیوی کے ایصالِ ثواب کے لیے اس کو مفت تقسیم کیا تھا۔ اس کی مانگ پورے ہندوستان میں ہوئی۔ اس کتاب کے جیبی سائز کے ۲۵۶ صفحات ہیں۔ طبع ثانی گجرات سے ہوئی ہے اور اشاعت ثالث فرید بک ڈپو دلی سے ہوگی۔

لاہور سے آنے کے بعد جو کتابیں یا رسالے معرض وجود میں آئے وہ یہ ہیں:

(۱۰) افاداتِ حسن بصری:- ۱۹۵۰ء میں افاداتِ حسن بصریؒ کے نام سے ۵۶ صفحے کا رسالہ دائرۂ ملیہ مبارک پور کی طرف سے شائع ہوا۔ مولانا نے یہ رسالہ احیاء العلوم کی عارضی مدرّسی کے دور میں تحریر فرمایا تھا۔ اس رسالہ کی افادیت کو دیکھتے ہوئے مارچ ۲۰۰۵ء میں فرید بک ڈپوئی دہلی نے اس کی اشاعت کی ہے۔ اس کے صفحات ۷۰ ہیں۔ اس میں حسن بصریؒ کے ارشادات، مختصر سوانح، ان کے مواعظ، نصائح، خطبات، مکاتیب اور زرّیں اقوال وکلمات تحقیق کے بعد جمع کیے گئے ہیں۔ جو دورِ حاضر کے مسلمانوں کی دینی، سیاسی، تمدنی، قومی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے مینارۂ ہدایت ہیں۔ موجودہ زمانے میں انسانوں کو ان کی سخت ضرورت ہے۔

(۱۱) مسلمان:- ۶۴ صفحے کا رسالہ ہے۔ جس کو دسمبر ۱۹۵۲ء/ ۱۳۷۲ھ میں جمیعۃ المسلمین جنجیرہ نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ یہ رسالہ عام مسلمانوں کی بیداری اور دینی زندگی کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی پانچ اشاعتیں ہو چکی ہیں۔ پہلی بار جمیعۃ المسلمین جنجیرہ نے ۱۹۵۲ء میں، دوسری مرتبہ ساجد لکھنوی نے، پھر مولانا قاضی اطہر نے انجمن اسلام ہائی اسکول کے طلباء کے لیے اپنی معلمی کے زمانہ میں چھاپا اور اس کے بعد مدرسہ دینیہ غازی پور، ویلفیر اکیڈمی مبارک پور اور جمعیۃ العلمائے ہند دہلی نے مشترکہ طور پر چھاپ کر شائع کیا۔ اس کو ۲۰۰۴ء میں اہتمام سے فرید بک ڈپوئی دہلی نے بھی شائع کیا۔

(۱۲) معارف القرآن:- جواہر القرآن کے عنوان سے مولانا مستقل تفسیری کالم روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی میں لکھتے تھے۔ انھیں کے انتخاب سے ۱۲۵ صفحے میں معارف القرآن کے نام سے

۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ میں شائع کی گئی۔ تمام مضامین کا تعلق قرآن پاک کی کسی نہ کسی آیت سے ہے۔ توحید، رسالت، کتاب اللہ اور دینی زندگی اس کے اہم عنوانات ہیں۔ مولانا قرآن کی تفسیر میں اپنی ہم عصر دنیا کے حالات وکوائف پر بھی نظر ڈالتے ہوئے گزرتے ہیں۔ طبع ثانی گجرات سے ہونے والی ہے۔

(۱۳) رجال السند والہند (عربی):- یہ مولانا کی اہم کتاب ہے۔ جس میں ہندوپاک کے ان کاملین فن کا تذکرہ ہے، جو اسلام کی روشنی لے کر تاجر، مبلغ، یا غازی بن کر ہندوستان آئے۔ یا جن کا تعلق سندھ کے علاقہ سے تھا۔ یہ تذکرہ ساتویں صدی ہجری تک کے ارباب علم پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا آغاز مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل کی مدرّسی کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ رجال وطبقات، حدیث وجغرافیہ لغات وادب اور تاریخ وسیر کی اہم اور بنیادی کتابوں کے حوالوں سے کتاب کو اعتبار ووقار دیا گیا ہے۔ اس کتاب نے مولانا کا تعارف عالم عرب کی علمی دنیا میں بہت اچھی طرح کرایا۔ یہ کتاب مطبع حجازیہ بمبئی سے جون ۱۹۵۸ء/ ذوالحجہ ۱۳۷۷ھ میں احمد غریب، ان کے برادران اور دوسرے لوگوں کی توجہ سے شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن دارالانصار قاہرہ سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب اسلامی ہند کے قرنِ اوّل کے علمی ودینی، تہذیبی ولسانی اور سماجی وتاریخی پس منظر کو واضح کرتی ہے۔ کیوں کہ اس کتاب میں علماء، فقہاء، محدثین، راویانِ حدیث، قاضی، حکام، مشائخ وصوفیاء، سربرآوردہ اہلِ علم، شعراء، ادباء، نحو ولغت کے ماہرین، فلاسفہ، اطباء، متکلمین، تاجر اور اہلِ اسلام کے مختلف فرقے اور عقائد ونظریات سے تعلق رکھنے والے حضرات کا تذکرہ نہایت دقتِ نظر کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس سے علمی وادبی اور تہذیبی اعتبار سے عالمِ اسلام میں ہندوسندھ کے رجالِ علمی کے مقام ومرتبہ کا تعین ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ مشہور مقامات وامصار کا تفصیلی تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ جغرافیائی وتمدنی پس منظر بھی واضح ہو سکے۔ اس کتاب میں اُن لوگوں کا بھی ذکر ہے، جن کی پیدائش ہندوسندھ میں ہوئی۔ خواہ اُن کی وفات کہیں بھی ہوئی ہو اور اُن لوگوں کے بھی احوال وکوائف بیان کیے گئے ہیں، جن کے آباء واجداد اصلاً ہندی یا سندھی نژاد تھے۔ لیکن دوسرے ممالک میں ترکِ سکونت اختیار کر چکے تھے اور وہ اہلِ تذکرہ وہیں پیدا ہوئے۔ ان لوگوں کے بارے میں تفصیلی ذکر کسی ایک کتاب میں کہیں نظر نہیں آتا۔ مولانا نے ان تاریخی دانوں کو مختلف ذخیروں سے علیحدہ کر کے اس طرح ترتیب دیا کہ وہ ایک نادر اور معلوماتی تذکرہ کی شکل میں اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اس میں صاحب ترجمہ کے سالِ وفات کا تعین مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے۔ کتاب میں اگر کسی قبیلہ، خاندان، نسل یا قوم کا ذکر آیا ہے اور وہ معروف نہیں ہے۔ یا کسی خاص اہمیت کا حامل ہے

تو مولانا نے مفصل اور تشفی بخش انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا کامل و مکمل ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں ''دارالانصار'' قاہرہ سے ۵۸۸ صفحات میں دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں اسلامی دور سے پہلے کے حکماء و فلاسفہ اور اطباء و حکام کے تذکرے حذف کر دیے گئے ہیں اور بعض کے تراجم و احوال میں کمی و بیشی کی گئی ہے اور ۷۵ سے زائد ارباب علم و فضل کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اُن لوگوں کا بھی تذکرہ شامل کر لیا گیا ہے، جن کی اصلیت و پیدائش تو ہندوسندھ کے علاوہ کسی اور ملک کی ہے۔ مگر سیاسی و اقتصادی یا تبلیغی و دعوتی ضرورت سے ہندوسندھ میں آکر آباد ہو گئے۔ یا اپنا کام مکمل کر کے وہ واپس چلے گئے۔ یہ کتاب اہلِ علم اور اربابِ تحقیق میں بہت مقبول و متداوِل ہوئی۔ لائبریریاں اگر اس کتاب سے خالی ہیں تو ان میں ایک اہم خلاء سمجھا جاتا ہے اور اس خلاء کو اسی وقت پُر سمجھا تا ہے جب یہ کتاب اس میں شامل ہو جائے۔

(۱۴) علی و حسین:- ۱۹۵۹ء میں کراچی پاکستان سے محمود احمد عباسی امروہوی کی ایک فتنہ انگیز کتاب ''خلافت معاویہ و یزید'' شائع ہوئی۔ بعض کم سواد لوگوں کے حلقے میں اس کی بڑی پزیرائی ہوئی۔ اس کے بہت سے جوابات اخبارات و رسائل میں یا کتابی شکل میں سامنے آئے۔ اس کا جواب مولانا نے بھی اپنے اخبار روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی میں ۷/نومبر تا ۱۷/دسمبر ۱۹۵۹ء ۳۵ قسطوں میں لکھا۔ جن کو مرتب کر کے ''علی و حسین'' کے نام سے مارچ ۱۹۶۰ء میں شائع کی گئی۔ یہ کتاب اپنے مباحثِ علمی اور لہجے کی شائستگی و متانت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ ۳۳۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دائرۂ ملیہ مبارک پور سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن عنقریب اسلامک بک فاؤنڈیشن دلی سے شائع ہونے والا ہے۔ اس میں محمود احمد عباسی کی تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کے ساتھ ان کی علمی خیانتوں کی گرفت کی گئی ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بُرہان ستمبر ۱۹۶۰ء میں لکھا کہ:

> ''محمود احمد عباسی کی کتاب ''خلافت معاویہ و یزید'' نے اگرچہ ہند و پاک کے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا کیا۔ لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ بعض اہلِ قلم حضرات اور سنجیدہ حضرات نے کتاب مذکور کے مضامین کا علمی و سنجیدہ رد لکھا اور اس کی وجہ سے اصل مبحث کے متعلق اُردو میں اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا۔ انھیں گنتی کے چند مصنفوں میں قاضی اطہر مبارک پوری ہیں۔ موصوف نے اس کتاب میں جو اُن کے مسلسل مضامین کا مجموعہ ہے پہلے ان تدلیسات و تلبیسات کا پردہ چاک کیا ہے۔ جو عباسی صاحب نے اختیار کی تھیں۔

اس کے بعد حضرت علی اور ان کے دورِ خلافت پر امام حسین کی شخصیت اور مقام و موقف پر
پھر یزید کی ولی عہدی اور اس کے عہدِ امارت کے واقعات پر علمی سنجیدگی اور کمالِ احتیاط
سے روشنی ڈالی ہے اور دوسرے ماخذ کے علاوہ حافظ ابن تیمیہ، ابن خلدون اور ابن کثیر
وغیرہم کے اُن ماخذوں سے بھی استدلال کیا ہے۔ جن پر عباسی صاحب کو بڑا بھروسا تھا۔
اس کے بعد متفرق مگر مفید مباحث مثلاً حدیث ملک غصوص، قاتل حسین عمرو بن سعد،
حدیث غزوۂ مدینہ اور یزید پر گفتگو کی ہے۔ غرض کہ عباسی صاحب کی کتاب کے رد میں
اب تک جو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں زیرِ تبصرہ کتاب جامع اور معتدل نقطۂ نظر اور
سنجیدہ تحقیق و زبان کی حامل ہونے کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے"[1]

(۱۵) دیوانِ احمد :- قاضی صاحب کے جد مادری مولانا احمد حسین رسول پوری کی عربی شاعری کا مجموعہ ہے۔ جس کو قاضی صاحب اور اُن کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحیٰ رسول پوری نے مرتب ومدوّن کرکے اپریل ۱۹۵۸ء میں طبع کرایا۔ مولانا احمد حسین رسول پوری عربی کے اچھے شاعر تھے۔ مولانا احمد حسین رسول پوری، مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی اور مولانا ظفرالدین بہاری تینوں اہلِ علم اور عربی کے باکمال ادیب و ماہرینِ فن نے مدرسہ عالیہ رام پور میں مولانا شیخ محمد طیب صاحب عرب مکی سے عربی ادب کی تعلیم پائی تھی۔ مولانا احمد حسین رسول پوری کا عربی کلام کاغذات میں منتشر تھا اور اس کے ضائع ہوجانے کے اندیشے پیدا ہوچکے تھے۔ قاضی صاحب نے اپنی کتاب ''رجال السند والہند'' کی طباعت کے زمانے میں ان کو یکجا کرکے شائع کرنے کی تدبیر سوچی اور مختصر سا مقدمہ لکھ کر ان اشعار کو مطبوع کراکے محفوظ کردیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔

(۱۶) نارجیل سے نخیل تک :- اس عنوان سے عرب و ہند تعلقات پر مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا طویل مقالہ ہے۔ جو مئی سے اگست ۱۹۶۲ء تک کے معارف اعظم گڑھ کے شماروں میں چار قسطوں میں شائع ہوا اور اہلِ علم و تحقیق میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ حکومتِ ہند کو بھی اس کی اہمیت کا احساس ہوا اور اس نے اس کا عربی میں ترجمہ کراکے اپنے سہ ماہی عربی مجلّہ ''ثقافۃ الہند'' میں شائع کرایا اور عرب ممالک کے سفارت خانوں میں انھیں بھیجا۔ اسی کے ساتھ عرب ممالک میں ہندوستانی سفارت خانوں کو بھی روانہ کیا۔ عرب کے مشہور ادیب و محقق اور مصنف وصحافی استاذ عبدالقدوس انصاری

[1] آئینہ در آئینہ۔ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلّہ ترجمان الاسلام بنارس (ص: ۱۲۸)

نے بھی اپنے "مجلہ البحث" جدہ میں اپنی تعلیقات کے ساتھ دو یا تین قسطوں میں اس کو شائع کیا۔ "قلم" جو ایک گجراتی پرچہ ہے اور نوساری گجرات سے چھپتا ہے۔ اس میں بھی اس مقالے کا گجراتی ترجمہ شائع ہو کر علمی و تحقیقی مزاج والوں میں پسند کیا گیا۔ اب اس مقالہ کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

(۱۷) عرب و ہند عہد رسالت میں:۔ یہ مولانا قاضی اطہر کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس کام کا خاکہ مولانا کے ذہن میں انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کی مدرسی کے زمانہ میں پیدا ہوا۔ ان کے پاس "رجال السند والہند" کے مسودات، تاریخ و جغرافیہ کے اقتباسات کثیر تعداد میں موجود تھے۔ ان معلومات کو یکجا کیا، تو پہلی قسط "نارجیل سے تُنبل تک" معارف کے چار نمبروں میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی اس سلسلہ کے مضامین مولانا لکھتے رہے۔ آخر میں ایک باب کا اضافہ کر کے یہ کتاب مرتب کر لی اور "عرب و ہند عہد رسالت میں" کے نام سے جنوری ۱۹۶۵ء میں ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب بے پناہ مقبول ہوئی۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ قاہرہ مصر کے ایک ناشر کتب نے شائع کیا۔ مکتبہ عارفین کراچی نے اس کتاب کا عکسی ایڈیشن شائع کیا۔ تنظیم فکر و نظر سکھر سندھ (پاکستان) نے بھی اس کا فوٹو شائع کیا۔ چوتھی بار ندوۃ المصنفین دہلی کے پہلے ایڈیشن جنوری ۱۹۶۵ء کا عکسی نو مئی ۲۰۰۰ء میں فرید بک ڈپو نئی دہلی نے شائع کیا۔ پاکستان سے اس کتاب کا سندھی زبان میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اس کتاب کے کل آٹھ ابواب ہیں۔ مثلاً: (۱) نارجیل سے تنبل تک (۲) عرب و ہند کے قدیم تجارتی تعلقات (۳) عرب میں آباد ہندوستانی قومیں (۴) عرب میں ہندوستانی بستیاں (۵) عرب میں آباد ہندوستانیوں کو دعوت اسلام (۶) پیغمبر اسلام اور ہندوستان کے باشندے (۷) عہد رسالت میں ہندوستانی اشیاء کا استعمال (۸) اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا قاضی اطہر نے ان ابواب کی تکمیل میں کتنی جاں کاہیاں اور دل سوزیاں برداشت کی ہوں گی، کتنی کتابوں کو کھنگالا ہوگا، کیوں کہ جس دور مبارک سے اس کتاب کے موضوع کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کتابوں میں بہت کم مواد ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ بکھرا ہوا ہے۔ پورے اعتماد و استناد اور اعتبار و وقار کے ساتھ مولانا نے ان تمام تک کیسے رسائی حاصل کی یہی بہت بڑی بات ہے۔ اس کتاب میں بعض لسانی بحثیں بھی بڑی معلومات افزا اور قابلِ قدر ہیں۔ مثلاً لفظ "بابو" کے سلسلے میں مولانا نے

پر بحث کی ہے، اس کے حوالے سے ان کی لسانی بلند ذوقی اور تحقیقِ الفاظ میں دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''عرب میں بابوس اونٹنی کے بچے کو کہتے ہیں۔ نیز اس کا استعمال گہوارے میں دودھ پیتے انسان کے بچے کے لیے ہوتا تھا۔ تقریباً اسی دوسرے معنی میں ہندوستان میں چھوٹے بچے کے لیے بابو کا لفظ بولا جاتا ہے۔ بابو اور بابوس میں صرف آخر میں سین کا اضافہ ہے۔ نیز عرب میں بچہ باپ کو اور باپ بچہ کو بابا کہتا ہے۔ لسان العرب میں ہے:

وقالوا بـأ بـأ الصبی ابوه اذاقـال له بابا، و بأبأه الصّبی اذاقال لهٔ بابا۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ جب باپ اپنے بچے کو بابا کہتا ہے یا بچہ اپنے باپ کو بابا کہتا ہے تو بأبأ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

ہندوستان اور عرب میں یہ مشترک لفظ تھوڑے سے مقامی اثر و فرق کے ساتھ حدیث میں آیا ہے۔ چناں چہ بخاری میں حدیث جریج راہب میں ہے کہ:

فمسح راس الصّبی و قال له یا بابوس مَن ابـو ك، فـقـال راعی الـغـنـم۔ جریج راہب نے بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ اے بابو تیرا باپ کون ہے؟ اس نے کہا کہ بکری کا چرواہا۔

مولانا فضل اللہ گیلانی ''شرح الادب المفرد'' میں لکھتے ہیں:

البابوس الصغیر، اوالرضیع وھو بابو فی الھند یه۔ بابوس کے معنی چھوٹے بچے یا دودھ پیتے بچے کے ہیں اور ہندی زبان میں یہی بابو ہے[1]

اس کتاب کی تیاری میں قاضی صاحب نے ادب ولغت، تاریخ وطبقات سیر وتراجم، غزوات ومغازی، تذکرہ وسوانح، جغرافیہ اور رجال و احادیث کے ذخیروں سے فائدہ اٹھایا ہے اور ایسے ایسے پہلوؤں پر نظر کی ہے، جو واقعات و روایات اور کتاب و تذکرہ کی عبارتوں میں پوشیدہ تھے اور جن تک کسی اور اُردو ادیب و مورخ کی نگاہِ قلم نہیں پہنچی تھی۔ سید سلیمان ندوی نے ضرور عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی لکھ کر یہ کمی پوری کی تھی اور جو کچھ لکھا تھا اپنی مورخانہ بصیرت کے ساتھ اس کا حق بھی ادا کیا تھا۔ مگر ان کی دسترس میں بھی بعض حوالے نہیں تھے۔ مولانا نے نئے ماخذ، جدید حوالوں اور اپنی نکتہ بیں نگاہوں سے عبارتوں میں اپنے مطلب کی بات تلاش کر کے ایسا مرقع مرتب کیا کہ بڑے بڑے محققین انگشت بدنداں رہ گئے اور مولانا کی علمیت ولیاقت کی انھیں داد دینی پڑی۔

---

[1] عرب و ہند عہدِ رسالت میں۔ مئی ۲۰۰۱ء فرید بک ڈپو نئی دہلی (ص:۱۸۳-۱۸۴)

(۱۸) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں:- ۴۰۰ صفحات کو محیط اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دہلی کے ندوۃ المصنفین کی طرف سے ۱۹۶۷ء میں چھپا۔ دوسرا ایڈیشن مکتبہ عارفین کراچی (پاکستان) سے شائع ہوا۔ تنظیم فکر ونظر سندھ پاکستان نے اس کا تیسرا ایڈیشن اپنے اہتمام میں طبع کرایا۔ مصر کے ڈاکٹر عبدالعزیز عزت نے اس کا عربی ترجمہ "الحکومات العربیہ فی الہند والسند" کے نام سے مکمل کر کے اسلام آباد یونی ورسٹی پاکستان کے مجلّہ "الدراسات العلمیہ" میں قسط وار شائع کرایا۔ پھر کتابی شکل میں مکتبہ آل یداللہ بکریہ ریاض (عرب) نے چھپوایا۔ یہ کتاب بھی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سرمۂ بصیرت ثابت ہوئی اور اس نے علمی وتحقیقی حلقوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کتاب میں مولانا نے عرب وہند کے تعلقات پر اس انداز میں گفتگو کی ہے کہ اس سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے فضا سازگار ہوتی ہے۔ تہذیبیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں، تو ان کے نقوش ورنگ میں کس طرح کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اس کی واضح نقشہ کشی اس کتاب میں ملتی ہے۔

(۱۹) اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ:- اس کتاب کے کل ۲۸۰ صفحات میں قاضی صاحب کے آٹھ مقالات شامل ہیں۔ طبع اول ندوۃ المصنفین دہلی کے زیر اہتمام ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں مولانا نے بعض ظن وتخمین، یا کمزور حوالوں پر مبنی سلسلۂ واقعات وحقائق پر بھی دلائل کے ساتھ بحث کی ہے۔ عام طور پر فاتح ہند محمد بن قاسم کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کے حقیقی چچازاد بھائی اور حجاج بن یوسف کے داماد ہیں۔ اسی طرح ان کی عمر کے بارے میں بھی یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کی امارت وفتوحات کے وقت محمد بن قاسم ثقفی صرف سترہ برس کے تھے۔ مولانا نے اس کتاب کے صفحہ ۹۷ پر ان کی دونوں طرح کی عزیزداریوں پر سیر حاصل گفتگو کر کے بتایا ہے کہ محمد بن قاسم ثقفی حجاج بن یوسف کے حقیقی چچازاد بھائی اور داماد نہیں تھے۔ البتہ خاندانی رشتے میں وہ حجاج کے چچازاد بھائی تھے۔ کتاب کے ص: ۱۰۷ پر عمر کے بارے میں ان کی بحث ان کی تاریخ دانی کی واضح مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے مورخوں کے قول کو مان کر محمد بن قاسم کی عمر ۹۲ھ یا ۹۳ھ میں فتح ہندوستان کے وقت صرف سترہ سال تسلیم کر لی جائے تو ۸۳ھ میں جب کہ وہ فارس کے امیر بنائے گئے ان کی عمر چھ سات سال ماننی پڑے گی جو ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ اس عمر میں کسی بچے کو ملک کی ولایت اور غزوات کی امارت تو دور کی بات ہے، گھر کی کوئی معمولی سی ذمہ داری بھی نہیں دی جاتی ہے"۔

اس حوالے سے اسلامی ہند کی عظمت رفتہ جو ہماری بزم دوشیں کی تہذیبی و علمی یادگار کے طور پر سامنے آئی ہے اس کی تاریخ سے متعلق مضبوط دلائل و شواہد کا پتہ چلتا ہے۔ اس مجموعہ مضامین میں قدیم فاتحین ہند، قدیم ہندی علماء وفضلاء اور عربی و ہندی سیاسی و تہذیبی تعلقات پر اچھے خاصے تاریخی شواہد جمع کیے گئے ہیں۔

(۲۰) خلافتِ راشدہ اور ہندوستان: - ندوۃ المصنفین دہلی کی ۱۹۷۲ء میں شائع کی ہوئی کتاب ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی دوسری اشاعت تنظیم فکر ونظر سندھ پاکستان نے اپنے اہتمام میں کی۔ اس کتاب میں خلافتِ راشدہ کے عہد میں ہند وعرب تعلقات، علم وتمدن اور معاشرت وتجارت، ہندوستان میں صحابہ وتابعین کے ورود مسعود اور ان کی سرگرمیاں، ان کے حالات، تاریخ وجغرافیہ اور سیاست وامارت کے بارے میں تحقیقی بحثیں ملتی ہیں۔ اس کتاب میں بھی قاضی صاحب نے مختلف موضوعات کی پچاسوں کتابوں سے استفادہ کرکے اپنے محققانہ مزاج کے مطابق ہر مسئلہ روشن کرکے ایک واضح موقف پڑھنے والے کے سامنے رکھا ہے اور تعلقات کی نوعیت واضح کی ہے۔ یہ کتاب بھی علمی ودینی اور تاریخی وتحقیقی حلقوں میں پسند کی گئی۔ اس میں عرب میں ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی کا حصہ بہت جاندار اور تحقیقی ہے۔ اس کے تعلق سے مصنف کی بڑی تحسین ہوئی۔

(۲۱) خلافت عباسیہ اور ہندوستان: - اس کتاب کے ۵۵۸ صفحات ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔ دوبارہ تنظیم فکر ونظر سندھ پاکستان نے چھاپا۔ یہ کتاب بھی قاضی صاحب کے پسندیدہ موضوع عرب وہند تعلقات سے متعلق ہے اور اس میں تاریخ وجغرافیہ، طبقات وتراجم، رجال واحادیث، سیر ومغازی وغیرہ کتابوں سے مدد لی گئی ہے اور جو پہلو بھی زیر بحث آیا ہے، اس پر تحقیقی نقطۂ نظر سے بات کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

(۲۲) خلافتِ بنو امیہ اور ہندوستان: - اس کے ناشر بھی ندوۃ المصنفین دہلی کے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہی ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں چھپا جو ۶۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن تنظیم فکر ونظر سندھ پاکستان کے حصے میں آیا۔

(۲۳) تذکرۂ علمائے مبارک پور: - جون ۱۹۷۴ء میں دائرہ ملیہ مبارک پور سے قاضی حیات النبی (قاضی صاحب کے چھوٹے بھائی) کی کتابت سے منظر عام پر آئی۔ کتاب کے ۲۹۲ صفحات ہیں۔ اس میں قصبہ مبارک پور اور اس کے ملحقات ونواح کی ساڑھے چار سو سالہ اجمالی تاریخ

اور قصبہ و سوادِ قصبہ کے مشائخ و بزرگانِ دین، علماء و فقہاء، محدثین و مصنفین، مدرسین و صحافی، شعراء و ادباء اور دیگر اربابِ علم و فضل کے حالات و خدمات اور ان کے علمی و دینی مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تذکرہ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ مبارک پور پارچہ بافوں کی آبادی ہونے کی وجہ سے شرفائے انجاب کی نگاہِ قلم میں بہت کم مایہ تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی مبارک پور سے فاصلۂ یک گام پر دارالمصنفین اعظم گڑھ میں بیٹھے حیاتِ شبلی کی تبویب و تسوید میں مصروف ہیں۔ مگر انھوں نے حیاتِ شبلی کے مقدمہ میں مبارک پور کے بارے میں صرف دو سطری بیان وہ بھی محمد آباد کے حوالے سے دیا ہے۔ گویا مبارک پور، شہر اعظم گڑھ سے کوئی دور افتادہ گمنام بستی ہے۔ سید صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"محمد آباد کے قریب مبارک پور نام کا بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانے سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانے میں چند نامور علماء پیدا ہوئے ہیں۔"[1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا ہے۔ کیوں کہ یہ قصبہ اعظم گڑھ اور محمد آباد کے درمیان میں واقع ہے اور مبارک پور سے محمد آباد مزید دس کلومیٹر کے فاصلے پر پوربی سمت میں آباد ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات وہ خود بھی مدرسہ احیاء العلوم میں آیا کرتے تھے۔ مولانا مسعود علی ندوی کی وجہ سے دارالمصنفین ضلع کی سیاست کا مرکز بھی تھا اور مولانا شکر اللہ صاحب کی وجہ سے احیاء العلوم بھی تحریکِ آزادی میں سرگرم کردار ادا کر رہا تھا۔ اس اتحادِ کار کی وجہ سے بھی دونوں اداروں کے درمیان گہرا رابطہ تھا۔ "حیاتِ شبلی" سن ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ہی مئی ۱۹۱۸ء کے "معارف اعظم گڑھ" میں سید صاحب مولانا عبدالسلام مبارک پوری کی معروف کتاب "سیرت البخاری" پر اپنی بہترین رائے لکھ چکے تھے جو معیاری سوانح کا علمی نمونہ ہے۔ سید صاحب گہر افشاں ہیں:

"امام بخاری کو جو عالمِ اسلام میں اہمیت حاصل ہے، وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ ضرورت تھی کہ امام ممدوح کی سیرت، تصنیفات اور اجتہادات پر ہماری زبان میں کوئی مستقل کتاب لکھی جائے۔ ہم نہایت خوش ہیں کہ جناب مولانا عبدالسلام مبارک پوری نے اس فرض کو نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ سلاستِ بیان، طرزِ استدلال، استقصاءِ واقعات، تحقیقِ مسائل، تفصیلِ مطالب ہر چیز میں ان کے قلم نے اُردو کے حکیمانہ مذہبی لٹریچر کی بہترین تقلید کی ہے۔

---

[1] حیاتِ شبلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ (ص: ۵۷)

ہم اس کو اپنے معیار کے مطابق سمجھتے ہیں۔ سوانح نگار نے حصہ اول میں امام بخاری
صاحب کے حالات جمع کیے ہیں اور دوسرے حصہ میں ان کی تصانیف و اجتہادات پر
نقد وتقریظ لکھی ہے''۔

سید صاحب کے قلم سے صاحب سیرت البخاری کی اس تحسین کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے لاعلم نہیں تھے کہ مبارک پور کی علمی و دینی سرگرمیاں ان کی نگاہِ قلم سے اوجھل تھیں۔ ''حیات شبلی'' میں انھوں نے اعظم گڑھ کی جن نواحی بستیوں کے تاریخی وتمدنی جلوے دکھائے ہیں، اُن بستیوں کے مقابلے میں مبارک پور کی علمی و دینی خدمات کیف وکم کے اعتبار سے کسی طرح کم درجہ کی نہیں ہیں۔ اس موقع پر ذرا سی ترمیم کے ساتھ فیض احمد فیضؔ کا یہ شعر بار بار زبان پر آ رہا ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں　　سنو کہ ہم کو بہت ناگوار گزری ہے

مولانا قاضی اطہر نے جب سید صاحب کے اس اجمال پر نظر ڈالی تو انھیں اپنی خاک کے ذرّوں میں کئی آفتاب و ماہتاب اور بہت سے انجم وکواکب نظر آئے۔ مولانا نے ۱۹۴۸ء میں اس کتاب کی طرح ڈالی تھی، جب وہ اپنے قیامِ بہرائچ کے زمانہ میں ''الانصار'' کے مدیر تھے۔ انھوں نے اس کتاب کے لکھنے میں بڑی فراخ دلی اور کشادہ ذہنی کا ثبوت دیا ہے۔ اس لیے کہ مبارک پور ایک ایسی آبادی ہے، جہاں مسلکی فتنے اور مسلم بستیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہیں اور کوئی بھی تحریر اپنے ذہنی تحفظات اور مسلکی منشور کی غلامی سے آزاد نہیں رہتی۔ اس کتاب کے ابتدائیہ میں مولانا لکھتے ہیں:

''مخدوموں اور بزرگوں کا یہ حق میرے اُوپر ہے کہ میں ان کے علمی و دینی کارناموں اور ان کی اسلامی وملی خدمات کی امانت ناظرین تک پہنچاؤں۔ میں نے اس حق کی ادائیگی میں دیدہ و دانستہ خیانت اور تقصیر نہیں کی ہے۔ بلکہ ایک غیر جانبدار مورخ اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے یہ خدمت انجام دی ہے۔ مذہبی اختلاف اور ذات و برادری کی سطح سے بلند ہو کر یہ کام کیا ہے''۔[۱]

اس کتاب میں مولانا نے بے پناہ محنت اور حقائق کی تحقیق وتلاش میں بے حد مشقتیں برداشت کی ہیں۔ وہ کام کی باتیں معلوم کرنے کے لیے دور ونزدیک کے پیادہ پا سفر کیے۔ اہلِ علم سے رابطہ رکھا، متعلقین کے اہلِ خانہ اور واقف کاروں سے زبانی باتیں کیں، ملاقاتوں اور تحریروں کی مدد سے ماضی کی

[۱] تذکرۂ علمائے مبارک پور۔ جون ۱۹۷۴ء دائرۂ ملیہ مبارک پور (ص:۱۱)

دھند میں لپٹی ہوئی شخصیتوں کے کارناموں پر سے امتدادِ زمانہ کی گرد صاف کی اور ایک ایسا آئینہ سجایا، جس میں قصبہ مبارک پور کی علمی و دینی جلوہ سامانیاں نظر آنے لگیں۔ مولانا نے وقتاً فوقتاً جیسا کہ ان کی عادت تھی، تذکرہ علمائے مبارک پور کے مشمولات میں اضافے بھی کیے ہیں جو ابھی غیر مطبوع ہیں۔ اگر یہ سب دوبارہ شامل کر کے شائع ہو جائیں تو اس کی دستاویزی حیثیت مزید وقیع ہو جائے گی۔ دوسرا ایڈیشن جلد ہی چھپنے والا ہے۔

(۲۴) مآثر و معارف:- قاضی صاحب کے ۲۵ مقالات کا مجموعہ ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے مارچ ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ ضخامت ۱۷۲ صفحے کی ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے اپنے خاندان، ننہال اور اپنے دیار کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں کچھ اور اہم موضوعات اور اسلامی علوم و فنون سے متعلق مقالات بھی شامل ہیں۔ تدوینِ حدیث اس کا ایک خاص مضمون ہے۔

(۲۵) دیارِ پورب میں علم اور علماء:- یہ کتاب ۴۸۲ صفحات پر مبنی ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۷۹ء میں ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے ہوئی۔ اس کتاب میں اتر پردیش کے مشرقی اضلاع مثلاً الہ آباد، جون پور، بنارس، غازی پور، اعظم گڑھ اور ان کے اطراف و جوانب کے علماء و فضلاء کی علمی و دینی سرگرمیوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قاضی صاحب نے چار علمی ادوار قائم کر کے دیارِ پورب کی سات سو سالہ علمی و دینی تہذیبی و فکری خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری، میر علی عاشقان سرائے میری، ملا محمود جون پوری، مولانا حافظ امان اللہ بنارسی، مولانا شیخ غلام نقشبند گھوسوی، مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیرذی، مولوی حسن علی ماہلی کا تذکرہ شامل ہے۔ مشہور علمی و دینی خانوادوں کی بحث میں قلمی و مطبوعہ کتابوں کی مدد سے ان کے اساتذہ و تلامذہ اور معاصرین و متعلقین کے بارے میں بھی بہت سے مخفی پہلو اجاگر کیے گئے ہیں۔ جس سے اس دیار کے علمی ادوار کی سرگرمیاں اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔

(۲۶) آثار و اخبار (جلد اول):- قاضی صاحب کے چار علمی، دینی، تاریخی مقالات کا دوسرا مجموعہ ہے۔ نومبر ۱۹۸۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا۔ یہ دو جلدوں میں چھپنے والا تھا، ابھی دوسری جلد منتظرِ اشاعت ہے۔ جلد اوّل کے ابتدائی چار مقالات کا تعلق قدیم اسلامی ہند کے علمی و دینی خانوادہ سے ہے۔ جن میں صدیوں علم و دین کی سیادت و امامت باقی رہی۔ پہلا آلِ عبدالرحمٰن بیلمانی، دوسرا آلِ ابومعشر سندی مدنی، تیسرا آلِ مقسم قیقانی بصری اور چوتھا امام ابوالحسن مدائنی کے سوانح پر ہے۔ جو اسلامی ہند کے پہلے مورخ اور یہاں کے احوال کے مشہور عالم ہیں۔

یہ مقالات جگر کاوی اور علمی تحقیق کے حامل ہیں اور قدیم ماخذ کے حوالے سے جدید وقیع اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲۷) حج کے بعد:- قاضی صاحب کا یہ ۴۰ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس کو ۱۹۵۷ء میں انجمن ''خدام النبی'' بمبئی نے شائع کیا تھا۔ یہ اُن تقریروں کا مجموعہ ہے جو حاجیوں کے درمیان بحری جہاز میں حج کے بعد کی حاجیوں کی ذمہ داری کے تعلق سے کی گئی تھیں۔ اس میں مولانا کی علم وتقویٰ اور دینداری کی منہ بولتی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ گو کہ انھوں نے حاجیوں کے تعلق سے اس میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ مگر درحقیقت اس مجموعہ کا بین السطور مولانا کی مذہبی ودینی حساسیت کا ترجمان بن گیا ہے۔ اب تک چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

(۲۸) العقد الثمین:- اس کا پورا نام ''العقد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فیها من الصحابة والتابعين'' ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۶۸ء میں اناہ مولوی محمد بن غلام رسول سورتی بمبئی نے ۳۳۵ صفحات میں شائع کی۔ دوسری بار یہی کتاب ''دارالانصار'' قاہرہ مصر سے ۲۳۱ صفحات میں شائع ہوئی۔ مولانا عرب و ہند تعلقات پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے اور ان تعاقات کی علمی ودینی، ادبی ولسانی، تہذیبی وسماجی اور دیگر جہتوں کی جزئیات تک کی معنویت سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے مطالعہ کی کثیر الجہتی کے سہارے اس کتاب کو صرف ایک برس کی قلیل مدت میں عربی میں پیش کرنے پر قادر ہوگئے۔ اس کتاب میں اسلامی ہند کی فتوحات اور ہندوستان میں تشریف لانے والے صحابہ وتابعین کے احوال وکوائف بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا نے اس کتاب میں جن علاقوں اور خطوں کی علمی ودینی سرگرمیوں کا احاطہ کیا ہے، اس میں ہندوستان کا وہ سندھی حصہ شامل ہے، جس کے کچھ مقامات تھانہ اور بھڑوچ ہندوستان میں اور کچھ علاقے اس وقت پاکستان اور افغانستان میں واقع ہیں اور کچھ رُوس کی عملداری میں آگئے ہیں۔ خلافتِ اسلامیہ کے عہد میں یہ سب ممالک حاکم خراسان کے زیر نگیں دیے گئے تھے۔ ان میں کرمان کا علاقہ رُوس میں ہے اور القفص یعنی بلوچستان کا آدھا حصہ اس وقت افغانستان میں پڑتا ہے۔ قاضی صاحب نے جس دور کو اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ اس زمانے کا ہندوستان متحدہ ہندوستان یا یوں کہیے کہ غیر منقسم ہندوستان سے بھی پچھمی سمت میں بڑھا ہوا تھا۔ اس کتاب میں مولانا نے تاریخ وسیر، مغازی واحادیث اور رجال وتراجم کے عربی ذخیروں سے ریزہ ریزہ چن کر معلومات کا انبار لگا دیا ہے۔ جس سے مولانا کی مورخانہ شان اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ روشن ہوگئی ہے۔ یہ کتاب عرب و ہند کے علمی ودینی اور تمدنی وتاریخی تعلقات، ہندوستان کی فتح اور صحابہ وتابعین کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں ایک

اہم اور نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب سے تاریخ اسلام کا ایک بہت بڑا خلا پُر ہوا ہے۔ اس میں ایک ایسی نادر معلومات درج ہیں، جو بڑی بڑی کتابوں میں بھی کم یاب ہیں۔ اس ملک کی تہذیب وثقافت اور مذہب وسیاست میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور مسلمانوں کی آمد نے کس کس طرح اپنے جلوے دکھائے ہیں، اس کا تفصیلی ذکر اس میں موجود ہے۔

(۲۹) تبلیغی وتعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں:- یہ ۲۵ صفحے کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ پہلی بار دائرۃ المصنفین مبارک پور نے ۱۹۶۹ء/ ۱۳۸۹ھ میں، دوسری بار ۱۹۸۵ء میں مکتبہ الحق بمبئی نے تیسری بار شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ اس مختصر رسالہ میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں نے ابتداء ہی سے مسجدوں، بازاروں، شہرودیار اور مجالس ومحافل کے حوالے سے دعوتی، تبلیغی اور تعلیمی خدمات انجام دی ہیں اور ان کے درس وتدریس کے لیے افادہ واستفادہ کی راہیں بہت وسعت پزیر تھیں۔ یہ جہاں خیمہ زن ہوئے اور جس جگہ بیٹھے، وہیں علوم ومعارف کے قافلوں کو سمیٹ لائے۔ وہ ماحول جو صرف مادی کاروبار سے نمو پزیر تھے، مسلمانوں کی جدوجہد سے تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ یہ تحریریں مولانا کے رسالہ ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی میں شائع ہو چکی تھیں۔ بعد میں اس کے کئی ایک ایڈیشن اشاعت پزیر ہوئے۔ اس رسالے کی تبویب وتسوید میں حدیث وسیر، طبقات ورجال اور تاریخ وتراجم کی کتابوں سے ابتدائی چند صدیوں کے اہلِ اسلام کے علمی وتعلیمی انہماک پر خاص توجہ مبذول کر کے واقعات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد کا ایڈیشن ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو فرید بک ڈپوئی دہلی نے جون ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔

(۳۰) طبقات الحجاج:- ۱۹۵ صفحات کی کتاب ہے۔ جس کو انجمن ''خدام النبی'' بمبئی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی میں شعبان ۱۳۷۵ھ کے شمارے سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ جس میں محدثین وعلماء کے حج کے تعلق سے عبرت آموز اور سبق آموز واقعات کو اپنا موضوعِ تحقیق بنایا اور ایسی ایسی نادر معلومات درج کیں، جس سے جذبۂ دینی کو تحریک وتحریص نصیب ہوتی ہے۔ اس سلسلۂ مضامین کے آغاز کا شوق حافظ ابن حجر کی کتاب ''الدرر الكامنة فى اعيان المائة الثامنه'' کے مطالعہ کے بعد مولانا کے دماغ میں پیدا ہوا۔

(۳۱) اسلامی شادی:- یہ بھی مولانا کا ایک مختصر رسالہ ہے، جس کی ضخامت ۷۵ صفحات کو محیط ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن بھی نکل چکے ہیں۔ آخری طباعت ۲۰۰۵ء میں فرید بک ڈپوئی دہلی کے

اہتمام سے ہوئی ہے۔ یہ رسالہ عام مسلمانوں کو اسلامی نظامِ معاشرت سے آگاہ کرتا ہے۔

(۳۲) علمائے اسلام کے القاب وخطابات تاریخ کی روشنی میں:- یہ مضمون سب سے پہلے ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی کے شعبان ۴ے۱۳ھ/ اپریل ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں ۲۲ صفحات پر مشتمل مطبوع ہوا۔ بعد میں اس کو رسالہ کی صورت میں عام لوگوں کے استفادہ کے لیے زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا۔ اس میں اہلِ علم وفضل کے لیے استعمال کیے جانے والے القاب وخطابات جیسے عالم، مقری، قاری، علامہ، منشی، معلم، مکتب، مودب، استاذ، ملا، مولوی، مولانا اور اس طرح کے پچاسوں مرکب اور مفرد القاب وخطابات پر لغوی، لسانی اور تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور حدیث وسیر، تاریخ وتذکرہ کی مدد سے دلچسپ انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہ رسالہ بھی بہت مفید اور معلومات افزا ہے۔ اس کا نیا ایڈیشن حال ہی میں اگست ۲۰۰۴ء فرید بک ڈپو نئی دہلی نے شائع کیا ہے، جس کے ۴۸ صفحے ہیں۔

(۳۳) بناتِ اسلام کی علمی ودینی خدمات:- ۹۶ صفحے کے بڑے سائز کا رسالہ ہے، جس کو بمبئی کے مشہور مکتبہ شرف الدین الکتبی واولادہٗ نے شائع کیا۔ بعد میں دائرہ ملیہ مبارک پور کی طرف سے بھی اشاعت پزیر ہوا۔ اس میں خواتینِ اسلام کی خدماتِ دینی کا بیان ہے۔ اس کا آخری ایڈیشن عنقریب اسلامک بک فاؤنڈیشن دِلّی سے شائع ہونے والا ہے۔

(۳۴) خواتینِ اسلام کی علمی ودینی خدمات:- ۱۸۰ صفحے پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بناتِ اسلام کی علمی ودینی خدمات کا اضافہ وترمیم شدہ ایڈیشن ہے۔ اس کتاب میں حدیث وسیر تراجم وتاریخ، طبقات ورِجال کے پھیلے ہوئے ذخیرے سے قرنِ اول ہی میں خواتینِ اسلام کی علمی ودینی اور تعلیمی وتہذیبی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جہاں مسلمان مَردوں نے حدیث وفقہ اور علوم ومعارفِ اسلامیہ کی خدمات انجام دی ہیں، وہیں گھروں کی پردہ نشین خواتینِ اسلام نے بھی حدیث وفقہ کی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھانے میں اپنی خدمات پیش کی ہیں اور تاریخِ اسلام میں محدثات، فقیہات، مفتیات، عابدات، زاہدات، صوفیات، مقریات، قرأیات کا سلسلۃ الذہب بھی ملتا ہے۔ قرنِ اوّل میں احادیث وروایات کے ذخیرے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ مسلمان عورتوں میں صحابیات اور تابعیات کے درجے کی صالحات میں علمِ دین حاصل کرنے اور پھیلانے کا بڑا ذوق موجود تھا۔ ان سے مَردوں نے بھی استفادہ واستفاضہ کیا ہے۔ جس طرح مسلمانوں کے مدرسے اور خانقاہیں، مسجد ومحراب دین ودانش کے چراغ سے روشن تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کے گھر آنگن میں بھی

اسلامی تعلیم وتعلم کے اجالے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کتاب کی ناشر شیخ الہند اکیڈمی دیوبند ہے۔ یہ آخری کتاب ہے، جو مولانا کی کتاب زندگی کا باب بند ہونے سے چند روز پہلے جون ۱۹۹۶ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کا نیا ایڈیشن عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

(۳۵) اسلام میں قربانی کی حقیقت اور صفاتِ مومن:- اس کتاب کا نام ہی اپنا موضوع بتا رہا ہے۔ مولانا کے ہمہ جہتی مطالعہ کی غماز یہ کتاب ہے اور اس حقیقت کی شاہد بھی کہ مولانا بہت وسیع النظر اور وسیع الموضوعات قلم کے مالک تھے۔ انھوں نے دین ودانش کے تقریباً ہر موضوع کو سر سبز کیا اور اس میں اپنی تاریخی بصیرت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ یہ ابھی غیر مطبوعہ شکل میں ہے۔

(۳۶) دعاءِ ماثورہ:- اس مختصر رسالہ میں دعاءِ ماثورہ کا بیان ہے اور ماثورہ ادعیہ درج ہیں۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔

(۳۷) قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے:- یہ ۲۰۰۵ء میں قاضی اطہر اکیڈمی لکھنؤ سے اشاعت پزیر ہوئی۔ اس میں وہ سفرنامے ہیں جو وقتاً فوقتاً ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی میں اشاعت کے مرحلوں سے گزرتے رہے۔ اس کتاب میں مولانا کی جزئیات نگاری، تعلیم وتعلم سے ازلی دلچسپی اور اُن کی وسعتِ نظری کا جا بجا اظہار ملتا ہے۔ اس کتاب کے بعض مقامات تاریخی وجغرافیائی اور تہذیبی وسماجی اعتبار سے بہت معلومات افزا اور بصیرت افروز ہیں۔ یہ اپنے دور کا طربیہ بھی ہیں اور اپنے زمانے کا مرثیہ بھی۔

(۳۸) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک:- یہ مولانا کی طالب علمی کے واقعات وحالات پر مشتمل ایک ۴۸ صفحے کا رسالہ ہے۔ جو ۱۹۸۷ء میں پہلی بار دائرہ ملیہ مبارک پور سے مطبوع ہوا۔ بعد میں اس کے دوسرے مقامات سے بھی نئے ایڈیشن منظرِ عام پر آئے۔ مولانا نے اس رسالے میں اپنے حالاتِ زندگی خودنوشت کے طرز میں لکھے ہیں۔ اس کتاب سے طالب علموں کے اندر حصولِ علم کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ کتاب کے بعض مندرجات اپنے دور ودیار کا مرقع بھی بن گئے ہیں اور بعض تحریکوں، اداروں، سرگرمیوں، اشخاص اور اہلِ علم کا البم بھی ہو گئے ہیں۔ ان سے بعض بڑی نادر معلومات حاصل ہوتی ہیں، جن سے مولانا کی ذہنی ساخت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ مولانا نے مکتبہ صوت القرآن دیوبند کے ۱۴۱۲ھ کے ایڈیشن میں ''فراغت کے بعد کا علمی سلسلۂ حیات'' کے عنوان سے تکملۂ کتاب کے طور پر اضافہ فرمایا ہے، جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کی غرض وغایت کے سلسلے میں مولانا رقم طراز ہیں:

''خود اعتمادی اور خود سازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق اور ہمت افزائی کے لیے لکھی گئی ہے، جو بہترین ذہن ودماغ لے کر دار العلوموں اور جامعات کی لق ودق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تا کہ وہاں بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لائق وفائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں۔ مگر عام طور سے ان کو اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے ساتھ اپنی بدنامی اور نالائقی کی سند ملتی ہے۔...... ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے مدرسوں کے طلبہ سے سبق لے کر اپنے بلند مقاصد میں کامیابی کی جدوجہد کرنی چاہیے''۔

(۳۹) تدوین سیر ومغازی:- یہ کتاب ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اپنے موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو علم وتحقیق کا شاہکار ہے۔ اس کی اشاعت شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کی طرف سے ۱۹۹۰ء میں عمل میں آئی۔ اس کتاب کو قاضی صاحب کی آٹھ سالہ تحقیق وتسوید کے نتیجے میں پیراہن وجود ملا۔ اس کی تیاری میں قاضی صاحب نے بنیادی مراجع وماخذ سے مدد لی۔ انھوں نے ثانوی یا کم درجے کے مراجع ومصادر پر قناعت نہیں کی۔ مولانا نے اس کی تصنیف وتالیف میں اپنے پیشروؤں کی معلومات پر مفید اضافے کیے ہیں۔ اس کتاب کے پانچ ابواب ہیں اور ہر باب کا حق انھوں نے اپنی محنتِ شاقہ سے ادا کیا۔ جس نے اس کو خاصے کی چیز بنا دیا۔ ۲۰۰۴ء میں فرید بک ڈپوئی دہلی کے اشاعتی سلسلے میں شامل ہو کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک ایڈیشن فضلی بک کراچی پاکستان سے ۳۴۴ صفحات میں شائع ہوا۔

(۴۰) خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم وتربیت:- ۳۹۲ صفحات کی یہ کتاب شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کی اشاعتی سرگرمیوں کی ایک اہم کڑی ہے۔ جس کی اشاعت ۱۹۹۵ء میں ہوئی۔ قاضی صاحب نے ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی میں پہلے پہل اس موضوع پر اسلامی تعلیم کا مرکز دارِ ارقم اور مدارسِ اسلامیہ کے ارتقائی ادوار کے عنوان سے دو مضمون لکھے۔ اس کے بعد ایک مختصر رسالہ ''تبلیغی وتعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں'' لکھا۔ آخر عمر میں چل کر اس موضوع کو مزید وسعت دینے کی غرض سے یہ کتاب مرتب کی اور اس میں اپنے تاریخی وعلمی شعور کا ثبوت فراہم کیا۔ مولانا اگر عربی زبان کے رمز شناس اور تاریخ وسیر اور احادیث وآثار کے ماہر نہ ہوتے تو یہ کتاب اتنے سلیقے سے مرتب نہ ہوتی۔ اس کے مندرجات بہت معلومات افزا ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں فرید بک ڈپوئی دہلی نے اس کا جدید ایڈیشن چھاپا ہے۔

(۴۱) مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم اور علماء:- ۲۲۸ صفحات کی یہ کتاب

مولانا کی وفات کے بعد شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے اشاعتی سلسلے میں شامل ہوکر مئی ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ مضمون ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی کے تعلیمی نمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ قاضی صاحب نے اس کو بہت محنت سے تیار کیا تھا۔ علمی وتحقیقی حلقوں میں اس کی پزیرائی بھی ہوئی تھی۔ قاضی صاحب نے آخری عمر میں اس کو مزید وسعت دینے کے لیے قلم سنبھالا اور اس کو نہایت اچھے انداز میں مرتب کیا۔ اس میں مختلف ذیلی عنوان جیسے چرواہوں میں علم، کسانوں میں علم، کارخانہ داروں میں علم، باربردار مزدوروں میں علم، جوتا بنانے والوں میں علم اور اسی طرح مختلف پیشہ وطبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے اندر علم اور علماء کے پائے جانے کا ذکر کتب تاریخ کے حوالوں سے آیا ہے۔ اس کتاب سے مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی پسماندگی، کم ذوقی اور علمی تہی دامنی کو دور کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ احساس بھی اُبھرتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ عروج اور قرنِ اوّل میں تعلیم وتعلم، علم ودانش کے کتنے مینار بنائے تھے، جن میں نہ ذات پات کی کوئی تفریق تھی، نہ پیشہ وطبقہ کا کوئی امتیاز ملتا تھا، نہ کسی صنف وجنس کا کوئی مسئلہ درپیش تھا۔ مسلمانوں کی بزم سے رزم، خلوت سے جلوت، کوچہ سے بازار، گھر سے مسجد جہاں دیکھیے علم واصلاح کی محفلیں آباد ہیں۔ مردوں کے شانہ بہ شانہ عورتیں بھی تعلیم وتعلم کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ غرض کہ مسلمانوں کا ہر طبقہ ہر زمرہ، ہر خاندان اور ہر گھر ذہن سازی وشخصیت زائی کی تحریک میں اپنی خدماتِ علمی پیش کررہا ہے۔ اس کی مثال دوسری زندہ سے زندہ قوموں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

(۴۲) کاروانِ حیات:- مولانا قاضی اطہر نے اپنی طالب علمی کے حالاتِ زندگی ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' ۱۹۸۷ء میں مرتب کرکے دائرہ ملیہ مبارک پور سے پہلی بار شائع کرائے تو علمی حلقوں میں اس کو سراہا گیا اور بار بار اہلِ علم مولانا سے اس میں اضافہ کرکے فراغت کے بعد کے حالات وواقعاتِ زندگی لکھنے کی فرمائش وگزارش کرتے تھے۔ خود ان کے لڑکے قاضی ظفر مسعود بھی جو اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، اپنی خواہش کا اظہار فرماتے رہتے تھے۔ بعد میں مولانا نے اس پر توجہ کی اور ''کاروانِ حیات'' کے نام سے اپنی سوانح کا دوسرا حصہ جو تعلیمی فراغت کے بعد کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے لکھ رہے تھے۔ ابھی یہ کتاب قیامِ بمبئی کے احوال تک قلم بند ہوئی تھی اور خاتمۃ الباب تک بھی نہیں آئی تھی کہ مولانا کی کتابِ زندگی بند ہوگئی اور اس طرح یہ کتاب سوانح ناتمام رہ گئی۔ پھر بھی مولانا نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ بڑے کام کی چیز بن گئی ہے اور اس کو بہترین حوالے کی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ یہ نامطبوع تھی، پہلی بار ماہ نامہ ''ضیاء الاسلام'' شیخو پور ضلع اعظم گڑھ کے

''قاضی اطہر مبارک پوری نمبر ۲۰۰۳ء'' میں ص: ۴۱ سے ص: ۱۳۶ تک شاملِ اشاعت ہوئی۔ پھر فرید بک ڈپو نئی دہلی نے '' قاعدہ بغدادی '' اور '' کاروانِ حیات '' کو یکجا شائع کیا ہے جس کا سالِ اشاعت نومبر ۲۰۰۳ء ہے۔

(۴۳) مقالاتِ قاضی اطہر:- یہ مولانا کے مضامین و مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔

(۴۴) مسئلۂ خلق قرآن کی سیاسی حیثیت:- اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

(۴۵) محمد کے زمانہ کا ہندوستان مع ہندوستان صحابہ کے زمانہ میں:- یہ کتاب پاکستان سے شائع ہوئی ہے، جو درحقیقت '' عرب و ہند عہدِ رسالت میں'' اور '' خلافت راشدہ اور ہندوستان'' کی تلخیص ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ ارسلان بنوری ٹاؤن کراچی نے شائع کیا ہے اور عنقریب فرید بک ڈپو دلی سے شائع ہونے والی ہے۔ حالاں کہ اس نام میں وہ ادبیت و جاذبیت نہیں ہے جو 'عرب و ہند عہد رسالت میں'' ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں یہ وبا عام ہے کہ قانونی تحفظ اور حقوق طباعت سے بچنے کے لیے مقبول عام کتابوں کے نام بدل کر ناشرین کتب اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۴۶) مطالعات و تعلیقات:- قاضی صاحب کے ماہ نامہ '' البلاغ '' بمبئی کا پہلا شمارہ شوال ۱۳۷۳ھ/ جون ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس وقت اس کے مدیر مسئول محی الدین مُنیری تھے اور مولانا ان کے حلقۂ ادارت میں شامل تھے۔ مگر جلد ۲ شمارہ ۹ بابت جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ سے ان کا نام مدیر تحریر کی حیثیت سے آیا۔ شوال ۱۳۷۷ھ/ مئی ۱۹۵۸ء سے '' البلاغ '' میں مطالعات و تعلیقات کے زیر عنوان مولانا کے علمی و تحقیقی مضامین شائع ہونا شروع ہوئے۔ یہ مضامین نسبتاً تفصیلی، مدلل اور حوالہ جات سے مزین ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے اہلِ علم کی مجلسوں میں ان کو وقعت بھی حاصل ہوتی تھی۔ اس کے مرتب مولانا محمد یوسف صاحب ہیں جو ضلع سورت گجرات کے رہنے والے ہیں۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں شائع ہوگی۔ کتابت کا عمل جاری ہے۔

(۴۷) نسخۂ شفا:- مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے '' الجواب الکافی '' عربی کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ جو ابھی غیر مطبوعہ شکل میں ہے۔

(۴۸) داغِ فراق:- مولانا رسالہ 'البلاغ'' بمبئی میں اپنے معاصرین علماء و فضلا، اہلِ علم

اور دوسرے اہلِ تعلق کی وفات پر تعزیتی خیالات وتاثرات کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ مولانا کی انھیں تحریروں کو یکجا کر کے مولانا محمد صادق مبارک پوری نے مرتب کیا ہے۔ جو قاضی اطہر اکیڈمی لکھنو سے ۲۰۰۶ء میں جلد ہی منظرِ عام پر آجائے گی۔ جس سے مولانا کی خاکہ نگاری، شخصیتوں کی علمی وفکری مرقع کشی اور جزئیات نگاری کی صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا میں انسانی درد وغم کو محسوس کرنے کی بڑی صلاحیت تھی اور وہ اپنے معاصرین کا بھی کھلے دل سے اعترافِ علمی اور اظہار مقام ومرتبہ فرماتے تھے۔

(۴۹) ہندوسندھ کی قدیم شخصیات:- چار سو صفحے کی کتاب ہے جو ''رجال السند والہند'' (عربی) کا اُردو ترجمہ ہے۔ جس کے مترجم مولانا عبدالرشید قاسمی بستوی ناظم تعلیمات معہد الانور دیوبند ہیں۔ عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے۔

(۵۰) جواہر الاصول (عربی):- کتاب کا پورا نام ''جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول'' ہے جو ابوالفیض محمد بن محمد بن علی حنفی فاسی کی غیر مطبوعہ کتاب تھی۔ قاضی صاحب نے اس کے مخطوطہ کی تصحیح وتحقیق کر کے بڑا تحقیقی اور بصیرت افروز مقدمہ لکھا۔ اس کو پہلی بار شرف الدین الکتبی واولادہٗ بمبئی نے ۱۹۷۳ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ دوسرا ایڈیشن ''الدار السلفیہ'' بمبئی نے شائع کیا۔ جب یہ حجاز کی علمی وتحقیقی مجلسوں میں پڑھی گئی تو اس کا خوبصورت ایڈیشن مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے اہتمام سے شائع کر کے حجاز مقدس میں عام کیا۔ یہ کتاب صرف ۱۳ دن میں مقابلہ وتصحیح اور حاشیہ وتعلیق کے مرحلوں سے گزری۔ یہ کتاب دو قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب ہوئی ہے۔

(۵۱) تاریخ اسماء الثقات (عربی):- ابن شاہین بغدادی کی یہ کتاب بھی محرومِ اشاعت تھی۔ اس کا قلمی نسخہ جو ۱۱۳۷ھ کا لکھا ہوا تھا، جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ قاضی صاحب نے اس کی نقل تیار کر لی تھی۔ ۱۹۸۶ء/۱۴۰۶ھ میں شرف الدین الکتبی واولادہٗ بمبئی نے اس کو شائع کیا۔ اس کے ۲۳۵ صفحات ہیں۔ ابتداء میں قاضی صاحب نے پرمغز مقدمہ لکھا ہے۔ یہ نسخہ علمی طریقے پر مرتب کیا گیا ہے۔ رجال ومتن کی تصحیح کر کے اس پر ضروری حاشیہ لکھا گیا ہے۔ فنِ رجال کے ماہرین کی کتابوں سے اس پر تحقیق وتنقید کر کے قاضی صاحب نے متنی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔

(۵۲) الہند فی عہد العباسین (عربی):- ''خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان'' کا عربی ترجمہ ہے، مترجم عبدالعزیز عزت مصری عالم ہیں۔ صرف ۸۷ صفحات میں ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۷۹ء میں ''دارالانصار'' قاہرہ (مصر) کے زیرِ اہتمام عمل میں آئی۔

(۵۳) الحکومات العربیہ فی الہند والسند (عربی):- یہ ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا عربی ترجمہ ہے۔ جو ایک بڑے عالم ومحقق عبدالعزیز عزت کا کیا ہوا ہے۔ جو پہلی بار اسلام آباد یونی ورسٹی پاکستان کے مجلّہ ''الدراسات العلمیہ'' نے بالاقساط شائع کیا۔ بعد میں اس کو کتابی شکل میں مکتبہ آل یداللہ بکریہ ریاض (سعودی عرب) نے اہتمام سے شائع کر کے عربی داں محققین کے استفادہ کی راہیں ہموار کیں۔اس کا مقدمہ ڈاکٹر شیخ عبدالمنعم فاضل جامعہ ازہر مصر متوفی ۱۴۱۱ھ نے لکھا تھا۔

(۵۴) الخطبات والرسائل العربیہ (عربی):- یہ غیر مطبوعہ ہے۔

(۵۵) سوانح امام جوزی:- اُردو میں ہے اور ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

(۵۶) احوال ومعارف:۔ مورخ اسلام مولانا مبارک پوری اُردو روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی میں تفسیری نوٹ کے ساتھ احوال ومعارف کے عنوان سے چالیس سال تک لکھتے رہے ہیں۔اس کالم میں دورِ حاضر کے مسائل ومباحث اور افکار ونظریات پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔اہلِ علم حضرات کی طرف سے باربار مطالبہ ہوتا رہا کہ ''احوال ومعارف'' کے انتخاب کو کتابی شکل میں سامنے لایا جائے۔ انشاءاللہ جلد ہی اس کام کی سلسلہ جنبانی ہونے والی ہے۔

تصانیف کو قبولِ عام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے جو علمی وتاریخی اور تہذیبی وفکری کتابیں اہلِ علم وتحقیق کی محفلوں میں پیش کیں، وہ اپنے مشمولات کی وجہ سے کافی مقبول ہوئیں۔اسی کے ساتھ انھیں عام طبقے میں بھی استحسان بھری نظروں سے دیکھا گیا۔ان کی جن کتابوں کا تعلق وسیع موضوعات سے ہے،اہلِ علم کی مجلسوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔مگر جو کتابیں محدود اور مقامی موضوعات پر تھیں جیسے ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' یا ''دیارِ پورب میں علم اور علماء'' وغیرہ وہ بھی عام حلقوں میں پسند کی گئیں۔ عام لوگ بھی ان کو اپنی لائبریریوں اور مطالعہ کے کمروں میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔اس کا اندازہ مولانا قاضی سلمان مبشر صاحب مبارک پوری کے نام لندن سے آئے ہوئے اس فون سے ہوا،جس میں لندن میں رہنے والے کسی صاحب نے فون پر بتایا کہ میری ذاتی لائبریری میں مولانا قاضی اطہر صاحب کی کچھ کتابیں پہلے سے موجود ہیں۔اب میری خواہش ہے کہ فلاں فلاں کتابیں مجھے قیمتاً حاصل ہو جائیں۔انھوں نے کتابوں کی جو فہرست بتائی اس میں ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' کا بھی نام تھا۔مولانا سلمان نے ان سے پوچھا کہ ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' کا تعلق تو مقامی موضوع سے ہے،اس کتاب سے آپ کا کیا لینا دینا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ میں چاہتا ہوں کہ مولانا کی تمام کتابیں میرے پاس رہیں۔میں

پاکستانی پنجاب کا رہنے والا ہوں اور یہاں لندن میں غیر علمی ملازمت میں ہوں۔ میری نجی لائبریری ہے، اس میں مولانا کی کتابیں بھی ہیں، ان سے میری آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

جسٹس تقی عثمانی نیوزی لینڈ میں جب قاضی صاحب کے عزیز مولانا عامر کے مہمان ہوئے تو قاضی صاحب کی کتابوں کو دیکھ کر ان کی دستیابی کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ یہ میرے کتب خانے کا قیمتی سرمایہ ہوں گی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جن کتابوں کو مولانا کے مصنف ہونے کا شرف حاصل ہے اسی نسبت کی وجہ سے لوگ ان کو حاصل کر کے اپنے مطالعہ کی میز پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ کتابوں کا موضوع محدود اور مقامی ہے یا اس کا موضوعاتی دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ ان کی دلچسپی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کے مصنف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ہیں۔

اسی طرح ندوۃ العلماء کے ایک معلم مولانا ابوسحبان روح القدس ہیں۔ جن کی تعلیم مدینہ یونی ورسٹی کی ہے اور وہیں سے انھیں سندِ فراغ حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ''تدوین حدیث'' سے اپنے درس میں بڑی مدد لی ہے۔ بچوں کو احادیث کے سلسلے میں مستقل اسی کتاب سے رہنمائی دیتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ مولانا کے مجموعۂ مضامین ''مآثر و معارف'' میں شامل مضمون میری تدریسی تقریر کے لیے بڑا معاون ثابت ہوتا ہے اور اس سے کم عمر بچوں کو سمجھانے میں کافی مدد ملتی ہے۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی کے والدِ گرامی اس خطہ کے اُردو نعت گو شاعروں میں اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا تخلص کوثر ہے، وہ عربی زبان نہیں جانتے۔ مگر قاضی صاحب کی عربی کتاب کو اس نسبت سے خرید لائے کہ اس کے مصنف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ہیں۔

نقوش و تاثرات کے عنوان سے مولانا اعجاز احمد اعظمی لکھتے ہیں کہ:

> ''اسی دوران قاضی صاحب کی عربی تصنیف ''رجال السند والہند'' چھپ کر آئی۔ والد صاحب حالاں کہ عربی تعلیم پائے ہوئے نہیں تھے لیکن غالباً قاضی جی کے نام کی وجہ نے اس کتاب کو گھر لائے۔..... میں اس وقت مکتب میں پڑھتا تھا۔ عربی کیا سمجھتا مگر دیر دیر تک اس کتاب کو ہاتھ میں لیے اُلٹتا پلٹتا رہتا۔..... عربی کی اس کتاب نے قاضی جی کی عظمت میرے دل میں کئی گنا بڑھادی۔ یہ کتاب اتنی مدت تک عقیدت کے ساتھ میرے ہاتھ میں رہی کہ اب تک اس کا سراپا میری آنکھوں میں بسا ہوا ہے۔''[1]

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۲۲۸)

یہ ہے شان قاضی صاحب کے علمی و تحقیقی مقام و مرتبہ کی۔ کتاب کی پیشانی پر مصنف کی حیثیت سے ان کا نام آجانا کتاب کے لیے طغرائے امتیاز بن جاتا تھا اور خواص سے لے کر عوام تک اس کتاب کی اہمیت یکساں طور پر محسوس کی جاتی تھی۔ خواص میں مصنف کے اعتبار و وقار کے منجملہ کتاب میں نئی بصیرتوں اور علمی نکات کے ملنے کی بھی توقع رہتی اور عوام میں قاضی صاحب کی علمی حیثیت پر نظر رہتی تھی اور بس۔

قاضی صاحب کی تصانیف کو مسلمانوں کے ہر طبقے میں جو حسن قبول حاصل ہوا وہ کسی بھی مصنف کے لیے قابلِ صد افتخار ہو سکتا ہے۔ اس میں قاضی صاحب کی علمی و فنی تحقیق کے علاوہ ان کے اخلاصِ دینی اور جذبۂ اسلامی کی برکتیں بھی شاملِ حال رہی ہیں۔ جو انہیں ربِّ کریم کی بارگاہ سے حاصل ہوئی تھیں۔ انھوں نے مقاماتِ مقدسہ خصوصاً آبِ زمزم پیتے وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ انھیں علومِ دینیہ کے کسی اہم موضوع میں ادراک و بصیرت کی دولت اور دانشوری کی سعادت نصیب ہو۔ اللہ رب العزت نے اس دعائے دلِ دردمند کو شرف قبولیت سے نواز دیا تھا۔

قاضی صاحب نے اس سلسلے میں تحریر فرمایا ہے:

> ''اس وقت تحدیثِ نعمت کے طور پر اس حقیقت کے ظاہر کر دینے میں مجھے بڑی مسرت اور لذّت محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے ۱۳۷۵ھ میں پہلے حج و زیارت کے موقع پر مقدس مقامات اور بابرکت لمحات میں خاص طور سے آبِ زمزم پیتے وقت یہ دعا بھی کی تھی کہ مجھے اسلامی علوم کے کسی خاص اور اہم شعبہ کی خدمت کی توفیق عطا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اسلامی ہند کی تاریخ مرتب کرنے کی توفیق سے نوازا ساتھ ہی کئی نادر موضوعات پر لکھنے کی سعادت بخشی۔''[1]

یقیناً اللہ تعالیٰ نے قاضی صاحب کی اس دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور انھیں اسلامی ہند کی تاریخ کے ان گوشوں میں چراغِ تحقیق رکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، جو ان سے پہلے کے اُردو مصنفین کے لیے ایک نایافت دنیا کے درجے میں تھے۔ اپنے زرنگار قلم سے ''عرب و ہند عہد رسالت میں''، ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' ''خلافتِ اُمیہ اور ہندوستان''، ''خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان'' اور ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' لکھ کر انھوں نے ہندوستان کی چار سو سالہ اسلامی تاریخ کو مبسوط و منظم انداز میں اہلِ علم و تحقیق کے سامنے پیش کر دیا۔

---

[1] مقدمہ خلافت عباسیہ اور ہندوستان۔ اپریل ۱۹۸۶ء (ص:۳۲) ناشر تنظیم فکر و نظر سندھ پاکستان

آج ہماری ہم عصر دنیا میں کتنی شخصیتیں ایسی ہیں جن کی بلند قامتی میں ان کی اپنی صلاحیتوں اور ذاتی ہنر مندیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ان کی قد آوری عقیدت مندوں اور مریدانہ ذہنیت رکھنے والوں کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ یعنی ان کی بلند شخصیت کی ساری عظمتیں دوسروں سے خیرات میں حاصل ہوئی ہیں۔ ہماری تاریخ کے صنم کدے میں کتنے بت ایسے ہیں، جنھیں عقیدت مند قلم کی تراش خراش نے بلند بنا کر نصب کردیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں وہ ذہنی وفکری اعتبار سے بہت ہی پستہ قد واقع ہوئے تھے۔ ایسے بہت ہیں، جن کی عزت وناموری اور شہرت میں اداروں، تحریکوں، مدرسوں، خانقاہوں اور طلباء کی لمبی قطاروں کا زبردست حصہ ہے اور وہ صرف اس لیے بلند نظر آتے ہیں کہ انھیں بے جا تعریف وتوصیف کے ایسے غبارے پر بیٹھا دیا گیا ہے، جس میں دوسروں کی پھونک بھری ہوئی ہے۔ اگر یہ سہارے ہٹا لیے جائیں، تو یہی قدآور شخصیتیں بونی ہوکر رہ جائیں گی۔ قاضی صاحب کے علمی قد میں کسی دوسرے کا قد شامل نہیں ہے۔ وہ جیسے ہیں اور جو کچھ ہیں اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ہیں۔ بلکہ ان کی وجہ سے دوسروں کی قدر اور قد میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

۱۹۸۰ء میں انصار گرلس انٹر کالج کے کل ہند مشاعرہ میں کیفی اعظمی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا تھا:

"آج میرا قد بہت بلند ہے اس لیے کہ اس میں قاضی اطہر مبارک پوری صاحب کا بھی قد شامل ہے"۔

خصوصیاتِ تحریر مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے شبلی اسکول کی تصانیف اور مبارک پوری علماء سے اثر پزیری کی بات تسلیم کی ہے۔ مگر انھوں نے کسی دوسرے مصنف ودانشور کا عکسِ تحریر اُتارنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کی تمام تحریریں سراسران کے اپنے اُسلوب میں ہیں۔ اُنھوں نے لکھتے لکھتے ایک ایسا اندازِ بیان اور اُسلوب نگارش پیدا کرلیا ہے۔ جو اُن کی ذہنی ساخت، مذاقِ علمی اور اُن کی جبلی اختراعات سے مناسبت رکھتا ہے۔

مولانا نے اپنے اُسلوبِ نگارش کے خدوخال کو نمایاں کرنے میں تدریجی انداز اختیار کیا۔ انھوں نے اچانک اور یک بیک اپنا طرز ایجاد نہیں کیا۔ وہ اخذ وترک کی منزلوں کے گزرنے کے بعد ہی اپنی انفرادی حیثیت کو ابھار سکے ہیں۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی فرماتے ہیں کہ وہ بڑے زود نویس تھے۔ اس زمانے میں بھی ان کی بعض کتابیں اور رسالے شائع ہوئے مگر شروع میں ان پر صحافت کا رنگ غالب تھا۔ بمبئی میں جب علم کا انہماک بڑھا اور تحقیق وجستجو کے عادی ہوئے تو ان کا طرزِ تحریر بھی بدلا اور تحریر میں بھی پختگی پیدا ہوگئی[۱]

اُن کی تحریروں کے اُفق پر ان کی شخصیت کی شفق کا رنگ اور ان کے مزاج ومعیار کی سُرخی سے بہت نمایاں ہے، جو سائنسی زبان اور قانون کے اندازِ تحریر کے قریب ہے۔ ان کی تحریر اشاراتی، تشبیہاتی،

[۱] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلہ ترجمان الاسلام بنارس (ص: ۸۶)

استعاراتی، علامتی اور اساطیری روایتوں سے بوجھل اور گراں بار نہیں۔ ان کی زبان عمدہ اور اعلیٰ صحافت کے اُسلوب میں اپنے رنگ و آہنگ کے جلوے بکھیرتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جائے کہ اچھی اور علمی و ادبی صحافتی زبان کے نمائندہ ان کے رشحاتِ قلم ہیں تو یہ زیادہ صحیح بات ہوگی۔ چوں کہ اخبار نویسی اور تاریخ نگاری کا جو منصب ہے اس کا تقاضا ہے کہ سیال، سیماب وش، آبگینے کو پگھلا دینے والی کیفیت رکھنے والے اُسلوب سے زبان کو اس لیے ذرا سا بچا کے رکھا جائے کہ اس کو واقعات کی کھتونی جس طریقے سے تیار کرنی ہے اور حقیقتوں کا انکشاف جس بلند چوٹی پر جا کر کرنا ہے، اس میں روشنی پیدا کرنے والی زبان و اُسلوب کی اہمیت ہے۔ یقیناً چونکا دینے والا اُسلوب کچھ تحیر، کچھ نیم خوابی، کچھ نیم بیداری کی کیفیت تو پیدا کر سکتا ہے لیکن بصیرت میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ صحافتی زبان اور مورخانہ اُسلوب کا رشتہ دل سے کم اور دماغ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ اس لیے دل کے پاس اگر پاسبان عقل رہے تو اچھا ہے۔ البتہ اقبالؔ کے لفظوں میں کبھی کبھی اس کو تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیے۔

مولانا کی ذہنی تشکیل اور تحریری تربیت کے دور میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد، شورش کاشمیری، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عثمان فارقلیط جیسے اہم صحافیوں اور اہلِ قلم کی نگارشات علمی حلقوں میں اپنا اثر و نفوذ قائم کر چکی تھیں۔ مولانا نے ان سے فیض بھی اُٹھایا اور اپنے قلم کو چربہ اتارنے سے بھی بچایا۔ خاص طور سے وہ صحافت میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کے خوشہ چیں تھے اور انھیں کی تربیت میں فنِ صحافت کے رمز آشنا ہوئے تھے۔ ان کے پیش روؤں میں علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی تحریروں سے بھی لطف اٹھا چکے تھے۔ مگر انھوں نے اس میں سے کسی کی پرچھائیاں اپنی تحریروں میں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔

ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''انھوں نے کسی خاص مصنف یا کسی خاص تصنیف کو سامنے رکھ کر اس کا چربہ اتارنے کی کوشش ہرگز نہیں کی۔ بلکہ موضوع و مواد اور ہیئت و اُسلوب ہر دو لحاظ سے شعوری طور پر اپنی راہ الگ نکالنے کی سعی بلیغ کی اور اس باب میں خود اپنے ذوق اور مطالعے کو اپنا ہادی و رہنما بنایا۔''[1]

انھوں نے اپنا اُسلوب خود اپنی محنت اور توجہ سے جُداگانہ راہ اختیار کر کے پیدا کیا ہے۔ ان

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلہ ترجمان الاسلام بنارس (ص: ۵۷)

کے اُسلوب میں اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہونے کی پوری پوری صلاحیت نظر آتی ہے۔ مقام تشریح و تعبیر اور واقعات و تاثرات کی تفہیم و تفسیر میں ان کی زبان کی روانی میں لکنت کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ یہ گہری سے گہری بصیرت اور ادق مضامین کو بھی اپنی شستہ و شیریں، سادہ و سلیس زبان میں بیان کرنے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی باتیں دل و دماغ میں جاگزیں ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ عربی و فارسی حوالوں کے ترجمے بھی اتنے سلیس و عام فہم ہوتے ہیں کہ تمام متعلقات واقعہ روشن ہو اٹھتے ہیں۔ مولانا کی تحریر میں وضاحت اور ان کے رنگِ بیاں میں لطفِ اظہار کی تمام زیریں لہریں موجود ہیں۔ جو پڑھنے والے میں کسی طرح کی تشنگی یا ناآسودگی کو باقی نہیں رہنے دیتیں۔ ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' سے ایک مثال کے ذریعے اس کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے اسلامی، دینی، ملی، سیاسی، تمدنی، علمی، فکری، ادبی، لسانی، اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں میں سے ہر ایک پر الگ الگ تصانیف کے انبار لگائے ہیں۔ ......مثلاً غزوات و فتوحات کے موضوع پر صرف رزم کی داستانیں مرتب کیں۔ اس میں علمی و فکری تاریخ کو نہیں ملایا اور تہذیب و تمدن کے مباحث پر جو کتابیں تصنیف کیں ان میں صرف تہذیبی و تمدنی حالات درج کیے۔ ......قدماء کے اس عام طرز تاریخ نویسی کی وجہ سے بعض لوگوں کی طرف سے شکوہ ہونے لگا کہ ہماری تاریخوں میں غزوات و فتوحات اور حکومت و امارت کی تفصیلات تو نہایت شرح و بسط سے پائی جاتی ہیں۔ مگر تمدنی، فکری، علمی، معاشی، معاشرتی باتیں اور مقامی و وقتی احوال نہیں ملتے۔ حالاں کہ اس شکوے کی وجہ ان موضوعات کی مستقل تصانیف سے کوتاہ نظری اور صرف سیر و مغازی کی کتابوں ہی میں سب کچھ تلاش کرنے کی سعی ناکام اور ذوق خام ہے۔ ......اگر کوئی مؤرخ چاہے تو کسی ایک ملک یا علاقے کی اسلامی تاریخ کے ہر پہلو کو ان کتابوں سے چھان بین کر کے نمایاں کرے۔ غزوات و فتوحات کے لیے سیر و مغازی کا مطالعہ کرے، دینی و علمی رجال کے لیے طبقات و تذکرہ کی کتابیں پڑھے، نظام حکومت کے لیے خراج و اموال اور قوانین کا کتب خانہ کھنگالے۔ عام حالات کے لیے ادب و محاضرات اور متعلقہ کتابوں کی ورق گردانی کرے اور ان سے اخذ و اقتباس کر کے جامع اور مستوعب تاریخ مرتب کرے۔''[1]

[1] قاضی اطہر مبارک پوری۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان۔ بار اوّل (ص: ۱۷-۱۸-۱۹)

مولانا قاضی اطہر کی خصوصیاتِ اُسلوب میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ وہ غیر ضروری تفصیلات سے عموماً محترز رہا کرتے تھے۔ بے موقع کی بسط و تفصیل ان کے ذہنی تکدّر کو بڑھا دیتی تھی۔ وہ اختصار میں روحانی احتراز کی لذت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں لفظوں کا انبار نہیں حقائق و معارف کے موتی ملتے ہیں۔ ان کی نثر میں لفظوں کے بے محابہ اسراف اور موقع و محل سے لفظوں کے استعمال میں بخل سے اجتناب واحتیاط کی کوشش انتہائی عروج پر ہے۔ مولانا کی عبارتوں میں کتابوں کی تفصیل اور کتابوں میں علوم ومعارف کے سمندروں کی وسعت ملتی ہے۔ وہ اپنے حوالے کی عبارتوں میں مطالب وحقائق کی پھیلی ہوئی کائنات دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے استناد واجتہاد دونوں سے کام لیا اوران کا حق ادا کردیا۔ ان کی نثر اس بات کی گواہ ہے کہ وہ ضخیم کتابوں میں سے اپنی مفید مطلب چیزوں کو نکالنے میں بہت جلد کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دقت مطالعہ اور سرعت ذہنی دونوں ایک دوسرے کی مددگار ومعاون بن جاتی ہیں۔ مولانا کی خصوصیات میں یہ چیز بہت اہم ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو کبھی حرفِ آخر اور ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' نہیں سمجھتے۔ تکمیلِ اشاعت کے بعد بھی وہ اپنی کتابوں کے مندرجات، حوالہ جات اور متعلقات پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور جیسے جیسے ان کی دریافت اور بازیافت بڑھتی جاتی ہے، وہ عبارت میں بھی اضافہ یا ترمیم وتنسیخ کرتے جاتے ہیں۔ ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی کے تعلیمی نمبر ۱۹۵۴ء کے لیے انھوں نے ''ہر پیشہ اور ہر طبقہ میں علم اور علماء'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مضمون شائع کیا۔ جو بعد میں ان کے مجموعۂ مقالات ''مآثر ومعارف'' شائع شدہ ندوۃ المصنفین دہلی میں بھی شامل ہوا ہے۔ آخر میں چل کر مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنے مطالعہ کو اور وسعت دے کر ایک تحقیقی کتاب ''مسلمانوں کے ہر پیشہ اور ہر طبقہ میں علم اور علماء'' کے نام سے مرتب کردی۔ اس مضمون کی افادیت تو تھی ہی اب نظر ثانی کے بعد اضافہ شدہ حصہ اور بھی جاندار اور وقیع ہوگیا ہے۔

ان کا قلم عموماً ایسی وادیوں میں اپنی جولانیاں دکھاتا ہے، جہاں ابھی تک کسی کی توجہ نہیں گئی۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے بہت سے ایسے گوشوں کو منور کیا جو علم وتحقیق کا ذوق رکھنے والوں کی نظر میں نامعلوم اور نایافت کے درجے میں تھے۔ مولانا کے قلم نے ''کولمبس'' اور ''واسکوڈی گاما'' کا کردار ادا کرکے نئے حقائق کے جزیروں اور نئی دنیا کی روشنی دریافت کی۔

ان کے امتیازات میں اس کو بھی شامل کیا جارہا ہے کہ انھوں نے دورافتادہ مقامات کی

علمی سرگرمیوں، دینی واصلاحی تحریکوں، علمی وتدریسی مجلسوں، تحقیقی وتصنیفی کارناموں پر محققانہ روشنی ڈال کر مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور علمی مرکزوں سے مقابلہ وموازنہ کرکے ان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ان کی کتاب ''تذکرۂ علمائے مبارک پور'' اور ''دیارِ پورب میں علم اور علماء'' کا تعلق اسی طرح کی تحقیق سے ہے۔ اس کے علاوہ خانوادۂ علمائے رسول پور، خانوادۂ علمائے سریاں، مولوی حسن علی اور چند دیگر ماہلی علماء، مشائخ جبین پور، خانوادۂ مشائخ بھیرا ولہرا ومبارک پور، مشائخ سارین، دیارِ اعظم گڑھ کے چند غیر معروف مشائخ بھی ان کے اسی طرح کے مقالات ومضامین ہیں، جن کا تعلق ایسی بستیوں کی علمی ودینی اور سماجی وثقافتی سرگرمیوں سے ہے، جو علمی مرکزوں سے دور افتادہ ہیں۔ مولانا کی یہ خدمت علمی دنیا پر کیے گئے احسان کی طرح یاد رکھی جائے گی کہ جو حقیقت گرد وغبار اور ماضی کی دھند میں لپٹی ہوئی تھی اور عام نظروں سے اوجھل تھی مولانا نے اس کو بہ تمام وکمال علمی دنیا کے سامنے لاکر رکھ دیا اور یہ ہی نہیں اس چھپی ہوئی حقیقت کے جلوۂ ہزار رنگ کو دکھا کر انھوں نے ہماری جمالیاتی حس اور حسن بینی کے شوق کو جگا دیا۔ ان کی تحقیقات نے بڑے بڑے خلاء کو پُر کیا اور ایک دوسرے سے الگ علمی وتمدنی جزیروں کو علمی دنیا سے جوڑنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی۔ اس طرح دور افتادہ علاقوں اور نگاہِ قلم سے اوجھل بستیوں کی خدماتِ علمی کو بھی اہم علمی وتمدنی مرکزوں سے ہم رشتہ کرکے وسیع تناظر میں دیکھنے کی راہ ہموار ہوئی۔

قاضی صاحب کی نمایاں اور بنیادی خصوصیات ہیں مؤرخانہ مزاج، وسعتِ مطالعہ، ہجومِ مطالب ومصادر میں حسنِ انتخاب اور عمدہ ترتیب وتہذیب کے ذریعہ مستقل غور وفکر کرتے رہنا اور بصیرت انگیز تفحص وتجزیہ کے بعد موضوع کے تمام متعلقہ پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے اپنا نتیجۂ فکر اور عالمانہ وواقف کارانہ محاکمہ پیش کرنا، معلوم سے نامعلوم کا پتہ لگانا اور سلسلۂ واقعات کے بطن سے موہوم ومعکوس حقیقتوں کو نکالنا۔ اس طرح ظن وتخمین کے تمام ابر آلود مطلعے صاف ہوتے جاتے ہیں اور پھر کسی عنوان اور پہلو سے تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ ان کی قلمی کاوشوں سے علمی وفکری افلاس کے احساس کو ختم کرنے میں مدد ملی اور ذہنِ ہندی کا اضطراب ختم ہوا کہ نطقِ اعرابی کی گہر افشاں گھٹائیں جب علمی ودینی اعتبار سے بنجر علاقوں، شورہ زمینوں، صحرا نما خطوں پر برس گئیں تو ایسے ایسے گل وگلزار نے اپنی بہاروں کی ارزانی کا جلوہ دکھایا کہ:

گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد داماںِ نگہ تنگ وگل حسنِ تو بسیار

کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔

اعزازات قاضی صاحب کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ۱۵ر اگست ۱۹۸۵ء کو عربی زبان اور علمی شغف پر سندِ توصیف ''کشمیری چادر'' اور تاعمر سالانہ پانچ ہزار روپے کا وظیفہ دیا جانا منظور کیا گیا۔ ۱۹۸۸ء سے وظیفہ کی رقم دس ہزار روپیہ کردی گئی۔ یہ حکومت ہند کا بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ جس کو علمی حلقوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ ملنے کی تبریک میں شہر اعظم گڑھ والوں کی طرف سے شبلی کالج اعظم گڑھ میں ایک تہنیتی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ جس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شری اشوک پریہ درشی ضلع مجسٹریٹ اعظم گڑھ شریک ہوئے۔ جو خود بھی ہندی کے بہت اچھے ادیب و افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے بہت اچھی تقریر کی اور قاضی صاحب کو یہ پیش کش فرمائی کہ اگر اعظم گڑھ پر یہ تحقیق کو آگے بڑھائیں تو ضلع انتظامیہ اور حکومتِ اتر پردیش ہر ممکن تعاون پیش کرکے مسرت محسوس کرے گی۔ اس جلسۂ تبریک میں دوسرے اہلِ علم اور شبلی کالج و دارالمصنفین کی علمی شخصیتوں نے مولانا کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کے علمی مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالی۔

ان سب سے پہلے ۹ر جون ۱۹۷۸ء کو ساڑھے آٹھ بجے شب میں انصار گرلس جونیر ہائی اسکول مبارک پور میں ایک خیر مقدمی اجلاس قاضی صاحب کی بلادِ افریقہ و ممالکِ عربیہ کے علمی و تہذیبی دورے سے واپسی کے موقع پر منعقد کیا گیا۔ جس کا سارا خاکہ راقم الحروف کا ترتیب دیا ہوا تھا۔ اس میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر شعیب اعظمی، مولوی ابوعلی اثری (عبدالباری)، مولانا مظفر حسن ظفر ادیبی، ڈاکٹر نعیم احمد صدیقی ندوی، مولانا منصور خاں رفیق دارالمصنفین، مولوی نجم الدین احیائی، علی مختار مبارک پوری وغیرہ نے شرکت کی۔ اس میں مضامین نظم و نثر کے ذریعہ مولانا کی خدمات کو سراہا گیا اور ان کے کارناموں پر تجزیاتی نظر ڈالی گئی تھی۔ مبارک پور کی سرزمین پر اپنی نوعیت کا یہ پہلا پروگرام تھا۔

ربیع الاول ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں اسلام آباد پاکستان میں تیسری عالمی قرآن کانفرنس اور سرکاری سطح پر سیرت کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ جس میں آپ کو خصوصیت سے مدعو کیا گیا۔ دونوں کانفرنس میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم سے بار بار ملاقات ہوئی اور انھوں نے مولانا کو ہدیہ و تحائف پیش کیے۔

مارچ ۱۹۸۳ء میں تنظیم فکر و نظر سکھر سندھ پاکستان کی دعوت پر ہندوستان کے علمی وفد کے ساتھ سندھی ادبی میلہ میں شرکت فرمائی۔ جنرل محمد ضیاء الحق صدرِ پاکستان کے ہاتھوں انھیں سندھ کی روایتی ٹوپی

اور تنظیم فکرونظر کا اعزازی نشان دیا گیا۔

تنظیم فکرونظر سکھر پاکستان نے مفکر اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی چار کتابیں: (۱) عرب و ہند عہدِ رسالت میں (۲) خلافتِ راشدہ اور ہندوستان (۳) خلافتِ امیہ اور ہندوستان (۴) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان، اپنے اہتمام میں شائع کر کے ان کی رسمِ اجراء اور تعارف کی مجلس ۱۰ اراگست ۱۹۸۶ء کو تاج ہوٹل کراچی میں رکھی۔ جس میں اہلِ علم و تحقیق، ماہرین علومِ اسلامی اور صاحبانِ قلم نے مولانا کی ادبی خدمات اور کتابوں کے موضوع و اسلوب پر اپنے بہترین خیالات کا اظہار فرمایا اور قاضی صاحب کی احسان شناسی وقدر افزائی کے طور پر انہیں ''محسنِ سندھ'' کا خطاب دیا۔

فاران کلب کراچی بھی اہلِ علم اور اربابِ فکروادب کا ایک ثقافتی ادارہ ہے۔ اس کی طرف سے مولانا کی کتابوں پر اظہار رائے کے لیے ایک تقریب اور اسی سلسلے میں ظہرانہ کا اہتمام ہوا۔ مقررین نے کھل کر مولانا کی خدمات کا اعتراف کیا اور یہ کہا کہ ہم اہلِ سندھ اس تاریخی حقیقت سے ناواقف تھے کہ اس ملک میں صحابہ وتابعین کی آمد ہوئی ہے اور عہدِ رسالت ہی سے اس ملک کو اسلام اور مسلمانوں سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔

اسی سلسلے کا ایک اور پروگرام تنظیم فکرونظر کے صدر مقام سکھر میں انعقاد پزیر ہوا۔ جس میں دانشور وصحافی حضرات نے قاضی صاحب کی تحقیق وجستجو پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ان کی اوّلیات کا انشراحِ قلبی کے ساتھ اعتراف کیا۔ مولانا کی کتابوں کی جو خصوصیات ہیں، ان پر بصیرت افروز روشنی ڈالی۔ اس کا بھی اعتراف کیا گیا کہ ان کتابوں کو لکھ کر ایک شخص نے ایک ادارہ کا کام کیا ہے۔

وفات حسرتِ آیات قاضی صاحب نزلاوی مریض تھے۔ انھیں عموماً نزلہ کی شکایت رہا کرتی تھی۔ صبح کو مسلسل چھینک آتی اور ناک سے پانی کی اتنی ریزش ہوتی تھی کہ ان کا رومال تر ہو جایا کرتا تھا۔ جیسے جیسے دھوپ بڑھتی نزلاوی کیفیت میں افاقہ ہوتا جاتا۔ عمر کے اخیر حصے میں نزلاوی ریزش کے ساتھ خون کی آمیزش بھی رہنے لگی تھی۔ معالجاتی تشخیص میں ڈاکٹروں کی رائے آئی کہ مسلسل نزلہ کی وجہ سے ناک میں بدگوشت ہو گیا ہے، اسی وجہ سے ناک سے خون کی ریزش ہو رہی ہے۔ اگر آپریشن کے ذریعہ بدگوشت کو نکال دیا جائے تو یہ صورت حال باقی نہیں رہے گی۔ چناں چہ ڈاکٹروں کے متفقہ فیصلے کے تحت اعظم گڑھ میں آپریشن ہوا۔ اس عملِ جراحی کے دوران ڈاکٹروں کو کینسر کا شبہہ ہوا۔ بہر حال دوا چلتی رہی، خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے برابر کمزوری بڑھتی رہی۔ اس دوران وہ بار بار یہ بات دہراتے رہے کہ میری کمزوری دور ہو جائے تو میں بالکل تندرست ہوں۔ نقاہت کے علاوہ مجھے کوئی عارضہ نہیں ہے۔

مگر میڈیکل رپورٹوں اور ڈاکٹروں کی تشخیص میں یہی تھا کہ قاضی صاحب کا اندرونی حصہ بھی کینسر سے کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ علاج جاری رہا۔ قاضی صاحب کو نقاہت وضعف کے سوا کوئی دوسری شکایت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ البتہ خوراک وغیرہ کم ہوتی گئی اور اخیر میں چند دن ایسے گزرے کہ کھانے کی ضرورت برائے نام رہ گئی تھی۔ مگر ان کے اندر کا مصنف اتنا حوصلہ مند تھا کہ اسی عالم میں وہ اپنے مسودات وغیرہ کو درست کرتے رہے۔ شام کو مکان سے اپنے میڈیکل ہال پر آنے جانے کے معمول میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ ان کے اندازِ گفتگو، چہرے کی ظاہری بشاشت اور معمولات سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ مولانا کا سفرِ زندگی اپنی آخری منزل پر پہنچ چکا ہے اور بہت جلد مولانا کی علمی زندگی سے قرطاس وقلم کی رفاقت کا سلسلہ ختم ہونے والا ہے۔

قاضی صاحب کو جمعہ ۱۲ر جولائی ۱۹۹۶ء کو پیشاب میں تکلیف محسوس ہوئی۔ تھوڑا رک رک کر تکلیف کے ساتھ کئی بار پیشاب آیا، منہ کا ذائقہ بھی بگڑ گیا، اشتہا بھی جاتی رہی، دوپہر اور شام میں کہنے کو تھوڑا سا کھا لیا تھا۔ دوسرے دن صبح میں معمولی ناشتہ کیا، بھوک نہ ہونے کی بات بھی دہرائی، پورے بدن میں درد بتایا اور اپنے وقتِ موعود کے قریب آنے کا ذکر کیا۔ بیٹے قاضی ظفر مسعود کا بیان ہے کہ دن میں صرف دو بار مسمّی کا جوش لیا۔ نیم بے ہوشی، نیم غنودگی کی کیفیت میں رہنے لگے۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء کی فجر کے بعد جو ان کے انتقال کی تاریخ ہے انھوں نے اپنے اہل خانہ اور بچوں کو بعض ضروری وصیتیں اور نصیحتیں فرمائیں۔ آخر ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء/ ۲۸ر صفر ۱۴۱۷ھ بروز یکشنبہ ۹ ر بج کر ۵۵ر منٹ پر رات میں محرابِ علم ودانش کا یہ روشن چراغ نصف صدی تک اپنے نوکِ قلم کی روشنی سے تاریخِ اسلامیِ ہند کے بہت سے گمنام اور تاریک گوشوں کو منور کرتا ہوا اپنے معبودِ حقیقی سے جاملا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اب یہ دعا کرو کہ سحر دائمی رہے — اس شمع گل شدہ کی امر روشنی رہے

دوسرے دن دوشنبہ کو ساڑھے بارہ بجے غسل کی تیاری ہوئی۔ سوا تین بجے نمازِ جنازہ مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بنارس رکنِ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے پڑھائی۔ بنارس، جون پور، اعظم گڑھ، مئوناتھ بھنجن، غازی پور، گورکھ پور اضلاع کے علماء وفضلاء کی کثیر تعداد نے جنازہ میں شرکت کی۔ مبارک پور کے مشہور قبرستان شاہ کے پنجہ میں تدفین عمل میں آئی:

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

شاعری

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ایک قادر الکلام اور زود گو شاعر تھے۔ ان کی شاعری کسبی نہیں وہبی تھی۔ ان کے یہاں آورد نہیں آمد کی شان جلوہ آرا ہے۔ ان کے فکر وخیال اور لفظ وبیان میں بڑا تال میل اور ذو معنی رشتۂ رفاقت ہے۔ وہ سہ لسانی شاعر تھے، یعنی اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن کو ذریعۂ اظہار بنایا تھا۔ ان کے یہاں غزل، نظم، نعت قطعہ، شخصی نوحے یا مرثیے کے علاوہ ساقی نامہ، شاہ نامہ اور مثنوی کے رنگ میں بھی شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ اصنافِ شاعری کی بوقلمونی کے ساتھ موضوعات کی وسعت بھی ان کی شاعری کی اہم خصوصیات میں سے ہے۔ وہ بے منتِ غیرے کامیابیوں کے دریچے تک پہنچے ہیں۔ ان کے اساتذہ میں بھی کوئی شاعر وادیب نہیں تھا، جس سے وہ نکاتِ سخن کی آگہی حاصل کرتے۔ قاضی صاحب نے اپنے حالات میں ایک جگہ اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کو چھوڑ کر باقی اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"میرے اساتذۂ کرام میں کوئی ادیب، شاعر، مصنف اور مضمون نگار نہیں تھا۔ مگر میں ان ہی سے تعلیم حاصل کر کے سب کچھ ہوا۔ یہ ان کے خلوص اور میری ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے۔"[1]

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مولانا کا میلان طبع شاعری کی طرف کیوں ہوا۔ وہ کون سے اسباب وعوامل تھے، جنھوں نے ان کی فکر کو شاعری کا کوچہ دکھایا اور یہ اس بتِ کافر ادا کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے۔ طبعی رجحان کے مظاہرے کے بارے میں اب یہ بات ایک تسلیم شدہ حقیقت بھی بن چکی ہے کہ خارج میں پہلے ہی سے وہ تمام عناصر، اثرات یا اسباب موجود رہتے ہیں، جو ذہن وفکر کے بنانے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، جن کو ہم ماحول کا نام دیتے ہیں۔ اگر چہ وہ عام نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ یا انسان کو وہ میلان ورجحان وراثتاً ونسلاً ملتے ہیں، جو زندگی کا قطب نما درست کرتے ہیں۔ چوں کہ انسان اس عالمِ اسباب سے رشتۂ زندگی رکھتا ہے، اس لیے ہر سبب کا مسبّب ضرور ہوتا ہے۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا تعلق جس دور سے اور جس طرزِ تعلیم سے تھا، اس میں

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرہ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۷ء (ص: ۱۷-۱۸)

ادب وشعر، زبان وبیان، قواعد وعروض کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ درسی کتابوں میں علوم وفنون کی ان شاخوں کو نمایاں حیثیت دی گئی تھی، جو قواعد وانشاء سے خاص تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے دور میں شاعری کی واقفیت، علمیت وقابلیت کی دلیل اور حیثیتِ عرفی کی کلید تھی۔ دوسری مسلم آبادیوں کی طرح مبارک پور میں بھی شاعروں کا ایک سلسلۃ الذہب کسی نہ کسی انداز میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ فارسی تعلیم اور نصابی کتابوں کے حوالے سے مزاجِ شعری کو بارآور ہونے کے لیے بہترین ماحول مل جاتا تھا۔ مولانا کے ننہالی بزرگوں میں نانا مولانا احمد حسین رسول پوری (۱۲۸۸ھ-۱۳۵۹ھ) اور حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری (۱۳۲۸ھ-۱۳۸۷ھ) کا شمار عربی کے اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔ اول الذکر کا عربی کلام بھی "دیوانِ احمد" کے نام سے شائع ہوکر عربی داں حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ دورانِ گفتگو مولانا قاضی اطہر نے مجھے ایک بار ان کا ایک شعر اپنے قلم سے پرزے پر لکھ کر دیا تھا، جو ذولسانی شاعری کا نمونہ بھی ہے۔ وہ یوں ہے:

ندا آمد چہ شد احمد حسینا ۔۔۔ تو رکھ امید وابستہ خدا سے

مولانا یحییٰ رسول پوری عربی قصیدہ نگاری میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔ انھوں نے کوکن کی ایک جامع مسجد کے لیے عربی میں کئی اشعار کا نہایت شاندار قصیدہ لکھا تھا جو مطبوع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ "البلاغ" بمبئی کے "شاہ سعود نمبر" میں بھی ان کے کئی عربی کلام موجود ہیں۔ انہیں منظوم عربی تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔

مہسلہ کی جامع مسجد کے لیے ۱۳۷۰ھ میں ان کی کہی ہوئی منظوم تاریخ ملاحظہ ہو:

منظومة تاريخية فى جامع مهسلة

جزى الله رب الناس خير جزائه	انا سابنوا فضلاً من الله مسجداً
لهم مثله بيت من الله فى الجنا	ن قال رسول الله ذالك وارشداً
وذاك بماهم انفقوا خالصاً له	فلله در المخلصين مويّداً
فطوبى لارباب مهسلة كلهم	فانهم خروا الى الله سجّداً
من الأطهر القاضى الفقير افتتاحه	ويرجوا الهه الخلق غفراً مجدّداً

وارّخ يحيى الاعظمى اختتامه

برحمتك اللهم ابدعت معبداً [1]

۱۳۷۰ھ

---

[1] تذکرہ علمائے مبارک پور۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری جون ۱۹۷۴ء (ص: ۲۶۴-۲۶۵)

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے ان دونوں بزرگوں کے اثرات قبول کرنے کی بات خود تسلیم کی ہے[1] اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے شعری مزاج کی تشکیل کے لیے اسباب ان کے ننہال سے فراہم ہوئے تھے۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ ان کی قواعد وانشاء اور ادب عربی و فارسی کی کتب متداولہ نے پوری کر دی تھی۔ ان کی موزونیتِ طبع کو بھی اپنے اظہار کے راستے کی تلاش تھی۔ ان سب نے مل کر ان کی سوئی ہوئی شعری صلاحیتوں کو جگا دیا تھا۔ ذہنی و فکری زمین کی نمو پزیری کے لیے خارجی فضا کی نمی بنیادی چیز ہوا کرتی ہے جو انھیں حاصل تھی۔ مولانا ابھی کم عمر ہی تھے کہ شعر و شاعری نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ ان کا بیان ہے کہ:

> ''اردو تعلیم ہی کے زمانہ سے شعر و شاعری کا ذوق ابھرنے لگا تھا۔ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔ مضمون نگاری کی طرح شعر و شاعری میں بھی کسی سے اصلاح یا مشورہ کی باری نہیں آئی اور اپنے ذوق ہی کو رہنما بنایا۔ خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھا تو اس میں بھی بہت زیادہ انہماک ہو گیا''[2]

اس انہماکِ شعری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کا زیادہ وقت شاعری کی نذر ہونے لگا یہی نہیں بلکہ ان کے اپنے لفظوں میں خواب میں بھی شاعری کرنے لگے اور نیند ان کی شعری صلاحیتوں کو جگانے لگی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شعر و شاعری کا ذوق اُبھرا تو اتنا غلو ہوا کہ خواب میں اشعار کہنے لگا۔ اگر یہ صورت باقی رہتی تو اچھا خاصا شاعر بن گیا ہوتا''[3]

مولانا کی شاعری کی عوام و خواص میں دھوم مچ گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھی طلباء میں ہی شاعری کی نسبت سے نہیں پہچانے جانے لگے، بلکہ اُن کا تعارف عوام میں بھی ہونے لگا۔ ان کی شاعری کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ ان کے طالب علم دوستوں کو ان کے اشعار یاد رہنے لگے۔ ان کے دوست مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری ان کے اشعار کو عموماً اپنے حافظے کے نعمت خانے میں محفوظ رکھا کرتے تھے اور جب کسی علمی شخصیت سے ملاقات ہوتی تو وہ مولانا کا نہایت شاندار انداز میں تعارف کراتے اور ان کو مولانا کے اشعار سناتے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ جب مولانا سید محمد میاں ۱۳۵۷ھ میں احیاء العلوم کے طلباء کی انجمن جمعیۃ الطلباء کے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لیے مبارک پور تشریف لائے تو

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۷ء (ص: ۱۵)

[2] ایضاً (ص: ۴۱)۔۔۔ [3] ایضاً (ص: ۴۸)

مولانا محمد عثمان ساحر صاحب نے ان کو مولانا کے اشعار سنائے۔ جن کو مولانا سید محمد میاں نے اپنے ماہ نامہ ''قائد'' میں شائع کر دیا۔ اس طرح قاضی صاحب کی احیاء العلوم کی طالب علمی کا کلام مدرسہ شاہی جامعہ قاسمیہ مرادآباد کے ترجمان ماہ نامہ ''قائد'' مرادآباد میں شائع ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن رسالہ قائد میں چھپنے سے پہلے ان کی نظم ''مسلم کی دعا'' کے عنوان سے پہلی بار رسالہ الفرقان بریلی جلد ۵ نمبر ۶ بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ کے ص: ۳۲ پر چھپ چکی تھی[1]

اس نظم کے کل پانچ بند ہیں اور یہ مسدس کی ہیئت میں ہے۔ اس میں شاعر نے ماضی کی یادوں کو کریدتے ہوئے اور اسلاف کے کارناموں کو روشن کرتے ہوئے عہدِ رفتہ کے لوٹ آنے، حجازی وادیوں میں شورشِ مستانہ اور اسلام کی طرف دنیا کے مائل ہونے کی تمنا ظاہر کی ہے اسی کے ساتھ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور اسلاف کے کارناموں اور ان کی داستانِ جانبازی کو دنیا میں دہرانے کی دعا مانگی ہے۔ اس نظم کا پہلا بند اس طرح ہے:

الٰہی پھر وہی ساقی وہی میخانہ ہو جائے
حجازی وادیوں میں شورشِ مستانہ ہو جائے
شبستانِ جہاں توحید کا کاشانہ ہو جائے
ہر اک فرد بشر اسلام کا دیوانہ ہو جائے
الٰہی پھر پتنگوں میں امنگ و سوز پیدا کر
الٰہی پھر رخِ اسلام پر دنیا کو شیدا کر

ڈیڑھ برس کے بعد یہی نظم عنوان کی تبدیلی کے ساتھ ''نالۂ اطہر'' کے عنوان سے ماہ نامہ ''قائد'' مرادآباد بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۹ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ میں ص: ۳۱ پر اُس وقت چھپی جب قاضی صاحب دورۂ حدیث کی تکمیل کے لیے مدرسہ شاہی جامعہ قاسمیہ مرادآباد میں زیرِ تعلیم تھے اور ''قائد'' کے مدیر مولانا سید محمد میاں بھی جامعہ قاسمیہ کے دیگر اساتذہ کے ساتھ قاضی صاحب کے علم حدیث اور ادبِ عربی کے استاد کی حیثیت سے ان کی علمی و دینی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ قاضی صاحب نے ''نالۂ اطہر'' کو ترمیمی صورت دیکر رسالہ ''قائد'' میں چھپوایا تھا۔ ''فرقان'' بریلی اور ''قائد'' مرادآباد میں شائع دونوں نظموں کا تقابل کرنے کے بعد جو شواہد سامنے

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور۔ ۱۹۸۷ء (ص: ۴۲)

آئے ہیں ان کی تفصیل یوں ہے:

مسلم کی دعا کے پہلے مصرع میں میخانہ تالیہ آیا ہے "نالۂ اطہر" میں میخانہ کو بدل کر پیمانہ کا پُر دیا گیا ہے۔ مسلم کی دعا کے تیسرے مصرع کی قرأت ہے "شبستان جہاں تو حید کا کاشانہ ہو جائے" نالۂ اطہر میں یہ مصرع ترمیمی صورت اختیار کر کے "شبستان جہاں پھر محفل رندانہ ہو جائے" ہو گیا ہے۔ اس مصرع میں "توحید کا" کے فوراً بعد" کاشانہ" تھا جس کی وجہ سے تنافر کا عیب پیدا ہو گیا تھا۔ یعنی دو ہم مخرج یا قریب المخرج الفاظ و حروف کا ایک ساتھ آنا تنافر کا عیب کہلاتا ہے۔ قاضی صاحب کی اس ترمیم سے یہ عیب دور ہو گیا ہے۔ اب اس ترمیم نے بند میں ثمریاتی یکسانیت بھی پیدا کر دی ہے۔ "فرقان" میں پہلے بند کے پانچویں مصرع میں امنگ و سوز ہے مگر" قائد" میں امنگ سوز شاید کاتب کی غلطی کی وجہ سے ہے۔ گو کہ اہلِ فن عربی یا فارسی الفاظ کے بعد ان ہندی الفاظ کو جن کا تعلق اسمائے اعلام سے نہ ہو، ترکیبی یا عطفی صورت میں استعمال کرنے کو عیب سمجھتے ہیں، لیکن قاضی صاحب کی بے مدت استاد ابتدائی اور طالب علمانہ شاعری کو دیکھتے ہوئے شدّت کے ساتھ اس کی گرفت کرنا مناسب نہیں ہے اور نہ ہی فن کے تقاضوں پر ایک طالب علم سے زیادہ اصرار کیا جا سکتا ہے۔

"مسلم کی دعا" میں دوسرے بند کے تیسرے مصرع میں " حجاب نیند غفلت" کی ترکیب استعمال ہوئی ہے جو سراسر غیر ادبی ہے۔ نالۂ اطہر میں " حجاب خواب غفلت" کی ترکیب کا استعمال ہوا ہے۔ جو فنّی اصول اور شعر و زبان کی اصلاحی تحریک کے نقطۂ نظر اور ادبی قواعد کی رو سے معتبر ہے۔

"مسلم کی دعا" میں تیسرا بند مکمل ہے جب کہ" قائد" میں مطبوع" نالۂ اطہر" کا تیسرا بند نامکمل ہے۔ اس کے صرف چار مصرعے چھپے ہیں۔ یعنی دوسرا اور تیسرا مصرع نہیں چھپا ہے۔ قائد میں یہ بند اس طرح چھپا ہے:

دلِ مسلم کو پھر تو جوشِ ایمانی سے تڑپا دے
ذرا آواز گلہ ہاں کی پھر گلوں میں پہنچا دے
الٰہی پھر رہ اسلام میں قربان ہو جائیں
فدا کار بلال و بوذر و سلمان ہو جائیں

ماہنامہ الفرقان بریلی میں یہ بند اس طرح چھپا ہے:

تکمیل اور اپنی طبیعت کی تسکین کا ذریعہ نہیں ہے۔ شاعر کو خود سامعین کی ضرورت ہے، خواہ وہ نشستِ ومشاعرہ کی محفلوں کے ذریعہ فراہم ہوں، یا اخبار ورسالہ کے توسط سے قارئین کی شکل میں شاعر کو ملیں۔

براؤ ننگ نے ایک جگہ کہا ہے کہ:

"کیا تم سمجھتے ہو کہ شاعری کبھی عام طور پر سمجھی گئی ہے یا سمجھی جا سکتی ہے۔ شاعر کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے، جس کے سامنے وہ جواب دہ ہے اور جس سے وہ اپنی شاعری کا صلہ پاتا ہے"۔

براؤ ننگ یہ کہہ کر ثابت کرنا چاہتا ہے کہ شاعر کی جبلی خواہش تخلیقی عمل کا محرک ہوتی ہے۔ فنکار کے اظہارِ فن میں خارج کا کوئی رول نہیں ہوتا۔ مگر یہ بات نفسیاتی اور انسانی فطرت کے اصول کے بالکل خلاف ہے۔ آخر ان موثرات وعوامل کو کیا نام دیا جائے، جو تعریف و مذمت، تحسین وتذلیل کے نتیجے میں انسانی ذہن ودل میں پیدا ہوتے ہیں۔ براؤ ننگ کی بات میں بظاہر خوبصورتی تو بہت ہے، لیکن سچائی بالکل نہیں ہے۔ مذہبی واعتقادی شاعری میں بھی اللہ کی سخن فہمی اور اس کے صلہ کی اُمید پر کسی کو قانع نہیں دیکھا گیا۔ گوکہ غالبؔ نے اور اقبالؔ نے بھی اپنے زمانے کی سماجی زندگی کے اپنی شاعری کو نہ سمجھنے سے اپنی لاپروائی کا اظہار کیا ہے اور ایسا تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ انھیں سامع یا قاری کی دادو تحسین کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر جن اشعار میں اس طرح کی بات کہی گئی ہے، اُن اشعار کا اندازِ اظہار بھی اپنے اندروں میں اپنے سماج سے شکوہ سنجی اور گلہ داری کا پہلو رکھتا ہے اور صاف جھلکتا ہے کہ معاشرہ سے حسب دل خواہ داد نہ ملنے پر انھیں دکھ ہے۔ شاعر کو انسانی سامعین کی ضرورت ہمیشہ ہوتی ہے۔ یہی ضرورت شاعری کے قابلِ فہم ہونے کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کا کلام جب رسالوں میں چھپنے لگا تو ان کے ذوقِ شعر گوئی کو اور مہمیز ہوئی اور انھوں نے اس شغل میں اپنے انہماک کو اور بڑھا دیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے بعد سے مولانا میں شعر وشاعری کے تعلق سے ایسا نشاطِ روح پیدا ہوا کہ وہ اس میں پوری دلچسپیوں کے ساتھ غرق ہو گئے۔ اس سلسلے میں خود مولانا کہتے ہیں کہ:

"مضامین واشعار کے شائع ہونے کے بعد شاعری اور مضمون نگاری کے ساتھ تصنیف وتالیف اور تلاش وتحقیق کا ذوق جرأت وہمت دکھانے لگا۔ چناں چہ میں نے زمانۂ طالب علمی میں پانچ کتابیں لکھیں، دو عربی میں اور تین اُردو میں"[1]

ان کے دورِ طالب علمی کی یادگار انھیں کتابوں میں "اصحاب صفہ" کے نام سے ایک منظوم کتاب

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور۔ ۱۹۸۷ء (ص:۳۷)

بھی تھی۔ جس میں تقریباً سوا دو سو اشعار مولانا کے کہے ہوئے تھے۔ ان اشعار میں جو جذب و تاثر اختیار کیا گیا تھا اور جس انداز و طرز میں شاعری کی گئی تھی، وہ نہایت والہانہ اور عقیدت مندانہ تھا۔ اس منظوم کتاب میں حضرات اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم کے اسماء و احوال، دین و آخرت اور خدا اور رسول سے ان کی شیفتگی کے واقعات و حالات کو حفیظ جالندھری کے ''شاہ نامۂ اسلام'' کے رنگ و آہنگ میں نظم کیا گیا تھا۔ اصحاب صفہ کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا سید فخر الدین احمد صاحب نے اسے دیکھ کر بہت پسند فرمایا اور دو ایک جگہ اصلاح دی تھی اور مولانا سید محمد میاں صاحب نے اسے مزید تصحیح کے لیے مولانا اعزاز علی صاحب کے پاس بھیج دیا اور ان سے اصلاح کے بعد آ گئی۔ وطن واپس آیا تو اسی سال (۱۳۵۹ھ) شباب کمپنی بمبئی (ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی) کے لیے بعض عربی کتابوں کا ترجمہ کیا اور رسالہ ''اصحابِ صفہ'' اسی کمپنی کو دیا، مگر اس کی بھی اشاعت نہ ہو سکی، میرے پاس اس کی نقل بھی نہیں ہے، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے خاصے کی چیز تھی''[1]

اس کتاب ''اصحابِ صفہ'' کے موضوع اور ہیئت و انداز سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کی مشقِ سخن اتنی بڑھ چکی تھی اور ان کے مزاج شعری کی ایسی تربیت ہو چکی تھی کہ ذرا سی فکر پر اشعار کی آمد شروع ہو جاتی تھی اور طبیعت کی جولانی اتنے شباب پر آ جاتی تھی کہ شعر کہنے میں انھیں کوئی انقباض اور آشفتگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ان کے ذہن و فکر پر گرانی اور زیر باری کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ان کی پوری شاعری ان کی اسی آمد اور ذہنی مناسبت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے اس میں اثر اور مقناطیسی کشش کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا بچپن ہی میں شعر و شاعری کی طرف مائل ہو گئے تھے اور اپنی موزوں طبعی کا ثبوت دینے لگے تھے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا تو اپنے طور پر اچھی خاصی شاعری کرنے لگا اور میرے اشعار مذہبی، سیاسی اور علمی جلسوں میں پڑھے جانے لگے بلکہ چھپنے لگے''[2]

جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا کا آوازۂ شہرت دور دور تک گونجنے لگا اور ان کے نام سے علمی و دینی اور سیاسی و سماجی حلقے واقف ہونے لگے۔ اپنی شخصیت کے بنانے، سنوارنے اور آگے بڑھانے کے ان

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور۔ ۱۹۸۷ء (ص: ۳۹)

[2] ایضاً (ص: ۲۴)

کے عمل نے انھیں قطرہ سے گہر اور ذرّہ سے ستارہ بنا دیا۔ ان کا بیان ہے کہ:

"میں نے کثرتِ مطالعہ، علمی استعداد، مضمون نگاری، تصنیفی ذوق، شعر و شاعری بحث ومناظرہ، تقریر وخطابت میں شہرت کی حد تک کامیابی حاصل کر لی۔ صلاحیتوں کے دروازے کھل گئے۔ جولانیِ طبع اور علمی انبساط ونشاط ہر میدان میں رواں دواں معلوم ہونے لگا۔"[1]

بچپن کی عمر تحصیلِ علم اور اکتساباتِ ذہنی کی ہوتی ہے۔ اس عمر میں کسی ایک میدان سے ایسی جذباتی وابستگی اور وفاداری بشرط استواری بہت خطرناک اور ارتقاء کے راستے کا پتھر ثابت ہوتی ہے، جو دوسرے میدانوں اور زندگی کے تقاضوں سے بالکل الگ تھلگ کر دیتی ہے۔ کیوں کہ یہ عمر ذہنی وفکری صلاحیتوں کو جگانے، انسان کے اندر چھپی ہوئی تخلیقی قوتوں کو بیدار کرنے اور ذہنی وفکری رجحانات ومیلانات میں اعتدال وتوازن پیدا کرنے کے لیے زندگی میں سابقہ پڑنے والے تمام معاملات کا تھوڑا تھوڑا تجربہ حاصل کر کے تکمیلِ شخصیت کے لیے فائدہ اُٹھانے کی ہوتی ہے۔ اس عمر کا تقاضا ہوتا ہے کہ نگارخانۂ حیات پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے رنگِ تماشا کو دیکھ لیا جائے اور کسی مقام پر زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی کوشش نہ کی جائے، ورنہ زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ وہ ساتھ چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ایک ہی رنگ و بو کو دیکھنے میں رہ جائے گا اور پھر اپنی محدود دنیا سے کبھی اُوپر نہیں اٹھ سکے گا۔ اس لیے زمانۂ طالبِ علمی میں سیاسی سرگرمی، کھیل کود اور شاعری مفید ثابت نہیں ہوتی۔ مولانا اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں بڑی گہری بصیرت سامنے لاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے اِن کے تعلیمی نظریہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"زمانۂ طالبِ علمی میں شعر وشاعری عموماً مفید ثابت نہیں ہوتی لیکن اگر سلیقہ اور اعتدال سے ہو تو بہت خوب اور مفید ہے۔ اس سے ذہنی اور فکری جلا پیدا ہوتی ہے۔"[2]

مولانا کی شاعری بھی ان کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوئی، شاعری نے ان کے نہاں خانۂ دل کو کھول دیا، ان کے ذہنی اِرتعاشات میں زود حسی پیدا کر دی، ان کی جہاتِ علمی کو روشنی عطا کر دی اور ان کو ایک رنگِ بصیرت سے نواز دیا، جس کی گرفت سے زندگی کی کوئی ادا بچ نہیں سکی۔ شاعری مولانا کے علمی سفر کی راہوں میں ایک مرحلۂ شوق ثابت ہوئی۔ شاعری ان کی منزل نہیں تھی ان کے لیے یہ زندگی کا سبق حاصل کرنے کا ایک وسیلہ تھی۔ اس لیے زندگی کے سفر میں اس نے دور تک حقِ رفاقت ادا نہیں کیا۔ مولانا کی نظر

---

1. قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور۔ ۱۹۸۷ء (ص: ۲۴-۲۵)

2. ایضاً (ص: ۴۳)

لگن اور تحقیقی تڑپ بھی زیادہ دیر تک شاعری کی تصوراتی کائنات اور تخیلی فضا کو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ شاعری میں جو سیماب وشی ہوتی ہے، شاعروں کی عملی زندگی پر بھی اُس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔اس لیے شعراء عموماً اپنے تخیلات وتصورات کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتے اور جہادِ زندگانی کے بہت سے محاذ پر عملاً وہ ناکام ثابت ہوتے ہیں۔مولانا کو عرش وفرش کی آواز کو نظر انداز کر کے حد پرواز سے بہت آگے جانا تھا۔وہ اپنی منزلِ شاعری کے سدرۃ المنتہیٰ سے بہت آگے دیکھتے اور سنتے تھے۔اسی لیے وہ اپنی راہوں میں پڑنے والی جنتوں اور طوبیٰ کی چھاؤں سے زیادہ دیر تک معاملہ نہیں رکھ سکے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''میری خود روشاعری نے مجھے آگے بڑھانے میں بہت مدد کی۔لاہور کے اخبار ''زمزم'' اور اخبار ''مسلمان'' (بعد میں کوثر) میں میرے اشعار کثرت سے چھپتے تھے۔جس سے میں بحیثیت شاعر مشہور ومتعارف ہوا اور یہی تعارف مرکز اہلِ سنت امرتسر اور اخبار ''زمزم'' لاہور جانے کا سبب بنا اور یہی بمبئی جانے کا سبب بنا۔اس طرح میری شاعری نے مجھے بہت فائدہ دیا مگر اب اس سے میرا تعلق نہیں رہا۔معلوم نہیں میں نے اس سے بے وفائی کی یا اس نے مجھے اچھی راہ پر لگا کر خود کنارہ کشی کر لی''[1]

مولانا بچپن ہی سے ایسی موضوعاتی شاعری کرنے لگے تھے، جس سے ثابت ہونے لگا تھا کہ وہ روایتی اور تقلیدی تغزل اور عشق ومحبت کی دنیا سے الگ سوچ رکھتے ہیں۔ان کے یہاں زندگی کا نامیاتی تصور تھا۔اسی لیے وہ گل وبلبل اور بہار وخزاں کے پردے میں بھی زندگی کے سنگین حقائق کی طرف اشارہ کرنے والی شاعری کی نمائندگی کرتے تھے۔مولانا حسن فطرت سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کا سماجی شعور بہت تیز تھا۔وہ حساس تھے ہی ساتھ ہی ساتھ اپنی بات سیدھی سادی زبان میں کہنے کی قدرت بھی رکھتے تھے۔انھوں نے ''برسات کی چاندنی رات'' کے عنوان سے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک نظم کہی تھی، جس کا پس منظر خود انھوں نے بیان کیا ہے:

''مدرسہ کے طلباء جو اکثر قصبہ اور اطراف کی بستیوں کے ہوا کرتے تھے۔عصر کے بعد عیدگاہ پر جمع ہوتے تھے۔یہ بہت پر فضا جگہ ہے۔شمال میں سامنے سودی کا وسیع وعریض تالاب، عیدگاہ کے کچے صحن میں نیم کے درختوں کی قطار، جنوب میں تاحد نظر میدان اور آس پاس سرسبزی وشادابی، عجیب جاذبِ نظر اور دلکش منظر پیدا کرتی تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

1۔ قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔دائرۂ ملیہ مبارک پور۔۱۹۸۷ء (ص:۴۲-۴۳)

حافظ شیرازی کا ''کنار آب رکنا باد وگل گشت مصلیٰ'' یہیں پر آ گیا ہے اسی زمانہ میں 'برسات کی چاندنی رات' کے عنوان سے میں نے ایک نظم کہی تھی، جس میں یہ شعر بھی تھا:

دور کچھ یاں سے سمودی کے کنارے آم پر
اک پپیہا دے رہا تھا جان پیا کے نام پر[1]

موضوعات کے تنوع کی بات آ گئی ہے تو اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مولانا کی شاعری ان کے حسبِ حال بھی ہوتی تھی۔ وہ زندگی کے جن تجربات سے گزرتے تھے، اپنے قاری کو بھی اس میں شریک کر لینا چاہتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری کا رشتہ زندگی سے بہت گہرا اور مضبوط ہو گیا ہے۔ مولانا ۱۳۶۷ھ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرّس تھے۔ مگر اس مدرسہ کی ایک افسوس ناک صورت یہ تھی کہ سال میں کئی کئی مدرّسین کو ہٹا دیا جاتا تھا، جن میں بعض بہت اچھے اور صاحبِ صلاحیت مدرّسین بھی ہوتے تھے، یہ یہاں کی پرانی روش تھی۔ مولانا کو درمیانِ سال ہی میں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آئندہ یہاں آنا نہیں ہے۔ مولانا جب اس مدرسہ سے تعطیل کلاں شعبان ۱۳۶۷ھ میں وطن واپس آنے لگے تو انھوں نے مدرسہ والوں کی مذمت میں ایک شعر کہا جو یوں ہے:

خلوصِ سکنۂ گجرات تاجرانہ ہے
یہاں کے لوگ عموماً وفاشعار نہیں[2]

۱۳۶۳ھ میں مولانا نے جمال الدین افغانی کے بعض عربی رسالوں کا اُردو ترجمہ کیا۔ شباب کمپنی بمبئی (ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول السورتی تجار الکتب جا ملی محلّہ، بمبئی) کے لیے یہ ترجمہ کیا گیا تھا۔ مولانا نے معاوضہ کے سلسلہ میں انھیں پر فیصلہ چھوڑ دیا، جس پر انھوں نے خط میں یہ مصرع لکھا: ع

آپ نے اُلجھن میں اُلجھن ڈال

مولانا نے اس کے جواب میں لکھا:

ہم نواہوں میں بھی تیرا عندلیب
میں نے کیا اُلجھن میں اُلجھن ڈال دی[3]

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور۔ ۱۹۸۷ء (ص: ۴۵)

[2] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری۔ ضیاء الاسلام شیخو پور (ص: ۸۳) [3] ایضاً (ص: ۴۴-۴۵)

اسی طرح مولانا نے اپنے سات سالہ بیٹے انور جمال کے انتقال کے بعد کی ایک غزل میں انھوں نے نوحۂ ماتم کی شکل میں ایک شعر کہا، جس سے ان کی شفقتِ پدری اور بیٹے کی وفات پر رنجِ دلی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا کی غزل کا مطلع یہ ہے:

مجھ کو رنگیں خیال نے مارا
آرزوئے وصال نے مارا

اس غزل کے آخری شعر میں انور جمال کا نوحۂ وفات اس طرح ہے:

آہ میری حسیں امیدوں کو
میرے انور جمال نے مارا

مولانا کو انور جمال سے بے پناہ محبت تھی اور نفسِ شعر سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب کو بچہ کی ذہانت وصلاحیت سے مستقبل میں بڑی امیدیں تھیں مولانا ''کاروانِ حیات'' مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر (ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور، ضلع اعظم گڑھ) میں اپنے تاثرات کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''ابھی لاہور آئے بارہ تیرہ دن ہوئے تھے اور کام اچھی طرح قابو میں نہیں آیا تھا کہ گھر سے عزیزم انور جمال مرحوم کی بیماری کا خط آیا۔ وہ بچپن سے خنازیر کے خطرناک مرض میں مبتلا تھا اور اس زمانہ کی وسعت اور حیثیت کے لحاظ سے میں نے ہر طرح کا علاج کیا مگر اس میں کمی نہیں ہوئی۔ اسی حال میں چیچک نکل آئی اور آنتوں تک پھیل گئی۔ میں ۲۶؍جنوری ۱۹۴۵ء کی شام لاہور سے چل کر ۲۸؍جنوری کو دوپہر میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ انور جمال اور اس کا بڑا بھائی خالد کمال دونوں شدید چیچک میں مبتلا ہیں۔ انور جمال ۲۸؍فروری ۱۹۴۵ء کو انتقال کر گیا، اس وقت اس کی عمر سات سال کی تھی۔ خالد کمال اس لائق نہیں تھا کہ اپنے بھائی کے جنازہ میں شریک ہوسکے۔ یہ بچہ نہایت حسین وجمیل تھا۔ میں اس سے اور وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ بڑا نازک مزاج اور نفاست پسند تھا۔ مجھے اس کے انتقال کا بہت زیادہ غم ہوا''[1]

سطور بالا میں مولانا کی سوانح عمری اور ان کے اشعار کی روشنی میں جو کچھ کہا گیا ہے، اُس سے

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص:۵۵)

یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ مولانا اپنی شاعری کے لیے موضوع و مواد اپنی زندگی، اپنے گردوپیش کے حالات اپنے ذہنی وفکری محسوسات و تجربات سے حاصل کرتے تھے اور انسان، سماج اور تہذیب ان کے تجربے اور مطالعے کے تین دائرے تھے۔ قاضی صاحب کی شاعری کے مطالعہ کے لیے ہمیں ان تین عناصرِ ترکیبی پر پورے امعانِ نظر کے ساتھ اپنی توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ ان عناصر کی باہمی مفاہمت اور بامعنی ہم آمیزی سے ادب کا ایک جامع اور واضح عمرانی نظام، تربیت وتشکیل کے مرحلوں سے گزر کر تکمیل کو پہنچتا ہے۔ قاضی صاحب کی ابتدائی شاعری میں بھی اجتماعیت اور عمرانی نظام کا تصور وشعور اپنی رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے اور آگے چل کر اس تعلق کی نوعیت اور بھی نکھر گئی ہے۔

قاضی صاحب کے یہاں انسان، سماج اور تہذیب ان تینوں عناصر ترکیبی میں بڑا گہرا ربط وتعلق اور رشتۂ اخوت قائم ہے۔ ان کی شاعری میں یہ تینوں عناصر ایک دوسرے پر یکساں اثر ڈالتے ہیں۔ اس نے اس حقیقت کو بھی بے غبار کر دیا ہے کہ فرد اپنے عمل، اپنی تخلیق اور اپنے اندازِ نظر کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی شخصی، انفرادی اور نجی معلوم ہو لیکن اس کی شخصیت، اس کی سوچ، اس کی پسند سب کی سب سراسر نہیں تو غالب حد تک اجتماعیت کی پیداوار اور معاشرتی جدلیت ومیکانکیت کا حاصل ہوتی ہے۔

مولانا مدرسہ احیاء العلوم کی مدرّسی کے زمانے میں مالی اعتبار سے پریشاں خاطر تھے۔ مگر اس پریشاں خاطری میں بھی انھوں نے سلسلۂ شاعری کو جاری رکھا اور اس سے ان کی فکرِ سخن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس دور کے بارے میں مولانا اپنی فراغت کے بعد کے احوال ''کاروانِ حیات'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس دور میں تصنیفی وتالیفی ذوق کی تسکین نہ ہو سکی، نہ مضمون نگاری باقی رہ سکی۔ البتہ شعروشاعری اپنے پورے عروج پر تھی۔ تنگ دستی اور پریشاں خاطری میں فطری اور ذہنی پرواز میں کوتاہی نہیں آئی بلکہ اس میں تیزی اور توانائی آگئی''۔[1]

مولانا کی اس تحریر سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بعض لوگوں کی فطرت میں حوصلہ کی اتنی افزودگی اور مقابلہ کرنے کی ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ ان کی شاعری حالات کے جبر میں اور پروان چڑھتی ہے۔ آلام وتفکرات کے سائے شاعری کے حسن کو نکھار دیتے ہیں۔ جب شاعر سنگینیٔ حیات میں گھرا ہوا ہوتا ہے تو اس کے شعری وجدان کی نشوونما کے لیے مناسب ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب زندگی کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور حالات وزمانہ انسانی جدّ وجہد کا امتحان لینا شروع کر دیتے ہیں

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۴۵)

تو انسان کی خفیہ صلاحیتیں اور مخفی قوتیں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ کارگاہ حیات میں ہزاروں منزل وہم وگماں سے گزر کر خلدِ یقیں کو آباد کرنے اور اپنی امامت وقیادت کے مظاہرہ کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے اور وہ تمام راستے اپنانے لگتا ہے، جو تکمیلِ کائنات اور تزئینِ حیات کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ مولانا میں جو فعالیت اور تحریکی شعور تھا، اُس نے انھیں اپنی الگ راہِ عمل تلاش کرنے پر اُکسایا۔ یہی مولانا کی شخصیت کا اثبات، ان کے فکری کاموں کا اعتبار اور ان کی حیات مستعار کا جواز ہے۔

بڑی شاعری وسیع علم کے بغیر ممکن نہیں اور وسیع علم راہبانہ اور گوشہ نشین مزاج کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مولانا کو یہ دونوں حیثیتیں حاصل تھیں۔ انھوں نے علم وفن کے لیے بڑا ریاض کیا تھا۔ علم ومطالعہ کے میدان میں بڑی جاں کاہیاں جھیلی تھیں اور اپنی فرصتِ کار کو مثبت جہتیں دے کر انھوں نے کارآمد اور مفید بنایا تھا۔ اسی لیے ان کی شاعری میں صوفیانہ مراقبہ کی کیفیت اور اعتکافی ذہنیت ملتی ہے۔ مگر یہ تصورِ ذات بھی اپنے سماجی مسائل اور مدوجزرِ حیات سے کنارہ کش نہیں۔ ان کی ذہنی یکسوئی میں معالجاتی زندگی کی سوچ اور خاموشی شامل ہے، جو زندگی اور سماج کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے زہر کا تریاق ڈھونڈ رہی ہے۔

مولانا بہت زود گو شاعر تھے۔ وہ ذرا سی فکرِ سخن کے بعد اچھے شعر کہہ لیتے تھے اور ان کا کمال یہ تھا کہ ان کے اشعار کی زبان بہت سادہ وسلیس، عام فہم اور شیریں ہوتی تھی۔ مولانا کی شاعری کو مبارک پور کے عوام میں بڑا حسن قبول حاصل تھا، آئے دن جلسوں کے لیے ملی، قومی، سیاسی اور مذہبی نظمیں ان سے کہہ کر لکھوائی جاتی تھیں۔ جب ۱۰؍۱۱؍۱۲؍ جون ۱۹۴۰ء کو جامع مسجد احیاء العلوم کے سنگِ بنیاد کے سلسلے میں سہ روزہ اجلاس ہوا اور مسجد کی تعمیر کا چندہ مولانا شکر اللہ صاحب کی قیادت میں ہونے لگا تو لوگوں میں بے انتہا جوش پیدا ہوا۔ اجتماعی انداز میں چندہ کی نظمیں پڑھنے کے لیے مولانا سے کلام کی خواہش کا اظہار ہونے لگا، چوں کہ نظم خوانوں کی کئی پارٹیاں تھیں اور سب کو موقع کی مناسبت سے کلام کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس لیے مولانا کو ایک ایک دن میں چار چار پانچ پانچ نظمیں کہنی پڑتی تھیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

> ''اس وقت میری شاعری جنون کی حد تک پہنچ گئی، اشعار الہتے تھے۔ بعض اوقات چاروں طرف سے مجمع مجھے گھیر کر کہتا کہ ابھی ایک نظم کہو، فلاں صاحب کے یہاں چندہ میں پڑھنی ہے اور میں اسی حالت میں اشعار کہتا، جو فوراً پڑھے جاتے تھے اور روپیہ برسنے لگتا تھا۔ مولانا شکر اللہ صاحب بھرے مجمع میں خوب خوب تشجیع فرماتے تھے''۔[۱]

---

[۱] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور۔ ۱۹۸۷ء (ص: ۴۱)

مولانا کی شاعری نے اس کم عمری کے زمانے میں خدمت دین کی جو روایت قائم کی، اس کی مثال مشکل سے کہیں اور نظر آئے گی۔ ان کی شاعری نے دین و دانش کے چراغ روشن کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے اس طرح کی شاعری کی بھی وہی اہمیت ہے، جو راہِ حق میں کام کرنے والوں کا نعرہ ہوا کرتی ہے۔

اس دور میں مولانا کے کلام کو رسائل میں بھی جگہ ملنے لگی تھی۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا کی پہلی نظم "مسلم کی دعا" کے عنوان سے ماہ نامہ "الفرقان" بریلی میں پھر یہی نظم "نالۂ طہر" کے زیرِ عنوان ماہ نامہ "قائد" مرادآباد میں چھپی اور یہ زمانہ علی الترتیب مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اور جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) مرادآباد میں مولانا کی طالب علمی کا تھا۔ اس کے بعد مولانا کی غزل "اسرار" کے عنوان سے سہ روزہ "زمزم" لاہور کے ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۰ء کے شمارہ میں پہلی بار شائع ہوئی۔ "زمزم" کے علاوہ مولانا کا کلام "مدینہ" بجنور، "مسلمان" لاہور، "کوثر" لاہور، روز نامہ "جمہوریت" بمبئی، روز نامہ "ہندوستان" بمبئی، روز نامہ "انقلاب" بمبئی، ماہ نامہ "البلاغ" بمبئی، اخبار "الجمعیۃ" دہلی، "الانصار" بہرائچ میں نمایاں طور پر شائع ہوتا رہا۔ یہ سب اخبار و رسائل اپنے اپنے دور کے اہم اخبار و رسائل سمجھے جاتے تھے اور آج بھی صحافت کی تاریخ میں ان اخبار و رسائل کی خدمات قابلِ ذکر سمجھی جاتی ہیں۔

ان اخبار و رسائل میں مولانا کے مختلف اصنافِ سخن کی نمائندگی کرنے والے کلام چھپتے تھے۔ غزلیں، نعتیں، قومی و سیاسی نظمیں مولانا کی پسندیدہ اصنافِ شاعری تھیں۔ ان اصناف میں وہ پوری شاعرانہ لگن اور جذبے کی تڑپ کے ساتھ اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار فرماتے تھے۔

مولانا اُس وقت لاہور گئے جب وہ ایک شاعر کی حیثیت سے رسالوں اور اخباروں میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ لاہور ان کے خوابوں کی سرزمین تھا۔ اس شہر میں علم و ادب سے تعلق رکھنے والی قدآور شخصیتیں بھی تھیں اور اُردو کے بلند پایہ رسائل و جرائد بھی یہاں سے اشاعت پذیر ہوتے تھے۔ ان میں سے "نیرنگِ خیال"، "ادبی دنیا" اور "ادبِ لطیف" مدرسہ میں بھی آتے تھے، وہ انھیں اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے اور ان کے ذریعہ اُردو شعر و ادب میں پیدا ہونے والی نئی کروٹوں سے وہ آگاہی حاصل کرتے تھے۔ زبان و بیان اور سوچنے سمجھنے میں دبے قدموں سے جو تغیر آرہا تھا، اس سے واقفیت کے لیے ان رسائل کی اہمیت تھی اور انھوں نے ان رسائل و جرائد کے مطالعہ سے ادب کی ان قدروں کو فروغ دیا جو مغربی علوم سے متاثر تھیں۔ ان سے مولانا کے ادبی ذوق میں جلا پیدا ہوئی۔ انھیں نئے سانچوں، نئے

...سالوں نئے زاویۂ نگاہ، نئے طرزِ اسلوب، نئے موضوعات وخیالات کو سمجھنے میں ان رسالوں سے بڑی مدد ملی تھی اور ان کے ذہن میں کشادگی آئی تھی۔ جس کا اظہار ان کے کلام میں بھی ہونے لگا تھا۔

لاہور میں ان کے احباب کا ایک حلقہ بھی پیدا ہو گیا تھا، جو شعر وادب سے دلچسپی رکھتا تھا اور اردو شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کرنے کی فکر میں تھا۔ علامہ انور صابری، مولانا محمد عثمان فارقلیط، احسان دانش، علامہ تاجور نجیب آبادی، ظفر ملتانی، عشرت کرت پوری، اظہار اثر کرت پوری، سردار ہربنس سنگھ باغی، شیو پرساد بہار لکھنوی سے مولانا کے گہرے مراسم تھے۔ آخر کے چاروں شاعر اکثر مولانا کے ساتھ رہتے تھے۔ لمحاتِ فرصت میں شعری محفل جم جاتی تھی۔ اس طرح مولانا کے تخلیقی ذوق کو مہمیز ہوتی اور وہ زیادہ دلچسپی کے ساتھ شاعری کو اپنے علم ووجدان کی دولتیں دینے لگتے تھے۔ احسان دانش سے تو وہ چند برس پہلے ہی واقف ہو چکے تھے اور ان کے طرزِ سخن سے بھی متاثر ہو گئے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> "قیامِ مبارک پور کا زمانہ میری شاعری کے شباب کا زمانہ ہے۔ غزلیں اور نظمیں خوب کہتا تھا۔ تغزل میں اصغر گونڈوی مرحوم سے زیادہ متاثر تھا۔ ان کے دونوں دیوان "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" مطالعہ میں رہ چکے تھے۔ نظموں میں احسان دانش کا تتبع کیا۔ اسی کے ساتھ سیاسی نظمیں بھی کہتا تھا۔"[1]

مولانا احسان دانش سے متاثر تھے اور اپنی نظموں میں انھیں کے انداز وموضوعات سے استفادہ کرتے تھے۔ مگر اس وقت مولانا کا کلام ضائع ہو جانے کی وجہ سے اُن کی سیاسی وقومی اور دوسری موضوعاتی نظمیں پیشِ نظر نہیں ہیں کہ ان کا تفحص وتجزیہ کر کے اُن اثرات ومعکوسات کی نشاندہی کی جائے۔ مگر ایک دور ایسا بھی گزرا تھا، جب ہمارے ضلع اعظم گڑھ کے ذہن ودماغ پر جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی اور احسان دانش چھائے ہوئے تھے اور ان کا جادو کام کر رہا تھا۔ جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی عموماً اعظم گڑھ زیادہ آتے جاتے رہتے تھے۔ اس لیے یہ دونوں ایک طرح سے یہاں کے لیے گھر کے شاعر بن چکے تھے۔ احسان دانش غریب، مزدور اور افلاس زدہ زندگی کے مسائل وشدائد، ان کے خوابوں اور تمناؤں کی شکست وریخت، حالات کے جبر واستبداد، طبقاتی ومعاشی آویزش، سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیردارانہ وزمیندارانہ تسلط سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بناتے تھے اور ان موضوعات پر اُن

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۴۸)

کی نظموں کو بڑی مقبولیت بھی حاصل تھی۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب مبارک پور اور اطراف کی لڑکیاں شادی کے بعد میکے سے رخصت ہوتی تھیں تو سہیلیاں اور بہنیں وغیرہ احسانؔ دانش کی ''جشنِ بیچارگی'' کو اپنے المیہ ترنم اور حزنیہ لے میں سناتی تھیں اور اس طرح گھر میں ایک نمناک فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ اس نظم میں ایک ایسے مفلس مزدور کی بیٹی کی رخصتی کا منظر تھا جو اپنی غریبی کی وجہ سے داماد کو آرائش و آسائش کے سامان اور جہیز کے اسباب فراہم نہیں کر سکا تھا، مگر بیٹی کی ذہنی تربیت ایسی کر دی تھی کہ وہ گھر کو جنت کا نمونہ بنانے کی پوری اہلیت و صلاحیت رکھتی تھی، رخصتی سے پہلے لڑکی کا باپ اپنے داماد کو اطمینان دلانا چاہتا ہے کہ میری بیٹی کو جو روکھی سوکھی مل جائے گی، وہ اس کو نعمتِ کونین سے کم نہیں سمجھے گی اور ہمیشہ صبر و شکر کا پیکر بن کر رہے گی، کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے گی۔ جب مفلس باپ اپنے داماد سے لڑکی کے بارے میں اس کی عملی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہے کہ بیٹا میری بیٹی تمھاری خوشی کو اپنی زندگی کی پونجی سمجھے گی اور کبھی تم کو اپنی روش سے تفکرات و رنج کی بلا خیز لہروں میں نہیں پھینکے گی اس کے بعد جب اپنی زبان پر وہ یہ شعر لاتا ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے اور ایک حساس انسان کی آنکھوں سے اس بیچارگی پر بے ساختہ آنسوں نکل پڑتے ہیں:

اس کی بھی رضا ہوگی تمھاری جو رضا ہو
تم اس کے لیے دوسرے درجے پہ خدا ہو

مولانا ایک دوسری جگہ احسانؔ دانش کے اثرات اور بعد میں ان سے تعلقات کی نوعیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان (مولانا محمد عثمان فارقلیط) کے بعد سب سے زیادہ تعلق حضرت احسانؔ دانش سے تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں مرادآباد کے ایک ادبی رسالہ میں ان کی غزل چھپی تھی جس کا مطلع یہ تھا:

احسان وہ دن یاد آتے ہیں، جب کیف تھا حاصل جینے میں
آنکھوں میں تبسم رقصاں تھا، ارمان بھرے تھے سینے میں

اس پوری غزل کو میں نے بار بار پڑھا اور اس سے متاثر ہوا۔ اس کے چند مہینے کے بعد شبلی کالج اعظم گڑھ میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا، جس میں احسانؔ دانش بھی آئے تھے۔ میں اسی سال فارغ ہوا تھا۔ دوستوں کے ساتھ مشاعرہ سننے کے لیے گیا، جس میں انھوں

نے اپنے خاص ترنم اور مخصوص انداز میں ''جشن بیچارگی'' سنائی۔ جس میں ایک مزدور کی لڑکی کی رخصتی کا منظر تھا۔ یہ ان کی خاص نظم تھی، جس کو سامعین کے اصرار پر دوبارہ سنایا۔

ایک غزل بھی پڑھی جس کا مطلع یہ تھا:

پرسش غم کا شکریہ کیا تجھے آگہی نہیں
ترے بغیر زندگی درد ہے، زندگی نہیں

اس نظم اور غزل کو سن کر ہم لوگوں نے وہیں ان کی دو کتابیں ''نوائے کارگر'' اور ''آتشِ خاموش'' خریدی اور لاکر خوب خوب ان کو سنتے سناتے تھے۔ مناظرِ قدرت کی عکاسی، تشبیہات، اشارات، کنایات، اور تمثیلات ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ میں ان سے متاثر بلکہ مرعوب تھا''[1]

احسانؔ دانش سے لاہور میں مولانا انور صابری نے جو اُردو کے اہم قومی وسیاسی زودگو شاعر تھے مولانا کو اچھے تعارف کے ساتھ ملایا تھا۔ بعد میں احسانؔ صاحب کے ساتھ مولانا کے اس تعلق میں اتنا اخلاص اور استحکام آ گیا کہ جب تک یہ احسانؔ دانش کے یہاں کئی بار نہ ہو آتے تسکین نہیں ہوتی تھی۔ دن میں جب بھی موقع ملتا احسانؔ کے یہاں ہو آتے اس کے علاوہ بھی یہ معمول تھا کہ رات کو مزنگ گندم منڈی میں احسانؔ صاحب کے یہاں یہ لوگ جمع ہوتے اور گیارہ بجے وہاں سے واپس آتے۔ انارکلی بازار کے شمالی سرے پر گنپت روڈ میں ان کا مکتبۂ دانش تھا۔ جہاں احسانؔ دانش دن میں اکثر موجود رہتے تھے۔ انھوں نے اس دُوکان میں لکھنے پڑھنے کا انتظام کیا تھا۔ مولانا احسانؔ دانش سے پہلے ہی سے متاثر تھے۔ لیکن جب لاہور میں تعلقات ذاتی حیثیت سے مزید گہرے اور مخلصانہ ہو گئے تو مولانا کے فکروخیال پر دانش کے شاعرانہ اثرات اور گہرائی کے ساتھ پڑنا شروع ہو گئے۔ اس مجموعہ میں ایک دو نظمیں ایسی ہیں جن سے اس تاثر کا پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے ان نظموں کی فضابندی، منظرکشی اور مناظرِ قدرت کی عکاسی میں دانش کے خرمنِ فکروخیال کی خوشہ چینی کی ہے اور ان کے انداز واسلوب سے فائدہ اٹھایا ہے۔

قیامِ لاہور کی مدت مختصر ضرور ہے، مگر ان کے مزاج کی تشکیل میں بہت اہم ہے۔ مولانا نے لاہور سے بہت کچھ حاصل کیا۔ ان عناصر خمسہ (۱: مولانا قاضی اطہرؔ، ۲: عشرت کرت پوری، ۳: اظہار اثر کرت پوری، ۴: سردار ہربنس سنگھ باغیؔ، ۵: شیو پرساد بہارؔ لکھنوی) کے ظہورِ تربیت سے جو ایک علمی وشعری

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۶۳)

حلقہ بن گیا تھا، اس نے مولانا کو بنانے اور سنوارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان لوگوں کی صحبت میں شعروشاعری کا چرچا، انداز و معیارِ شاعری پر تبادلۂ خیالات، زندگی اور شاعری کے رشتوں پر مباحثے، فن اور شخصیت کی ہم آہنگی پر گفتگو، شاعروں کے قدیم و جدید دبستانوں کے تذکرے ان کے ادبی ذوق کی نشو ونما اور ذہنی پھیلاؤ کے لیے بہت معاون ثابت ہوئے۔ اگر اس دور کی غزلیں اور نظمیں ضائع نہ ہو گئی ہوتیں تو آج اُن سے بہت سی اہم اطلاعات فراہم ہو سکتی تھیں اور مولانا کی شاعری کے ایسے کئی پہلوؤں پر بحث ہو سکتی تھی، جن سے ان کی ذہنی وفکری جہات پر بھرپور روشنی پڑتی۔

اوپر کے حوالے سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مولانا غزلوں میں اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ء-۱۹۳۶ء) کے رنگِ تغزل سے متاثر ہوئے اور ان کی غزلوں کے مجموعے ''نشاطِ رُوح'' اور ''سرودِ زندگی'' ان کے مطالعہ میں رہ چکے تھے۔ اصغر گونڈوی کی شاعری میں اُسلوب بیان کی جو انفرادیت نمایاں ہے۔ اُس میں جذبات وخیالات کو ایک خاص انداز میں پیش کرنے کا ہنر چھپا ہوا ہے۔ ان کی آواز میں دھیما پن اور سنجیدگی ہے۔ ان کے یہاں شوروشیون اور نالہ و ماتم نہیں۔ عشق کی آگ ان کے سینے میں لگی ہوئی ہے مگر اس کی آنچ میں بھی ایک خاص قسم کی لذّت اور انفرادی رنگ ہے۔ وہ تصوف کی دنیا کے صنم کدوں کو اپنی شاعری میں اس طرح جگہ دیتے ہیں کہ اُن سے ایک خاص انداز کا رنگ پیدا ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، جس نے ان کے سوز وگداز کو نازک طبیعتوں کی چیز بنا دیا ہے۔ اصغر کی ہلکی ہلکی اور لطیف شاعری میں ستارۂ سحری کے نور اور خاکسترِ پروانہ کا حسن موجود ہے۔

مولانا کے کلام میں جو جذبہ وتاثر کی زیریں لہریں اور ان کے تغزل میں غزلیہ اُسلوب والفاظ کی جو رعنائیاں اور رنگینیاں اپنے رنگ تماشا کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ اصغر کے اُسلوب کے بہت قریب ہے۔ ان کے یہاں بھی تصوف کے جلوے اور کائناتِ دل کے منظر ہیں۔ مگر وہ زندگی سے فرار اور ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے کا جذبہ ظاہر نہیں کرتے۔ وہ زندگی کو ہر حال میں سینے سے لگائے رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے تصوف کے حرکی اور عملی پہلو سے شاعری کے تانے بانے حاصل کیے ہیں۔ انھوں نے زندگی سے فلسفیانہ آگہی اور کائناتِ دل کا عرفان حاصل کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ ایسے مقام پر یہ سوالیہ لہجہ اختیار کر لیتے ہیں:

بتائیں سوئے محمل بے تحاشہ دوڑنے والے
جرس کیا ہے، منزل کون، صحرا کی ہوا کیا ہے؟

زمانہ بھر کے پُر ہنگام شور و شر کے دیوانو!
سنو بھی کان رکھ کر ''وقت'' کے دل کی صدا کیا ہے؟
نگاہِ انقلاب اکثر لرزتی ہے جہاں آکر
اس ہنگامِ تباہی میں سکوں کا آسرا کیا ہے؟

مولانا اپنے دینی تقشف کے باوجود زاہدِ خشک نہیں تھے۔ اُن کے یہاں زندہ دلی اپنے حدودِ اربعہ میں تھی۔ وہ دوستوں میں دوست اور نو واردین میں طبیعت دار تھے۔ اُن کے یہاں بے تکلفی اپنے صحیح تناظر میں تھی۔ وہ مشاعروں اور نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ بمبئی کے ابتدائی دور قیام میں بھی تھا۔ مگر ان کی علمی شہرت کی وجہ سے جب مشاعروں کی شرکت، علمی و تحقیقی کاموں پر اثر انداز ہونے لگی تو مولانا کو شعر و شاعری سے بھی دور ہو جانا پڑا۔ ترکِ شاعری کا ایک خاص اور بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مولانا ایک بار بمبئی سے اپنے گھر واپس آرہے تھے، جب ٹرین سے اُترے تو اپنی اٹیچی ٹرین ہی میں بھول گئے، جن میں ''رجال السند والہند'' کے مسوّدہ کے ساتھ ان کی دو بیاضیں بھی تھیں۔ قاضی ظفر مسعود کا بیان ہے کہ ابا ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کے ساتھ کچھ دور تک دوڑے اس کے بعد بار بار وہ اپنے ان گم شدہ اسباب کا ذکر کرتے تھے۔ جس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ انھیں بیاض کے چلے جانے کا بے پناہ غم تھا۔ قاضی صاحب کی موٹی موٹی دو بیاضیں تھیں، جو ضائع ہو گئیں، ان میں ان کا تقریباً سارا کلام تھا۔ بعد میں مولانا نے یہ کہہ کر شاعری سے بالکل ترکِ تعلق کر لیا کہ جب جوانی کا کلام ضائع ہو گیا جو میری علمی و ادبی زندگی کا بہترین سرمایۂ فکری تھا تو اب شاعری سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ بعد میں مولانا نے اِدھر اُدھر سے اپنا کلام جمع کر کے ایک بیاض تیار کر لی تھی۔ جس کے بارے میں مولانا اسیرادروی بتاتے ہیں کہ ان کے پاس ایک ضخیم مجموعہ کلام تھا[1] اس میں ابتدائی دور سے لے کر آخری دور تک کا کلام ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ جس بیاض میں سارا کلام تھا، وہ بہت پہلے ضائع ہو گئی۔

مولانا نے کئی جگہ اپنی شاعری کے تعلق سے اظہارِ خیال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی سیاسی نظمیں بھی ان کے موضوعات کے دائرے میں تھیں۔ مگر اس نوع کا کلام اب دستیاب نہیں اور یہ بھی علم نہیں کہ کس طرح یہ سرمایہ تلف ہوا؟ مولانا کے موضوعاتِ سخن اور رنگِ شاعری کے بارے میں ان کے رفیقِ علمی اسیرادروی کا بیان ہے کہ:

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلہ ترجمان الاسلام بنارس (ص: ۴۱)

''قاضی صاحب کے علمی سفر کا آغاز مذہبی و اصلاحی شاعری سے ہوا یہ طالب علمی کا دور تھا۔...... آزادی کی ساعت قریب آتی جارہی تھی۔ اس وقت ان کی نظموں کا تیور کچھ اور تھا اور آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو قیامت گزری اس وقت کا درد و کرب، غم و یاس، احساسِ مظلومی و بیچارگی ان کی نظموں پر چھا گیا۔ آزادی کے فوراً بعد وہ بہرائچ چلے گئے۔ وہاں سے ہفتہ وار ''الانصار'' جاری کیا۔ اس میں جتنی نظمیں شائع ہوئیں اس میں بلا استثناء ہر ایک میں وہی درد و کرب رچا بسا ہوا ہے۔ چار پانچ برسوں کے بعد حالات میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا اور امید کی کرنیں کچھ نظر آنے لگیں تو ان نظموں میں اس کیفیت کا عنصر شامل ہو گیا''[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا کی شاعری نے ہر دور میں حالات زمانہ کا ساتھ دیا ہے اور ان کے فکر و فن میں روحِ عصر کی بڑی کارفرمائی ہے۔ لیکن اب ہم کوئی تجزیہ پیش کرنے، ان کی ہر دور کی شاعری کا محاکمہ کرنے کی پوزیشن میں اس لیے نہیں ہیں کہ اس وقت مولانا کی تمام شاعری ہمارے سامنے نہیں ہے اور ان کی قومی و سیاسی اور دوسری نوع کی نظموں اور عہدِ جوانی کی غزلوں کا بڑا حصہ دست بردِ زمانہ کی نذر ہو چکا ہے۔ مولانا کے جو کلام سہ روزہ ''زمزم'' لاہور، ''مسلمان'' لاہور، ''احسان'' لاہور، ہفتہ وار ''الانصار'' بہرائچ، روزنامہ ''جمہوریت'' بمبئی، روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی، ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی، ''مدینہ'' بجنور، ماہنامہ ''الفرقان'' بریلی، ماہ نامہ ''قائد'' مرادآباد اور روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے وہ سب بھی بکھرے ہوئے ہیں اور موجودہ حالات میں ان سب تک ہماری رسائی بہت مشکل ہے۔

مختلف ذرائع اور جدوجہد سے جو کچھ حاصل ہو سکا ہے اس سے یہ بات متبادر ہے کہ جدوجہد آزادی کے سلسلے میں، یا ہندوستانی قوم و معاشرہ کی عکاسی کرنے والی جو قومی و سیاسی نظمیں کہیں ان کے بیشتر حصے ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔ خود مولانا کی تحریر سے بھی اس نوع کی شاعری کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''(۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا) یہ دور ہندوستانی سیاست میں بڑا ہنگامہ خیز گزرا ہے۔ دوسری جنگ عظیم جاری تھی، ہندوستان کی آزادی کا عمل تیز تر ہو رہا تھا، پورا ملک فسادات

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلہ ترجمان الاسلام بنارس (ص: ۷۲)

اور سیاسی ہنگاموں کی رزم گاہ بنا ہوا تھا اور یہ دور میری مدرسی (احیاء العلوم مبارک پور میں) کا ہے، جس میں پندرہ اور اٹھارہ روپے میں گزر کرنا پڑا۔ گھریلو پریشانی الگ تھی، اس میں میری شاعری کا شباب تھا۔ غزلوں میں ذاتی رجحانات کی عکاسی ہوتی تھی اور نظموں میں تحریکِ آزادی کا رنگ ہوتا تھا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک میری غزلیں اور نظمیں سہ روزہ ''زمزم'' لاہور اور سہ روزہ ''مسلمان'' اور بعد میں ''کوثر'' لاہور میں مستقل طور سے شائع ہوتی تھیں۔ کئی غزلیں اور نظمیں ''مدینہ'' بجنور میں بھی شائع ہوئیں۔''[1]

ولانا کے اس بیان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں تحریکِ آزادی اور اپنے دور کے سائل کو موضوعِ سخن قرار دے رکھا تھا اور اس طرح شاعری کو زندگی کے دل کی دھڑکنوں سے قریب کر دیا تھا۔ ویسے بھی مولانا جس حساس طبیعت اور بیدار ذہن کے تخلیقی صلاحیتوں کے ادیب و شاعر تھے۔ ن کے ہوتے ہوئے یہ اپنے دور کی کروٹوں، امنگوں اور خوابوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ نہ امد ذہن کے تھے، نہ تقلیدی مزاج رکھتے تھے، ان میں اجتہادی شان تھی۔ ان میں وہ ذہانت موجود تھی لالۂ وگل سے ہم کلام ہو سکتی تھی۔ وہ روحِ عصر کو اپنی فکر کی بنیاد بنانے کا گر اچھی طرح جانتے تھے۔ یں زندگی کی کارگہ شیشہ گری میں نازک کام کو نپٹا دینے کے سارے ہنر معلوم تھے۔ ان کے یہاں زندگی سوز ساز، درد وداغ سب کچھ موجود ہے۔

مولانا قاضی اطہر جن دنوں لاہور میں قیام پذیر تھے اور اخبار ''زمزم'' کی ادارت سے منسلک ے۔ اس وقت لاہور میں بہت بڑے پیمانے پر انتہائی بھیانک ہندو مسلم فساد برپا ہو گیا تھا۔ ہر طرف آگ رخون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ انسان انسان کا دشمن تھا، اخوت و یگانگت کے سارے رشتے ختم ہو چکے ے، شاحتِ ہمسایہ کا وقت آ گیا تھا، ذہن ودل سے اعتماد ویقین ختم ہو چکا تھا۔ مولانا ان ایام میں بھی متحدہ میت کا درد دل میں سنبھالے ہوئے تھے اور قوم کی بربادی کا افسانہ شعری زبان واسلوب میں لکھ رہے ، انہیں ہندو مسلم منافرت پر شدید ذہنی اذیت پہنچی تھی۔ وہ اس دور میں ہندو مسلم اتفاق واتحاد کے لیے ات کہہ رہے تھے خود مولانا کا بیان ہے کہ:

''اس وقت لاہور میں (یعنی ۳ر مارچ ۱۹۴۷ء کو) نہایت شدید قسم کا ہندو مسلم فساد برپا ہو گیا تھا اور کئی دن تک قدیم شہر کا شمال مشرقی حصہ قتل وغارت اور آتش زنی کی آماجگاہ

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۴۵)

''قاضی صاحب کے علمی سفر کا آغاز مذہبی و اصلاحی شاعری سے ہوا یہ طالب علمی کا دور تھا۔۔۔۔۔آزادی کی ساعت قریب آتی جارہی تھی۔ اس وقت ان کی نظموں کا تیور کچھ اور تھا اور آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو قیامت گزری اس وقت کا درد وکرب، غم و یاس، احساسِ مظلومی و بیچارگی ان کی نظموں پر چھا گیا۔ آزادی کے فوراً بعد وہ بہرائچ چلے گئے۔ وہاں سے ہفتہ وار ''الانصار'' جاری کیا۔ اس میں جتنی نظمیں شائع ہوئیں اس میں بلا استثناء ہر ایک میں وہی درد وکرب رچا بسا ہوا ہے۔ چار پانچ برسوں کے بعد حالات میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا اور امید کی کرنیں کچھ نظر آنے لگیں تو ان نظموں میں اس کیفیت کا عنصر شامل ہوگیا'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا کی شاعری نے ہر دور میں حالات وزمانہ کا ساتھ دیا ہے اور ان کے فکر وفن میں روحِ عصر کی بڑی کار فرمائی ہے۔ لیکن اب ہم کوئی تجزیہ پیش کرنے اور ان کی ہر دَور کی شاعری کا محاکمہ کرنے کی پوزیشن میں اس لیے نہیں ہیں کہ اس وقت مولانا کی تمام شاعری ہمارے سامنے نہیں ہے اور ان کی قومی وسیاسی اور دوسری نوع کی نظموں اور عہدِ جوانی کی غزلوں کا بیشتر حصہ دست بردِ زمانہ کی نذر ہو چکا ہے۔ مولانا کے جو کلام سہ روزہ ''زمزم'' لاہور، ''مسلمان'' لاہور، ''کوثر'' لاہور، ہفتہ وار ''الانصار'' بہرائچ، روزنامہ ''جمہوریت'' بمبئی، روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی، ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی، ''مدینہ'' بجنور، ماہنامہ ''الفرقان'' بریلی، ماہ نامہ ''قائد'' مرادآباد اور روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے وہ سب بھی بکھرے ہوئے ہیں اور موجودہ حالات میں ان سب تک ہماری رسائی بہت مشکل ہے۔

مختلف ذرائع اور جدوجہد سے جو کچھ حاصل ہوسکا ہے اس سے یہ بات متبادر ہے کہ جدوجہد آزادی کے سلسلے میں، یا ہندوستانی قوم ومعاشرہ کی عکاسی کرنے والی جو قومی وسیاسی نظمیں تھیں ان کے بیشتر حصے ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔ خود مولانا کی تحریر سے بھی اس نوع کی شاعری کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''(۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک کا) یہ دور ہندوستانی سیاست میں بڑا ہنگامہ خیز گزرا ہے۔ دوسری جنگ عظیم جاری تھی، ہندوستان کی آزادی کا عمل تیز تر ہو رہا تھا، پورا ملک فسادات

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر، مجلہ ترجمان الاسلام بنارس (ص: ۲۷)۔

اور سیاسی ہنگاموں کی رزم گاہ بنا ہوا تھا اور یہ دور میری مدرسی (احیاء العلوم مبارک پور میں) کا ہے، جس میں پندرہ اور اٹھارہ روپے میں گزر کرنا پڑا۔ گھریلو پریشانی الگ تھی، اس میں میری شاعری کا شباب تھا۔ غزلوں میں ذاتی رجحانات کی عکاسی ہوتی تھی اور نظموں میں تحریکِ آزادی کا رنگ ہوتا تھا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک میری غزلیں اور نظمیں سہ روزہ ''زمزم'' لاہور اور سہ روزہ ''مسلمان'' اور بعد میں ''کوثر'' لاہور میں مستقل طور سے شائع ہوتی تھیں۔ کئی غزلیں اور نظمیں ''مدینہ'' بجنور میں بھی شائع ہوئیں''۔[1]

مولانا کے اس بیان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں تحریکِ آزادی اور اپنے دور کے مسائل کو موضوعِ سخن قرار دے رکھا تھا اور اس طرح شاعری کو زندگی کے دل کی دھڑکنوں سے قریب کر دیا تھا۔ ویسے بھی مولانا جس حساس طبیعت اور بیدار ذہن کے تخلیقی صلاحیتوں کے ادیب و شاعر تھے۔ اس کے ہوتے ہوئے یہ اپنے دور کی کرتوتوں، امنگوں اور خوابوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ نہ جامد ذہن کے تھے، نہ تقلیدی مزاج رکھتے تھے، ان میں اجتہادی شان تھی۔ ان میں وہ ذہانت موجود تھی جو لالۂ وگل سے ہم کلام ہو سکتی تھی۔ وہ روحِ عصر کو اپنی فکر کی بنیاد بنانے کا گر اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں زندگی کی کارگہ شیشہ گری میں نازک کام کو نپٹا دینے کے سارے ہنر معلوم تھے۔ ان کے یہاں زندگی کا سوز ساز، درد و داغ سب کچھ موجود ہے۔

مولانا قاضی اطہر جن دنوں لاہور میں قیام پزیر تھے اور اخبار ''زمزم'' کی ادارت سے منسلک تھے۔ اس وقت لاہور میں بہت بڑے پیمانے پر انتہائی بھیانک ہندو مسلم فساد برپا ہو گیا تھا۔ ہر طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ انسان انسان کا دشمن تھا، اخوت و یگانگت کے سارے رشتے ختم ہو چکے تھے، شماتتِ ہمسایہ کا وقت آ گیا تھا، ذہن و دل سے اعتماد و یقین ختم ہو چکا تھا۔ مولانا ان ایام میں بھی متحدہ قومیت کا درد دل میں سنبھالے ہوئے تھے اور قوم کی بربادی کا افسانہ شعری زبان و اسلوب میں لکھ رہے تھے۔ انہیں ہندو مسلم منافرت پر شدید ذہنی اذیت پہنچی تھی۔ وہ اس دور میں ہندو مسلم اتفاق و اتحاد کے لیے قطعات کہہ رہے تھے خود مولانا کا بیان ہے کہ:

''اس وقت لاہور میں (یعنی ۳؍ مارچ ۱۹۴۷ء کو) نہایت شدید قسم کا ہندو مسلم فساد برپا ہو گیا تھا اور کئی دن تک قدیم شہر کا شمال مشرقی حصہ قتل و غارت اور آتش زنی کی آماجگاہ

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخو پور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۴۵)

بنا رہا۔ اس وقت صرف روزنامہ ''زمزم'' کسی طرح چھپتا تھا کیوں کہ
بھائی گیٹ کا علاقہ نسبتاً محفوظ تھا، میں ''زمزم'' میں اتحاد و اتفاق کے لیے
قطعات لکھتا تھا۔'' [۱]

لیکن اب یہ فرقہ وارانہ یکجہتی اور متحدہ قومیت کے تصور و جذبات کو فروغ دینے والے قطعات بھی ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ اس لیے ان پر بھی اظہار خیال کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی اتنی بات معلوم ہے کہ مولانا اپنے ذہن ومزاج اور شعر وسخن کے حوالے سے قیامت کی ان گھڑیوں میں بھی جب مثبت قدروں کا احیاء اور مشترکہ تہذیب وتمدن کے رشتوں کی تلاش ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگئی تھی، اپنے دل کے داغ سے روشنی پیدا کرتے رہے اور اس بحرانی دور کے اس مطالبے پر کہ: ع

چراغ دل کے جلاؤ کہ روشنی کم ہے

وہ اپنے نوکِ قلم سے صبحِ نظر کی کرنیں پھیلاتے رہے۔ وہ وقت کے کربلا میں کھڑے ہوکر زندگی کا منظر نامہ بدلنے کی کوشش میں لگے رہے۔ یہ ان کی ذہن سازی، شخصیت گری اور فکر آفرینی کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ اس لیے مولانا کے فکر کی اہمیت اور ان کی خدمات کا اثبات اور ان کی شاعری کا جواز قابلِ ذکر ہے۔

پورے اعتماد و یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی وہ شاعری جو اپنے آثار کھو چکی ہے اپنے دور کی سچی ترجمان اور اپنے گرد وپیش کی زندگی کی بہترین عکاس تھی۔ ان کا کلام زندگی کی تنقید بھی تھا اور زندگی کی تفسیر بھی، وہ جذباتِ انسانی کی تصویر بھی تھا اور خوش آئند زندگی کی تعبیر بھی۔ ان کے لفظوں میں، ان کے اشعار میں، ان کی شاعری کے زیر وبم میں وقت کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی تھی۔ اسی لیے اس کو شعری وفنی حلقوں میں قبولِ عام حاصل ہورہا تھا۔ ان کے فکر وفن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا تھا۔ ان کی شاعری کو عوام کے ہر طبقے میں پسند کیا جارہا تھا۔ مولانا اپنے ہم عصر شعراء میں حفیظ جالندھری کے انداز اور لب ولہجہ سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ اپنی نظم اصحاب صفہ کے ''شاہ نامۂ اسلام'' کے رنگ میں ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اب وہ بھی دستیاب نہیں کہ اس سے اس تاثر پزیری کی نوعیت کا اندازہ کیا جاسکے۔ امید یہی ہے کہ مولانا جیسے اپنے دوسرے فن میں الگ سے راہ نکالنے کے عادی تھے۔ اسی طرح انھوں نے اثرات قبول کرنے کے باوجود اپنے رنگ وآہنگ سخن کو اپنے مزاج سے ہم رشتہ کرلیا ہوگا اور اپنی انفرادیت کی پوری چھاپ لگادی ہوگی۔

---

[۱] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۷۴)

...صاحب کے استاذ شاعری | قاضی صاحب نے کئی جگہ اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ فن شاعری
...ون نگاری میں میرا کوئی استاذ نہیں اور نظم ونثر دونوں میں میرا رہنما میرا ذوق ہوا۔ لیکن یہ بات لاہور
...سے پہلے اور احیاء العلوم کی طالب علمی کے دور تک صحیح ہو سکتی ہے۔ لاہور جانے کے بعد جب مولانا
...ے روابط اردو کے مشہور مزدور شاعر احسان دانش سے ہوئے تو یہ تعلقات بڑھ کر استادی شاگردی
...خ گئے یہ تو بہت پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ مولانا فرصت کے اوقات میں بھی دانش کدے تک
...خراماں پہنچ جایا کرتے تھے اور رات کو دانش صاحب کی قیام گاہ پر حاضری دینا اور ان کی صحبت سے
...ٹھانا ان کے معمول میں شامل ہو چکا تھا۔ اس لیے احسان دانش کا اپنی سوانح عمری ''جہانِ دانش'' کی
...ل کے ص:۳۷۹ پر یہ لکھنا کہ'' قاضی اطہر مبارک پوری فن شعر میں میرے شاگرد ہیں''[1] بالکل
...ہے۔ اس کے علاوہ بھی احسان دانش نے قاضی صاحب کا ذکر اپنی آپ بیتی جہانِ دانش میں متعدد
...پر کیا ہے۔ جس سے ان دونوں کے درمیان مخلصانہ و دوستانہ تعلقات و روابط کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی اپنے مضمون میں احسان دانش سے قاضی صاحب کے گہرے
...ں نوعیت و خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> '' قاضی صاحب کے احسان دانش سے واقفیت و روابط ہوئے جو جلد ہی دوستی اور شاگردی میں تبدیل ہو کر اور گہرے ہو گئے تھے۔ شعر وسخن میں قاضی صاحب احسان دانش کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے تھے۔ تلمذ و استفادہ کا یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ قاضی صاحب کی احسان دانش صاحب کے ساتھ مستقل مجلسیں جمتیں اور شعر وسخن کا دور چلتا تھا اور فنی، ادبی نکات پر گفتگو ہوتی۔ قاضی صاحب کا اکثر شام چار بجے احسان دانش کے یہاں جانے کا معمول تھا۔ وہاں سے عشاء کے بعد واپسی ہوتی اور کبھی کبھی رات میں بھی احسان صاحب کے پاس ٹھہرتے اور رات دیر گئے تک شعر وسخن کا چرچا رہتا''۔[2]

یہ بات بھی ثابت ہے کہ قاضی صاحب کے احسان دانش صاحب سے آخر تک روابط اور

---

[1] بحوالہ قدیم ہندوعرب کے روابط و تعلقات کے ایک دیدہ ور مورخ۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔
...الحسن راشد کاندھلوی۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص:۱۸۷)
[2] ایضاً (ص:۱۸۷)

مسلسل خط و کتابت رہی۔

احسان دانش سے مولانا کے تعلقات علامہ انور صابری کی وساطت سے قائم ہوئے تھے۔ مولانا فراغت تعلیم کے بعد کے اپنے حالات ''کاروانِ حیات'' میں لکھتے ہیں:

''پہلی بار لاہور میں ملے تو مجھے وہاں کے اکثر شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے ملایا، ایک تانگہ طے کیا اور کئی گھنٹے تک اسی پر لوگوں سے ملتے رہے۔ احسان دانش سے مل کر ان سے میرا تعارف بڑے شاندار الفاظ میں کرایا'' [1]

اس کے بعد مولانا احسان دانش کے بہت قریب آگئے اور خصوصی ربط و تعلق شعری پیدا ہو گیا۔ مولانا خود لکھتے ہیں:

''اس کے بعد احسان صاحب سے اتنا زیادہ ربط و ضبط بڑھا کہ دن میں جب بھی موقع ہوتا مزنگ گندم منڈی میں ان کے یہاں چلا جاتا تھا اور یہ معمول تھا کہ رات کو مزنگ میں احسان صاحب کے یہاں ہم لوگ جمع ہوتے اور گیارہ بجے وہاں سے واپس آتے'' [2]

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے احسان دانش کی شاگردی میں رہ کر فنِ شاعری کے نکات سے آگاہی حاصل کی اور اپنے کلام میں فنی عیوب پر نگاہ رکھی۔ مگر مولانا کی یہ مدتِ شاگردی جو بالمشافہ گفتگو اور آمنے سامنے کلام دکھانے اور زبانی اصلاحِ سخن سے متعلق تھی بہت مختصر رہی۔ کیوں کہ مولانا ۱۳؍جنوری ۱۹۴۵ء کو امرتسر سے لاہور پہنچے۔ مگر ۱۳؍دن قیام کے بعد اپنے بیٹے انور جمال کی بیماری کی خبر پا کر ۲۶؍جنوری ۱۹۴۵ء کو گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ ۲۸؍فروری ۱۹۴۵ء کو انور جمال کا انتقال ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ مولانا پھر مارچ ۱۹۴۵ء ہی میں لاہور گئے ہوں گے اور تقسیم ملک کے قضیہ کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم کشیدگی نے ماحول کو ابتر بنا دیا تھا۔ اس لیے مولانا ۱۰؍جون ۱۹۴۷ء کو گھر واپس آگئے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو مولانا کی یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء کل پانچ ماہ احیاء العلوم کی عارضی مدرّسی کا زمانہ نکال کر (کیوں کہ اس مدت میں مولانا اپنے والد صاحب کے حج پر جانے کی وجہ سے گھر پر رہے) بہت کم مدّت تک لاہور میں رہے۔ جس کی وجہ سے احسان صاحب کی براہِ راست فنّی تربیت اور فیضِ صحبت کا زیادہ موقع نہیں پا سکے۔ جو کچھ مولانا نے سیکھا ہوگا، وہ انھیں ایام

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۶۳)

[2] ایضاً (ص: ۶۴)

میں یکھا ہوگا۔ خط وکتابت کے ذریعہ مولانا کے اصلاح لینے اور توجیہ اصلاح کا کوئی ثبوت ابھی تک مجھے نہیں مل سکا ہے۔ اس لیے یہی باور کیا جائے کہ مولانا نے احسانؔ دانش کی تربیت میں رہ کر فنی رموز ونکات شاعری سیکھنے کا کم موقع پایا۔ بعد میں مولانا خود بھی شاعری کے کوچے سے نکل آئے تھے اور اپنے تحقیقی وعلمی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہوگئے تھے۔ اس لیے بھی ان کے انہماکِ قلم میں شاعری کو ثانوی درجہ ہی حاصل رہا اور اس دور میں پہلے دورِ طالب علمی کے مقابلے میں شاعری کا وہ ذوق باقی نہیں رہا جو رات دن فکرِ سخن میں مولانا کو مشغول رکھتا تھا۔

خود اصلاحی | کوئی بھی فنی تخلیق اپنے فنکار کے تنقیدی شعور سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ تنقیدی شعور ہی ہوتا ہے جو تخلیق کو فن پارہ بناتا ہے۔ فنکار دورانِ تخلیق بہت سے تخلیقی وتشکیلی مراحل سے گزرتا ہے۔ قطرے کو گہر بننے تک کتنی معلوم ونامعلوم واضح اور موہوم لہروں کے تھپیڑے کھانے پڑتے ہیں۔ اس کی داستان باطنی ہوتی ہے۔ اس لیے کبھی قاری کے سامنے وہ اپنی مستقل اور واضح شکل میں سامنے نہیں آتی خود فنکار بھی تخلیقی کرب سے گزرنے کے بعد اپنے تمام تاثراتی و وجدانی شعور اور تخلیق کی زیریں موجوں اور مواد وہیئت کے گوناگوں تجربات کے بارے میں صراحت سے یا انھیں گن گن کر بیان نہیں کرسکتا، جن کی مدد سے فن پارہ وجود میں آیا ہے۔ کیوں کہ رد وقبول، پسند وناپسند اور اخذ وترک یا ترمیم وتغیر میں فن کار یا تخلیق کار کو بہت سے عوامل ومراحل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن کا کوئی حساب وکتاب یا لیکھا جوکھا نہیں ہوتا کہ انھیں سامنے رکھ کر بتایا جاسکے کہ اتنے عوامل وموثرات نے تخلیق کی صورت گری کی ہے۔ لیکن اتنا ہر کوئی جانتا ہے کہ تخلیقی شعور کے ساتھ تنقیدی شعور بھی بیدار ہوتا ہے۔ لفظوں کی ترتیب وترکیب، علامات واستعارات کے ایجاب وایراد بات کہنے کے انداز واسلوب میں تغیر وتبدل تنقیدی شعور سے مستفاد ہوتا ہے۔ ہر چھوٹا بڑا فنکار اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق اپنے تخلیقی لمحات میں ان سے دوچار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا فنکار بھی اپنے فن پارہ کے نقشِ اوّل کو مکمل نہیں سمجھتا۔ وہ اسے آخری شکل دینے اور حتمی صورت میں قاری کے سامنے لانے سے پہلے لفظ لفظ کے بارے میں غور کرتا ہے، تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے، اور محاکمہ کرکے مطمئن ہونے کی کوشش کرتا ہے اور جب تک فنکار خود اپنی تخلیق سے مطمئن نہیں ہوجاتا، اس وقت تک وہ ترمیم وتنسیخ کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ یعنی تخلیقی عمل میں تخلیق کار بھی نقاد بن جاتا ہے، لیکن اس کی تنقید اور نقاد کی تنقید میں یہ واضح اور نمایاں فرق ہے کہ تخلیق کار کی تنقید اس کے ذہن میں پوشیدہ رہتی ہے۔ جب کہ نقاد کے پیمانے، اس کے زاویہ ہائے نظر، اور اصول ونظریات تحریری

صورت میں منظر عام پر آتے ہیں اور اس طرح بعد کے فنکار یا تخلیق کار اور قاری دونوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یعنی تنقید نگار کی تنقید دوسروں کے لیے ہوتی ہے اور تخلیق کار کی تنقیدی صلاحیت صرف اپنے لیے ہوتی ہے جو تخلیق کو بنانے، سنوارنے، نکھارنے اور چمکانے سجانے میں کام آتی ہے۔

مولانا قاضی اطہر شعر کی تخلیق کے دوران کن اخذ و ترک کے تجربات و مراحل سے گزرے ہیں۔ تکمیلِ شعر کے بعد اس کے بارے میں بتانا مشکل ہے۔ مگر انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے کلام پر غور و فکر کر کے جو ترمیم و تنسیخ کی ہے، اس کے نقوش، ان کی بیاض اور بعض تحریروں میں محفوظ ہیں۔ ان سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ انھوں نے جب بھی فرصت پائی اپنے کلام پر تنقیدی زاویۂ نگاہ سے غور کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کلام کو دوبارہ لکھتے لکھتے بھی تنقیدی شعور سے کام لینے میں کوئی کسر روا نہیں رکھتے اور اپنے تنقیدی و وجدانی تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے اس عمل نے شعری کیفیت کے اثر کو افزوں کر دیا ہے۔

''اذانِ کعبہ'' کے عنوان سے جامع مسجد کے چندہ کی جو نظمیں علیحدہ بیاض میں درج کی ہیں، اس میں انھوں نے موقع و محل کے اعتبار سے تبدیلی کی ہے۔ بعض مقامات میں ترمیم کر کے تخصیصی پہلو میں تعمیمی صورت پیدا کر دی ہے۔ اس طرح جو نظم کسی مخصوص مسجد کے لیے تھی وہ عام مسجدوں کی تعمیر و بنا کے جذبات پیدا کرنے کی اہل بن گئی ہے۔ بعض جگہ ایک ذرا سی ترمیم نے شعریت بڑھا دی ہے یا کسی فوری جذبہ کی قوت اثر کو بڑھا کر اس کی مدتِ تاثیر کی توسیع کر دی ہے۔ اس بیاض کی ایک نظم کا ایک بند اس طرح تھا:

بڑھاؤ دین کی شوکت بڑھاؤ
کماؤ دولت عقبیٰ کماؤ
بناؤ مسجدوں کو تم بناؤ
بلاؤ روح حاتم کو بلاؤ
یہاں ہمت دکھائی جا رہی ہے

مولانا نے اس کے تیسرے مصرع کو بدل کر یوں کر دیا ہے: ع

بناؤ مسجد و منبر بناؤ

مگر اپنی خود نوشت سوانح عمری ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں اس مصرع ثالث کو مصرع اول

قرار دے کر انہوں نے اس طرح لکھا ہے:

بناؤ جامع مسجد بناؤ
بڑھاؤ دین کی شوکت بڑھاؤ
کماؤ دولتِ عقبیٰ کماؤ
بلاؤ روحِ حاتم کو بلاؤ
یہاں ہمت دکھائی جارہی ہے

اس ترمیم درترمیم کے عمل سے چند حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے جو یہ ہیں کہ مولانا نے یہ نظم اپنے دورِ طالب علمی میں مولانا شکر اللہ صاحب کے زیرِ قیادت تعمیر ہونے والی جامع مسجد کے چندہ کے لیے کہی تھی اور اسی جامع مسجد کے چندہ کے لیے مولانا شکر اللہ صاحب اپنے رفقائے تحریک کے ساتھ پورے جوش وخروش سے فداکارانہ انداز میں اہلِ قصبہ کے دروازوں پر دستک دیتے تھے۔ مگر نظم کے مصرع ثالث سے متبادر ہوتا ہے کہ تعمیر ہونے والی کئی مسجدیں ہیں، جن کا چندہ ہورہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات واقعاتی اور تاریخی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ مگر قاضی صاحب کچھ اپنی طالب علمی اور کچھ عجلت پسندی کی وجہ سے اس نقص کی طرف متوجہ نہیں ہوسکے تھے، لیکن جب ۱۹۸۶ء میں اپنی سوانح عمری کا پہلا حصہ ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' مرتب فرمایا تو اس وقت ان کی نظر اس خامی کی طرف گئی اور انھوں نے مطابقتِ حال پیدا کرنے کے لیے مصرع بدل کر یوں کردیا: ع

بناؤ جامع مسجد بناؤ

مولانا نے مصرعوں کی ترتیب بھی بدل دی اور تیسرے مصرع کو اپنی سوانح عمری میں پہلا مصرع قرار دے دیا تاکہ جس کام کی ترغیب لوگوں کو دی جارہی ہے، اس کا ذکر پہلے ہی مصرع میں آجائے اور مسجد بنانے کے بعد دین کی شوکت کا بڑھنا، مسجد کے لیے چندہ دے کر دولتِ عقبیٰ حاصل کرنا وغیرہ جو تعمیرِ مسجد کے ذیل میں ہیں ان کا ذکر مابعد کے مصرعوں میں آئے۔ مولانا کی اس نظم کا بند پہلے پہل جس ترتیب سے تھا، اس میں دین کی شوکت کا بڑھنا اور دولتِ عقبیٰ کی کمائی کا ذکر پہلے آگیا تھا۔ یعنی عمل کا نتیجہ پہلے ذکر کردیا گیا تھا اور عمل کا اظہار بعد میں نظم ہوا تھا۔ ترمیمی صورت میں عمل پہلے آیا ہے اور اس عمل کے دونوں نتائج بعد میں بیان کیے گئے ہیں جو تسلسلِ واقعہ کے اعتبار سے انسب واحسن ہیں۔

بعد میں کسی وقت انھوں نے اپنی بیاض اذانِ کعبہ کے تیسرے مصرع ''بناؤ مسجدوں کر تم بناؤ''

میں ترمیم کر کے ''بناؤ مسجد و منبر بناؤ'' کر دیا ہے۔ اس ترمیم سے مذکورہ بالا عیب بھی دور ہو گیا، جو لفظ مسجدوں کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا اور اس ترمیم نے مصرع میں عمومیت بھی پیدا کر دی۔ اب یہ بند کسی بھی مسجد کے چندہ کے وقت پڑھا جا سکتا ہے۔ راقم الحروف نے ترتیب کے وقت یہی عمومیت روا رکھی ہے۔ البتہ کوئی نظم کے تاریخی پس منظر کو باقی ہی رکھنا چاہے یعنی جس جامع مسجد کے لیے یہ ترغیبی و تحریکی نظم کہی گئی ہے اس کو بدلنے کے حق میں نہ ہو تو ''بناؤ جامع مسجد بناؤ'' ہی پڑھے، مگر پھر جامع مسجد کی ترکیب محلِ نظر ہو جائے گی بلکہ جامع مسجد سے زیادہ بہتر مسجد جامع کی ترکیب ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے ''بناؤ مسجد و منبر بناؤ'' مصرع کہہ کر یہ عیب بھی دور کیا ہو کیوں کہ مسجد و منبر بنانے سے بھی حقیقتِ حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اسی چندہ کے موقع کی ایک دوسری نظم کا ایک شعر پہلے یوں کہا گیا تھا:

تو عطا کر اپنی اس مسجد کو اتنا مال و زر
کہ وہ کہہ دے بھر گیا دامن مرے مقصود کا

مصرع ثانی بدل کر مولانا نے یوں کر دیا:

بول اٹھے بھر گیا دامن مرے مقصود کا

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ ادائیگی کے وقت زبان میں جو گرہ پڑ رہی تھی یا ژولیدگی پیدا ہو رہی تھی وہ دور ہو گئی اور مصرع میں روانی آ گئی اور حرفِ وضاحت ''کہ'' جو حشو کا عیب پیدا کر رہا تھا وہ بھی نکل گیا۔

مولانا کی نظم ''صبحِ آزادی'' میں جو اُن کی ابتدائی شاعری کے دنوں کی یادگار ہے۔ ایک شعر اس طرح تھا:

زمیں کے چپے چپے میں خوشحالی، رنگ رلیاں تھیں
فلک پر چاند تاروں نے منائی، صبحِ آزادی

اس شعر کا پہلا مصرع ساقط الوزن ہے یا خوشحالی کو اپنے سالم تلفظ کے ساتھ نہیں ادا کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے مصرع بدل کر ''زمیں کے چپے چپے میں خوشی سے رقصِ عشرت ہے'' بنا دیا گیا۔

اس نظم کا ایک اور شعر یوں تھا:

کسی نے پُر کیا زنداں، کسی نے سولی پر دی جاں
سبھوں نے جان کی بازی لگائی، صبحِ آزادی

اس شعر میں کسی لفظ کا کوئی حرف دب رہا ہے، کہیں عامیانہ لہجہ ہے۔ مولانا نے ان عیوب کو بعد میں دور کیا تو شعر اس طرح ہوگیا:

کیا آباد زنداں کو، کبھی دار و رسن چوما
لگائی جان کی بازی، تو آئی صبح آزادی

شعر میں روانی پیدا ہوگئی، مصرعے اپنے نصف پر پورے ہونے لگے۔ شکستِ ناروا کی صوتی کراہیت نکل گئی۔ غزل کا ایک شعر تھا:

مچلا کرتی تھی جن کی ہر نظر شعلے دل و جاں میں
نہیں معلوم خود ان شعلہ سامانوں پہ کیا گزری

پہلے مصرع میں شعلے کی جگہ بجلی کا لفظ رکھ کر پورے شعر میں بجلی بھر دی۔

بے خودی کو نہ کرنا اُجاگر
عظمتِ بے خودی یوں نہ کھونا

اس کو خود اصلاحی کے مرحلے سے گزارا تو شعر یوں ہوگیا:

ذوقِ بادہ نہ لغزش میں آئے
عظمتِ بے خودی یوں نہ کھونا

"ذوقِ بادہ نہ لغزش میں آئے" کہہ کر عظمتِ بے خودی سے جو لفظی و استعاراتی نسبت جوڑ دی گئی ہے وہ بہت خیال انگیز اور فکری تحریک پیدا کرنے والی ہے۔ کیوں کہ شرابی کی سب سے بڑی کمزوری شراب ہوتی ہے۔ یہ معمولی چیز دے کر شرابی سے بڑی قیمت وصول کی جا سکتی ہے اور اس کی ہر متاعِ عزیز کا سودا ہو سکتا ہے۔

خیر ہو دامنوں کی زنداں میں
کیوں یہ خاروں کی یاد آتی ہے

مولانا نے اس کو اپنی اصلاح سے درست کر کے یوں کردیا:

خیر ہو دامنوں کی زنداں میں
آج خاروں کی یاد آتی ہے

صرف ایک لفظ کی تبدیلی نے مصرع کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ پہلے مصرع میں تمنائی رنگ میں جو بات کہی

گئی تھی، دوسرے مصرع کے سوالیہ واستفہامیہ جملہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ تبدیلی نے دونوں میں ربط وتسلسل کی کڑیاں جوڑ کر پوری شعری فضاء میں دھنک رنگ سوچ بکھیر دی ہے۔

ان چند مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہوگی کہ مولانا کے تخلیقی عمل کے تحت الشعور میں ان کا تنقیدی شعور بھی سرگرم عمل تھا۔ انھوں نے اگرچہ اپنے تنقیدی اصول ونظریات کا کھل کر اظہار نہیں کیا۔ مگر ان کی کانٹ چھانٹ، انتخاب واصلاح اور ترک وقبول میں تخلیقی شعور کے ساتھ ایک تنقیدی شعور بھی کارفرما تھا۔ وہ اصلاحِ زبان کی تحریک اور اس کے اثرات وفیضان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ لفظوں کے دائرۂ اثر، ان کے سماجی وسیاسی پسِ منظر، لفظوں کی نفسیاتی وذہنی جہات اور لفظوں سے خیال وفکر کی معاملہ فہمی پر ان کی نظر رہا کرتی تھی۔ مولانا کے یہاں جذبات ہیں اور ان جذبات کی سچی عکاسی اور تاثرات کی مرقع کشی کے خلاقانہ اظہار اور ماہرانہ پیشکش کے لیے ضروری ساز وسامان کی کمی نہیں ہے۔ ان کے تخلیقی وتنقیدی شعور پر غور کرتے وقت اس حقیقت کا سرا ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے کہ اس میں اکتسابات وریزہ چینی کا حصہ کم، ان کی اپنی خداداد صلاحیت واستعداد کے سہارے تشکیل پائے ہوئے تخلیقی مزاج کا وافر حصہ ہے۔ ان کے اشعار جابجا ہماری توجہ، ان کی طبعی حنابندی اور شعور کی طبع زاد کائنات کی طرف مبذول کراتے ہیں اور اس حقیقت کے دروازے تک لے جاتے ہیں کہ رنگِ تماشہ کا غالب عنصر شاعر کے اندروں کا زائیدہ ہے۔

نعتیں | اس مجموعہ میں قاضی صاحب کی مکمل ونامکمل ۶ ر نعتیں شامل کی گئی ہیں۔ جس میں ایک نعت فارسی زبان میں بھی ہے۔ یہ فارسی نعت ''قاضی اطہر مبارکپوری نمبر'' مجلہ ''ترجمان الاسلام'' بنارس اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء اور ''قاضی اطہر مبارکپوری نمبر'' ماہ نامہ ''ضیاء الاسلام'' شیخوپور ضلع اعظم گڑھ اگست تا دسمبر ۲۰۰۱ء میں شامل ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب وتبویب کے وقت قاضی صاحب کے کاغذات میں ایک پرانے کاغذ پر مولانا کے قلم سے لکھی ہوئی یہ نعت الگ سے مل گئی، جس میں کچھ اشعار کا اضافہ اور کچھ قلم زد تھے۔ اشعار کی ترتیب میں بھی باقاعدگی نہیں تھی۔ اس کی مدد سے مذکورہ بالا دونوں نمبروں میں شائع شدہ نعت کے اشعار میں اضافہ کردیا گیا ہے۔ اسی طرح باقی پانچ اُردو نعتیں مختلف ماخذ کی مدد سے شاملِ مجموعہ کی گئی ہیں۔ بعض نعتوں میں بعض دوسرے ماخذ کے تعلق وحوالہ سے اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ مولانا کا کلام یکجا بہت کم تھا، منتشر صورت میں زیادہ تھا۔ ان سب کو سمیٹنا اور پھر مقابلہ وموازنہ کرکے تکمیلی انداز میں یکجا کرنا کارے دارد مگر اللہ کی بخشی ہوئی توفیق سے یہ کام بھی تکمیل کو پہنچ گیا۔ ابھی تلاش کا سلسلہ جاری ہے

نعتیں ملنے کی توقع باقی ہے۔ بروقت جو کچھ مل سکا ہے اسی پر اکتفا کر کے مجموعہ کو طباعت کے مرحلے سے گزار دینا ہے۔ تا کہ قاضی صاحب کا شعری سرمایہ تو قوم کے سامنے آ جائے۔

اس مجموعہ میں شامل دوسری نعت مولانا کی ابتدائی مشق کے دور کی لگتی ہے۔ یہ نعت قاضی صاحب کے شاگرد رشید مولانا قاری انوار الحق مبارک پوری کی ایک قدیم اور مخدوش اول وآخر واوسط ناقص بیاض میں ملی ہے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نعت طویل تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات وحیات کے مرحلہ وار تذکرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر بیاضِ انوار کے اوراق ضائع ہو جانے کی وجہ سے پوری نعت شامل نہیں کی جا سکی۔

اس میں شامل تیسرا نعتیہ قصیدہ ہے۔ مولانا کی بیاض کر دو سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ اس نعتیہ قصیدہ میں ان کا اضافہ کرنے کا خیال تھا، اسی لیے انھوں نے اس میں کچھ قطع و برید کی تھی۔ میں نے ترمیم کرنے کی یہ جرأت و گستاخی کی ہے کہ درمیان میں مولانا کا قلم زد مقطع والا مصرع بحال کر کے اس کو آخر میں بطور مقطع درج کر دیا ہے۔ مولانا نے اس طرف توجہ کی فرصت پائی ہوتی تو شاید اس نعتیہ قصیدہ کی صورت کچھ اور ہو گئی ہوتی۔

نعت تمام اصناف شاعری میں اہلِ ادب واحترام اہلِ علم کی نظر میں نہایت مشکل پل صراط ہے۔ جس میں اگر ادب واحترام کی شرطوں کی پاسداری نہ کی گئی تو عاقبت بگڑ جانے کا خطرہ ہے۔ اگر اس کے تمام مقتضیات پر نگاہ رکھی گئی تو عبادت کا درجہ ہے اور نعت گو شاعر کے لیے ثوابِ آخرت کا مژدہ ہے۔ ایک باادب اور مقامِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاس ولحاظ رکھنے والا فارسی شاعر نام پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر کو گلاب ومشک سے منہ دھلنے کے بعد بھی کمالِ بے ادبی تصور کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو کتنی سچی بات، کتنی ادبیت کی حامل شعری زبان میں کہی جارہی ہے:

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

تمام اصناف سخن میں اپنے شرائط وآداب کے لحاظ سے نعت سب سے مشکل صنف سمجھی جاتی ہے۔ اس صنف کا تقاضہ ہے کہ احساسات وخیالات اور اعتقاد وجذبات کو افراط وتفریط، غلو وکتمان سے محفوظ رکھا جائے اور ہر لحہ، ہر آن احتیاط واعتدال پر نظر رکھی جائے۔ ذکر اوصاف محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مقامِ توحید ورسالت اور حدِ بشریت واحدیت کا امتیاز ختم نہ ہو جائے۔ اسی کے ساتھ اس کی بھی کوشش

ہوتی ہے کہ رسالت اور عام بشریت کے درمیان بھی حد فاصل قائم رہے۔ ایسا نہ ہو کہ منصب نبوت عمومی بشریت کے درجہ میں آجائے۔ اسی کے ساتھ لہجہ وتاثر کا تقدس، خیالات وجذبات کی پاکیزگی، عقیدت وشیفتگی میں طہارت فکری کا خیال رکھنا بھی انتہائی ضروری ہے اور جب تک اسلوب وبیان پر شاعر کو قدرت نہ ہو ان سب لوازم کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید وبایزید ایں جا

مولانا احمد رضا خاں بریلوی جو خود بھی نعت کے بہت اچھے، محتاط اور خوش فکر شاعر ہیں۔ نعت نگاری کے آداب اور اس کی مشکلات پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''نعت شریف لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مرادف ہے۔ کیوں کہ شاعر اگر نعت میں بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔ حمد باری تعالیٰ میں تو اصلاً حد نہیں، راستہ صاف ہے، جتنا چاہے بڑھتا جائے۔ مگر نعت میں دونوں جانب حد بندی ہوتی ہے''۔

اس کسوٹی پر مولانا قاضی اطہر کی نعتوں کا مطالعہ اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ مولانا کی نعتیں اپنی خصوصیات وامتیازات، خیالات وجذبات، ارتعاشات واہتزازات، فکروخیال، عقیدہ وعقیدت شائستگی وشستگی، متانت وسنجیدگی، زبان وبیان، رنگ وآہنگ، گفتار واسلوب کے اعتبار سے خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔ ان میں ذکروفکر کی جو احتیاط ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔

قاضی صاحب کی شاعری کے موضوعات میں اصلاحی نظموں کا پلہ بھاری تھا۔ وہ نعت کم کہتے تھے۔ ان کے دوست مولانا نظام الدین اسیر ادروی کا بیان ہے کہ:

''ان کی شاعری اصلاحی نظموں تک محدود تھی، کبھی کبھار کوئی نعت لکھ دیتے تھے''[1]

انھوں نے نعتیں کم کہیں، اس پر بھی ان کا خاص حصہ ضائع ہو گیا، بہت کم نعتیں محفوظ رہ سکیں۔ عموماً نعت خواں طلبہ ان کی نعتوں کی حفاظت نہیں کر سکے، اس لیے ان کی جو نعتیں اس مجموعہ میں شامل ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے اور اس میں ابتدائی مشق سخن سے تعلق رکھنے والی نعتیں بھی ہیں۔ پھر بھی ان نعتوں میں دینی شعور اور شرعی احتیاط کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس حصے کا آغاز ایک نعتیہ سلام سے ہوتا ہے۔

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلہ ترجمان الاسلام بنارس (ص: ۴۰)

س میں مدحِ صحابہ کے بھی اشعار ہیں، جو بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔ کسی زمانے میں ماہرالقادری کا سلام
سی زمین میں علمی و دینی حلقوں میں بڑا متداول رہا اور بچے بچے کی زبان پر تھا۔ بہتوں نے اس کا تتبع کیا۔
مگر ماہرالقادری کا انداز پیدا نہیں ہوسکا۔ قاضی صاحب نے بھی اسی سلام کو نمونہ قرار دیا ہے۔ اس میں
بعض بعض مقام پر سطوت فکری اور شکوہ لفظی قصیدہ کی طرح موجود ہے۔

قاضی صاحب کی نعتوں میں دو لہجوں کی نمائندگی ملتی ہے ایک وہ لہجہ ہے جس کو عقیدتی یا اعتقادی کہا جاسکتا ہے اور دوسرے لہجے کو ترقی پسندانہ لہجہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جس میں مسائل حاضرہ پر اظہارِ خیال کی کوششیں ملتی ہیں اور نعتوں کو بھی اپنے دور کا آئینہ بنا کر ان میں سماجی و معاشی پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا کی ایک نعت قصیدہ رنگ ہے۔ جس میں آہنگ بیان قصیدوں سے ملتا جلتا ہے لیکن اس کی تشکیلی ہیئت قصائد سے مختلف اور غزل سے قریب تر ہے۔ دوسرا اسلوبِ نعت والہانہ و عقیدت آہنگ ہے۔ عقیدت کا جذبہ تو نعتوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس اُسلوب میں والہانہ جوش عشقِ نبوی کی اور ہمہ گیر صورت اختیار کرتا ہے اور نعتوں کو ایک نئی داخلی معنویت عطا کرتا ہے۔ ہر چیز جس کا تعلق رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے ہے قاضی صاحب کو عزیز ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

برستے ہیں جلوے نگاہوں میں اپنی
کہ سرمہ بنا ہے غبارِ مدینہ

غبارِ مدینہ کے سرمہ بننے کی بات اوروں کے یہاں بھی ہے، مگر نگاہوں میں جلوے کا برسنا ایک تازہ مضمون کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ یہی عقیدت آہنگ لہجہ نعت کو اعتبار و وقار عطا کررہا ہے۔ اس رنگ میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

میں جنت میں ہوں یا کہ کنجِ قفس میں
خیالوں میں بیت الحرام آرہا ہے

ان نعتوں میں کہیں کہیں منظرکشی اور وقت و حالات کی عکاسی کا احساس بھی ملتا ہے۔ جس نے شعریت کی عصریت اور سماجیت کے پہلو کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس قسم کی نعتیہ شاعری سے شاعر کی حساسیت اور الجذابِ ذہنی کا پتہ چلتا ہے۔ سماجی کیفیتوں سے وہی متاثر ہوتا ہے جس کے حواس ذہنی اور حواس باطنی بیدار ہوتے ہیں۔ ان نعتوں میں اپنی الجھنوں، اور فکرمندیوں، اور مسائل زندگی کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

اس مجموعہ کی فارسی نعت اپنے آہنگ اور بحر و وزن کے اعتبار سے نرم، رواں اور شستہ صوتی نظام

کی نمائندہ ہے۔اس میں دوسری نعتوں کے مقابلے میں مسائلِ حیات، خصوصاً مسلم معاشرت کی تصویر کشی زیادہ وسیع تناظر میں کی گئی ہے۔مسلمانوں کی کاسہ لیسی اور دریوزہ گری کی طرف اشارے مولانا کی نگاہ فکر کی زیادہ وسعت کا پتہ دے رہے ہیں۔ان اشعار میں ایک زندہ دل دھڑک رہا ہے اور ایک توانا روح تڑپ رہی ہے۔جس سے مولانا کے اضطرابِ قومی اور اذیت ذہنی کا احساس ہوتا ہے۔مولانا اپنی نعتیہ شاعری میں بھی کامیاب ہیں۔

غزلیں قاضی صاحب کی شاعری کا آغاز اصلاحی و دینی نظموں سے ہوا تھا مگر ان کو غزل کی روایت نے اپنی طرف خاص طور سے متوجہ کیا اور بعد کی شاعری میں اس کا وافر حصہ ہے۔بہت کچھ ضائع ہو جانے کے بعد بھی ان کی بیاض میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے، اس کے بعد نظموں کی مقدار ہے۔قاضی صاحب نے جوانی تک غزلیں آسان اور عام فہم لب ولہجہ میں خوب کہیں۔ان کی بحریں چھوٹی چھوٹی اور رواں ہوتی تھیں۔غزلوں کا انداز محاکات و استعارات اور تاریخی و دینی تلمیحات و تشبیہات سے عموماً خالی ہوتا تھا۔ چوں کہ غزل کے الفاظ نرم و شیریں، سبک اور نازک ہوتے ہیں۔اس کا تعلق جن جذبات وخیالات سے ہوتا ہے اور جس ایمائیت و اشاریت کی یہ نمائندگی کرتی ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ غزل کا لہجہ فلسفہ وعلم کی موشگافیوں اور زندگی کے مسائل کی فنی توجیہات و ترجیحات سے بوجھل نہ ہو۔قاضی صاحب بھی قدمائے فنِ سخن کی اسی روش کے پابند تھے۔غزل سے اُن کے پیمانِ وفا میں یہ اقرار بھی شامل تھا کہ غزل کے فاسقانہ، بوالہوسانہ، سوقیانہ اور عامی زبان و بیان سے کبھی سروکار نہ رکھا جائے اور معاملۂ سخن میں ہمیشہ پاکیزہ جذبات وخیالات کو ترجیح دی جائے۔

قاضی صاحب نے شاعری میں زود نگاری اور بسیار گوئی کی روایت کو وسعت بخشی تھی۔انھیں غزلوں پر اتنی قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ ذرا سی فکرِ سخن میں کلام مکمل کر لیتے تھے۔ان کی غزلیں اخبار و رسائل میں "مئے طہور" کے عنوان سے اشاعت پزیر ہوتی تھیں۔انھوں نے اتنی کثرت سے غزلیں کہی تھیں کہ دو ضخیم دیوان تیار ہو چکے تھے، جو بمبئی سے وطن آنے میں ٹرین ہی میں چھوٹ گئے اور پھر کہیں ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔اس طرح ان کی غزلوں اور شاعری کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔قاضی صاحب کو اپنی دونوں ضخیم بیاضوں کی گم شدگی کا ملال عمر بھر رہا۔اس کے بعد انھوں نے شاعری کے کوچہ کو بھی خیر باد کہہ دیا۔

قاضی صاحب کی غزلوں میں اندرونی و ظاہری دونوں صورتوں میں بتدریج تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ابتدائے شاعری میں ان کی غزلوں کا رنگ مقلدانہ اور مقتدیانہ ہے۔زبان میں بھی خشکی

ور لڑکھڑاہٹ ملتی ہے۔ شاعری کی مشق جیسے جیسے بڑھتی گئی ان کے فن میں بھی نکھار آتا گیا۔ پہلے آورد کی شان تھی بعد میں آمد کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جس کی وجہ سے تاثرات اور ذائقۂ سخن میں بھی اضافہ ہوا۔ ان کی غزلوں پر بحث کرتے ہوئے اسیر ادروی نے لکھا ہے کہ:

''ان کی کچھ غزلیں پاکیزہ اور دلکش ہیں لیکن اس کا بڑا حصہ سادگی بیان اور سادگی زبان کی وجہ سے دلکشی و جاذبیت سے عاری ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ قاضی صاحب کا فن نہیں تھا اور نہ ان کی ذہنی ساخت غزل کی شاعری کو قبول کرتی تھی۔ غزل کی شاعری کے لیے حسن پرستی، تھوڑی سی ذہنی و فکری آوارگی کی ضرورت ہے تبھی وہ مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑ سکتی ہے۔ تخیل کی بلند پروازی، محاکات کی رنگ آمیزی، طرز اظہار کی شوخی کے تام جھام کے ساتھ جب عروسِ غزل جلوہ افروز ہوتی ہے تبھی اس کی جانب فکر و نظر کی نگاہیں اٹھتی ہیں''[1]

قاضی صاحب اپنی افتادِ طبع اور ذہنی میلان و فکری رجحان کے اعتبار سے شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو شاعری کو چھیڑ چھاڑ، شوخی و سرمستی، رندی و شاہد بازی اور عشق و عاشقی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے یہاں محبت و رندی ہی سارے مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس سے پرے ہوکر بھی زندگی کو دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ غزل تندیِ صہبا سے آبگینہ کو پگھلانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ غزل کا تقاضا ہوتا ہے کہ:

لازم ہے کہ دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

غزل غالب کی زبان میں شاعروں سے کہتی ہے کہ:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

قاضی صاحب کی غزلیں اس طرح کے سحر سے خالی ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان میں جو شعری آہنگ اور جذبات کی تیزی ہے، وہ اگر چہ سادگی زبان و بیان کو لیے ہوئے ہے۔ اپنی تاثیر کے اعتبار سے اس کا بھی ایک خاص اندازِ اعجاز ہے اور اس کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ قاضی صاحب نے

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلّہ ترجمان الاسلام بنارس (ص: ۴۰)

قدمائے غزل کی پیروی کی ہے۔ جدید غزل کے اماموں کو وہ اپنی فکر کا محور نہیں بنا سکے۔ اس کی
متعدد وجوہات میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے زیادہ دنوں تک سلسلۂ سخن جاری نہیں رکھا اور جلد ہی اس
کوچے سے نکل گئے۔

شعر گوئی کی بنیادیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک تو وہ ہوتی ہے کہ شاعر اپنی شخصیت اور خیالات کو
مقبول بنانا چاہتا ہے، اس لیے وہ زندگی کے اخلاقی پہلو، انسانی زندگی کی ابدی قدروں اور آدرش کو اپنے
کلام میں جگہ دیتا ہے۔ حالاں کہ اس کی اپنی نجی زندگی اور طرز و انداز میں اس کی کوئی جھلک نہیں ملتی اور وہ
عمل کی دنیا میں صرف گفتار کا غازی نظر آتا ہے۔ آدرشوں اور قدروں کو زندگی کی تگ و تاز اور جدوجہد میں
مرکزی حیثیت دینے میں جو قدم قدم پر امتحانی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور جذبات و خواہشات نفسانی پر
لگام کسنی پڑتی ہے۔ زندگی کے سرکش گھوڑے کو بے لگام اِدھر اُدھر گھومنے کی آزادی نہیں ہوتی اس میں جو
جوکھم ہوتا ہے اور وہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے شاعر جب ابدی قدروں اور فضائل اخلاق
کی دل فریب سچائیوں سے اپنی عملی زندگی میں لاتعلق ہوتے ہیں اور وہ ایسے اشعار کہتے ہیں، جن میں ایک
مثالی زندگی اور انسانِ کامل کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے پیچھے وہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ عوام میں
شاعر کے فرمودات اور اس کی شخصیت کو مقبولیت حاصل ہو۔ یہاں پیغام کی عظمت کے حوالے سے کہنے
والے کی شخصیت میں عظمت کے پہلو نمایاں کرنا مقصد ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے کچھ ایسے ہوتے ہیں
جن میں بنیادی اور جبلی طور سے عظمتیں چھپی ہوتی ہیں۔ ان کے سیرت و کردار میں ابدی قدروں کا اثر
خلقی طور سے سرایت کیے ہوئے ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت میں اخلاقی عظمت کا سمندر موجیں مار رہا ہوتا ہے
اور وہ جو پیغام دیتے ہیں، ایک تو وہ پیغام دینے والے کی شخصی عظمت کے حوالے سے بھی اہم ہوتا ہے اور
دوسرے پیغام کی اہمیت بھی اس کی مقبولیت کی دلیل ہوتی ہے۔ مولانا کے کلام میں ان کی شخصیت اور
سیرت و کردار کا یہی پہلو نمایاں ہے۔ وہ شعر میں کوئی اچھا خیال، بہتر اخلاق اس لیے پیش نہیں کرتے کہ
اخلاق اور خیال اچھا ہے، بلکہ ان کی پیشکش اس رنگِ طبیعت کے زیر اثر ہے کہ مولانا کی عملی زندگی بھی ان
خیالات و اقدار کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ عوام میں اشعار کی بنیاد کو مضبوط کرنے کے خیال سے شاعری نہیں
کرتے، وہ اپنی شخصیت اور کردار کی وضاحت کے لیے شعر گوئی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے جذبات،
خیالات، رجحانات، خواہشات، احساسات اور ہیجانات جو ان کی شاعری میں ملتے ہیں، ان سے ان کا ذہنی
بھی تعلق ہے اور عملاً بھی تعلق ہے۔ ان کا مقصد یہ نہیں کہ وہ عوام میں اپنی شخصیت کو ایک آدرش شخصیت میں

تبدیل کر کے پیش کرنا چاہتے ہیں اور خراجِ مقبولیت حاصل کرنا ان کا مطمحِ نظر ہے۔ انھوں نے اونچے خیالات اور اخلاقی پہلو کو شاعری کا عنوان اس لیے نہیں بنایا کہ ان کی بہت سی اخلاقی کمزوریاں یا غلطیاں ان کو دیوانہ یا نیم پیغمبرانہ مخلوق سمجھ کر معاف کر دی جائیں۔ انھوں نے ان اخلاقی پہلوؤں کو اچھا سمجھ کر اپنی عملی زندگی میں اہمیت دی ہے۔ اس لیے ان پہلوؤں کا فکری پھیلاؤ کرنے کے لیے شاعری کے وسیلۂ اظہار کو اختیار کیا گیا ہے۔ مولانا کی شاعری کے نگارخانے میں وہی تصویریں اپنی قوس وقزح کے رنگوں کو بکھیر رہی ہیں، جو ان کی شخصیت اور سیرت و کردار کے مرقع میں موجود ہیں۔ یہ اشعار خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں سے اپنے کہنے والے کا معیار بتا رہے ہیں۔

مولانا عملی مزاج اور طبیعت رکھتے تھے۔ اس لیے جب وہ اپنی معاشی پریشانیوں میں تعلیمی فراغت کے ابتدائی ایام میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ ان کی اسی عملیت نے ان کے دل و دماغ اور قویٰ کو اضمحلال وضعف سے بچایا اور ان کی عملی تحریک کو توانائی بخشی۔ زندگی کی بے اطمینانی، خوابوں کی شکست، آرزوؤں کی ناآسودگی اور ناتمامی نے ان میں ذہنی انتشار پیدا کیا۔ ان کی طبیعت میں ایک خلش اور اضطراب کو جنم دیا۔ لیکن ان کی عملی تحریک اور کچھ کر گزرنے کی خواہش نے انھیں خلشِ غم اور اضطرابِ قلبی سے غیر معتدل انداز میں مغلوب نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے غمِ روزگار کے اثرات کو محسوس کیا مگر ان اثرات نے انھیں مفلوج نہیں کیا۔ ان کی طبیعت نے اس غم واندوہ کو اس طرح قبول کیا کہ انفعال کی کیفیت کو اثباتی پہلو مل گئے۔ جس کے نتیجے میں ایک تخلیقی قوت ابھری۔ جس نے ان کی زندگی کی سمت ورفتار بدل کر رکھ دی اور اس قوت کے سہارے بہت سے جہانِ تازہ کے دروازے ان پر کھل گئے۔

اسی احساس کے تحت وہ اپنے رب کے حضور دعائیہ رنگ میں یہ شعر کہتے ہیں:

اثر ہے مضمحل جس کی جدائی میں زمانہ سے
عنایت ہو مجھے ایسا کوئی رنگِ فغاں ساقی
خلش کھینچے لیے جاتی ہے ان کی جانب منزل
انھیں روندے ہوئے ذرّوں کو میرِ کارواں کہیے
گزرتی ہے گراں اتنی بھی سبکی طبعِ غیرت پر
سرِ ساحل نہ ہم طوفانیوں کی داستاں کہیے

اسی منزل پر مولانا کو احساس ہوتا ہے کہ اگر انسان کا غم و آلام سے سابقہ نہ پڑے اور وہ آسائش

کی زندگی گزارنے لگے تو اس کی عملی وتخلیقی قوت میں اضمحلال آجائے گا۔ وہ کارگاہِ زندگی میں اپنے وظیفۂ حیات کو انجام نہیں دے سکے گا۔ اس کی منفی وانفعالی قوتیں اس کو مغلوب کرلیں گی اور ابنِ آدم کو جو خلافت ارضی عطا کی گئی ہے، جس امامت کبریٰ پر اس کو فائز کیا گیا ہے، اس کا حق اس سے چھن جائے گا۔ جو ایک غیرت مند طبیعت کے لیے موت سے کم نہیں:

لمحاتِ سکوں موت ہیں میرے لیے اطہر
طوفانِ حوادث میں بقا میرے لیے ہے
یہ میرا ذوقِ بینش ہے کہ لطف برقِ پیہم ہے
ہر اک شعلہ میں عکسِ آشیاں معلوم ہوتا ہے
ہزاروں راہ مجھ پر کھل گئیں مجبوریِ دل سے
کہیں آگے نکل جاؤں نہ اے دل حدِ منزل سے
سفینہ گھر کے نکلا ہے ابھی موجِ حوادث سے
یہ کیوں گھبرا رہا ہے ناخدا آثارِ ساحل سے
جو آزاد سا ہے غمِ عاشقی سے
بہت دُور ہے مرکزِ زندگی سے
یوں ہی لحظہ بہ لحظہ تو قتیلِ ناز کرتا جا
مجھے ہر وار میں اک زندگی معلوم ہوتی ہے
خدا جانے وفورِ درد کو سمجھا ہے کیا میں نے
مجھے ہر گریۂ غم میں ہنسی معلوم ہوتی ہے
جو چمکی تھی گلستاں میں شرارِ برق کی صورت
قفس میں بھی وہی تو روشنی معلوم ہوتی ہے

ان اشعار میں مولانا کی زندگی کا حرکی پہلو اور عملی عنصر صاف نظر آتا ہے۔ جس نے ان کے قطرے سے گہر ہونے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے سیاہ رات کا ماتم نہیں کیا۔ اپنے گردوپیش اور حالات کے اندھیروں کے ناگ کے زہر اور ڈنک سے زندگی کا تریاق حاصل کرکے جینے کے لائق بنادیا۔ انھوں نے تلخیِ حیات سے صہبائے کامرانی نچوڑی۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی افسردگی، آزردگی اور آشفتگی

میں بھی ان کے باطن کی دنیا آباد اور ان کی تخلیقی قوتوں کے سوتے جوش پر ہیں۔ان کے دل کی کائنات جوش وخروش اور ہنگاموں سے لبریز رہتی تھی۔ان کی شاعری میں جابجا اس ولولہ اور جوش وخروش کا مظاہرہ ملتا ہے۔جو ان کی فطرت کے ایجابی پہلو پر ہمارے عقیدے کو مضبوط کرتا ہے:

رونے والوں کو کہاں فرصت ہنسی کی تھی مگر
آپ کے نازک تبسم کے سہارے ہنس دیے
بسر کرتا ہوں اپنی زندگی اپنے سہارے پر
میں اپنے بازوؤں میں زور ایماں لے کے آیا ہوں
بہر حال جینا تھا رو کر کہ ہنس کر
بہر حال جینے کے دن تو گزارے
غم والم کی سیاہ راتوں میں داغہائے جگر کی ضو سے
سحر کے ہنگامہ کا ہے عالم نمود نور سحر سے پہلے
وفورِ تشنگی نے رکھ لیا ترا بھرم ساقی!
ترے ساغر میں پی لی میں نے لہرا کر شراب اپنی

مولانا کی ذہنی دنیا میں جب تک یہ ہنگامے موجود رہے، اس وقت تک انھوں نے کبھی خود کو آزردہ وآشفتہ خاطر نہیں پایا۔تعمیرِ شخصیت کا ان کا جذبہ قرطاس وقلم کی امانتیں سنبھالے فکر وفن کی نئی دنیا کی بشارتیں دیتا رہا:

اٹھا دی درد سے پابندی آہ وفغاں ہم نے
بنا لی زندگانی مستقل اک داستاں ہم نے
جو کالی رات کی محشر فروشی کا یہ عالم ہے
تو پھر کس طرح ہو سکتی ہے میرے رازداروں میں

انھوں نے شاعری ترک کرنے کے بعد اپنی تمام تر توجہ اپنے اصل میدان نثر نگاری پر صرف کردی۔اس طرح ان کی شاعری عہدِ جوانی کی یادگار ہے۔لیکن ان کے شعری سرمائے میں جوانی کم ہی ہے۔جوانانہ سرمستی اور شباب آور جذبات کے بجائے اس میں ایک بزرگانہ سبق آموزی کا رجحان نظر آتا ہے۔میرے ان جملوں پر کوئی معترض ہو کر یہ نہ کہے کہ مولانا کے کلام میں غزلیہ وخمریہ رنگِ سخن

بہت نمایاں ہے اور حسن و عشق کی داستانوں کی شور انگریزی کی چھاپ جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں بھی اس قسم کے اشعار اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں:

اُن کے معصوم و حسیں ابر و مژگاں کی قسم
خود ہمیں دل کو لیے تیغ و سناں تک پہنچے

شراب و جام و ساقی و خمار سب ہیں منتظر
شراب و جام و ساقی و خمار بن کے آیئے

قسم ہے زلف و خال کی برائے آہو انِ نجد
شکار کو نہ آیئے شکار بن کے آیئے

تمھاری یاد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں
ہم اپنے آپ کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں

مجھ کو رنگیں خیال نے مارا
آرزوئے وصال نے مارا

آہ دامن بچاکے مقتل میں
اس قیامت کی چال نے مارا

اِک نظر دیکھ لو جاتے جاتے
اِک شگفتہ کلی چھوڑ جاؤ

اس مقام پر میں یہی کہوں گا کہ مولانا کی اُٹھان جس دینی ماحول اور جس خاندانی روایات اور جن ننہالی اثرات کے تحت ہوئی تھی اور اس کے نتیجے میں ان کی جو مزاجی کیفیت، ذہنی ساخت اور فکری تشکیل ہوئی تھی، اگر اس کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ مولانا کے غزلیہ ذخیرہ الفاظ سے ان کے ظاہری اور سامنے کے مفہوم مراد نہ لیے جائیں بل کہ معنی کی تہ میں اتر کر ان اقدار کا مد و جزر اور دینی و اصلاحی پیمانوں کی تلاش کی جائے، جس کی تعبیر و تفسیر میں مولانا کی پوری علمی زندگی گزری ہے۔ مولانا غزل کی روایت میں ظاہراً انحرافی پہلو پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ نیم قصباتی ماحول کے جن سماجی محرکات کے تابع اور زیر اثر تھے، اُن سے شاعری کی زبان اور اس کے اسلوب میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ ان کی شاعری جس دَور سے تعلق رکھتی ہے، بعض بہت خوش فکر اور طویل القامت شعراء کو چھوڑ کر

تقریباً سبھی کا یہی قدیمی اور روایتی رنگ سخن تھا۔ مولانا کی شاعری اپنے ذوق اور وِجدان کو پیمانہ مان کر پروان چڑھ رہی تھی۔ اب یہ جوانی سے تجربے کی منزل میں جانے والی تھی کہ مولانا نے شاعری ترک کردی۔ اس لیے وہ اسلوب اور علامتِ غزل میں اضافہ کا وقت نہیں پا سکے۔ پھر ان کی غزل گوئی ابھی اپنی ارتقائی منزل ہی میں تھی کہ انھوں نے نثر میں اپنی تحقیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنا شروع کردیا۔

غزل میں بات براہِ راست اور سیدھے سادھے طریقے سے نہیں کہی جاتی بلکہ پیچ دے کر اور پہلودار بنا کر ڈھکے چھپے انداز میں اشارات وتمثیلات کے ذریعے کہی جاتی ہے۔ اس لیے ان اشارات وتمثیلات کا پردہ ہٹا کر معاملہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مولانا کی غزلوں میں وہی علامتی الفاظ اور اشارات وتمثیلات جلوہ گر ہیں جو اُردو شاعری کا سرمایہ یا اس کی خاص پہچان بن چکے ہیں۔ آہ، فغاں، ابرو، مژگاں، تیغ، سناں، صحرا، شراب، جام، صراحی، بادہ کش، میکدہ، جنوں، قفس، چمن، بہار، آشیاں، بیاباں، طوفان، ساحل، دریا، زنجیر، تلخی، سرخی، گل، خار، حسن، عشق، خلوت، بے خودی، زخم، قاتل، بسمل، شب، سحر، برق، شرار، سجدہ، جبیں، آستاں، زنداں، محراب، منبر، نالہ، نغمہ، وفا، جفا، کے الفاظ ان کے غزلیہ کلام میں جابجا نظر آتے ہیں۔ یہ الفاظ جن اشعار میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اُن کے پڑھنے سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ مولانا نے ان الفاظ کو روح سے عاری کرکے استعمال نہیں کیا ہے اور ان الفاظ کا ان کے جذبات و محسوسات سے گہرا، بامعنی اور نتیجہ خیز رشتہ ہے۔ انھوں نے غزل کے جس قدیم سرمائے اور روایتی خزانے سے نسبت رکھنے والے لفظوں کو توسیع معنی کے لیے استعمال کیا ہے اور جن لفظوں میں علامتی رنگ نمایاں ہوا ہے، ان میں مولانا کا رنگِ طبیعت اور خونِ جگر بھی شامل ہے۔ ان علامتی لفظوں میں ان کی دینی و مذہبی قدریں لہو بن کر گردش کررہی ہیں۔ ان کی پسند و ناپسند کے پیمانے، زاویۂ نگاہ، اور اندازِ فکر کی دنیا آباد ہے۔ ہمارے شاعروں نے اپنے خیالات ونظریات میں ادبی اظہار کے رنگ کو ابھارنے کے لیے اپنی علامتی حسیت کی بیداری کا ثبوت فراہم کیا ہے اور جذبات ومحسوسات کی وہ لہریں جو لفظوں کے ظاہری مفہوم یا معنیِ لفظ کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔ بات کی باریکی رائج اسلوب میں منعکس نہیں ہوسکتی، تو ایسے مقام پر معانی ومفاہیم کی کائنات میں وسعت پیدا کرنے کی غرض سے علامتوں کا سہارا لیا جاتا ہے اور لفظوں کے تلازمات سے کام نکالا جاتا ہے۔ غالب نے اسی موقع کے لیے کہا تھا جب وہ ''کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے'' کی ضرورت محسوس کررہے تھے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جہاں بات بنانے سے نہیں بنتی، جہاں خیالات کے طوفان کی رو تیز ہوتی ہے، جہاں ایک بات میں سو پہلو نمایاں کرنے ہوتے ہیں، وہاں علامتیں نسخۂ کیمیا ہیں۔

اس لیے مولانا کی شعری کائنات پر نظر ڈالتے وقت ان کے لفظوں کی ظاہری قبا پر نہیں رہ جانا چاہیے۔ اس قبا کے نیچے جو بصیرت، جو دیدہ وری، جو کائنات شناسی چھپی ہوئی ہے، اس کی تلاش ہونی چاہیے۔ ان کے معانی کی تہ میں غور و فکر کی دنیائیں آباد ہیں۔ غزل کا غزلیہ انداز ان کے نیم پیمبرانہ احساسات و پیغامات کے جلوے کو اپنے زیرِ دامن چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی تفہیم و تعبیر اور تفسیر کے لیے لفظ کا ظاہری پردہ ہٹانا پڑے گا۔ شاعر اپنی بصیرت کا اظہار زمانے کے بنے بنائے طرز و اسلوب میں کرتا ہے۔ روایتیں اس کو سانچے اور پیمانے فراہم کرتی ہیں۔ اس لیے وہ اپنی گہری حسیت کو بھی انھیں وسیلۂ اظہار کے پیرائے میں سامنے لاتا ہے جو اس کے ماضی نے اسے فراہم کیے ہیں۔ بہت کم شاعر ایسے ہوئے ہیں جو اقبالؔ، غالبؔ اور میرؔ کی طرح اپنی زبان، اپنا اسلوب، اپنا رنگ، اور اپنی آواز رکھتے ہیں۔ اگر اپنا رنگ اپنا اسلوب نہ ہو تو اس سے شاعر کے محسوسات و جذبات کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اس کا اپنا پن پھر بھی کسی نہ کسی رنگ میں قائم رہتا ہے۔ مولانا نے غزل کے پیرائے میں جو کچھ کہا وہ اپنی تعبیرات کے اعتبار سے اہم ہے۔ ان کے خیالات میں طہارت اور تاثرات میں پاکیزگی ہے۔ ان کے لہجے اور زبان پر سوقیت اور عامی طرزِ گفتار کا الزام نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اس کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے زاویۂ نظر اور تنقیدی پیمانے میں کچھ تبدیلی پیدا کرنی پڑے گی۔ تبھی ہم ان کے سرمایۂ شعری سے لطف و لذت حاصل کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم مذکورہ بالا مثالوں میں سے پہلے شعر کو لیتے ہیں جو اس طرح ہے:

ان کے معصوم و حسیں ابرو و مژگاں کی قسم
خود ہمیں دل کو لیے تیغ و سناں تک پہنچے

اگر اس شعر کا اس کی اصلی اور واقعی صورت میں جائزہ نہ لیا جائے گا تو اس میں حقیقت کی جو نمایاں جہت ہے وہ روشن نہیں ہو پائے گی اور ہم ظاہری لفظوں سے دھوکا کھا کر اس کو نچلے دھڑ کی جنسی شاعری سمجھنا شروع کر دیں گے اور اس کے ظاہری خیال کو سوقیانہ و بازاری سوچ کا نام دے دیں گے اور اس طرح ہم

اپنے تنقیدی رویے میں مولانا کی شخصیت اور فکر دونوں پر ظلم کرنے کے مرتکب ہوں گے۔ کیوں کہ ان کی جو علمی و دینی حیثیت اور مقصدِ قلم کا جو تقدس ہے، اشعار کی تفسیر و تشریح میں اس سے مناسبت ضروری ہے۔ اس لیے ہم کو دوہرے عملِ تفہیم سے گزرنا پڑے گا۔

شعر کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے ابرو و مژگاں کی خوبصورتی پر ہم نے دل و نظر کو قربان کر دیا۔ گویا محبوب کی بھنویں تلوار بنی ہوئی ہیں اور پلکیں نیزے کی انی ہیں۔

یہ اس شعر کے محض لفظی معنی ہیں۔ حقیقی مفہوم تک پہنچنے کے لیے ہمیں شعری علامت کے پردے کو ہٹا کر دیکھنا ہوگا۔ دراصل ابرو اور مژگاں کی وساطت سے مولانا اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہم نے بڑے علمی کاموں کی اہمیت و ضرورت کا خیال کر کے بے شمار نادیدہ مصیبتوں اور آفتوں کو دعوت دینے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ چوں کہ ہم علم کے شیدائی ہیں اور اس کی ترقی میں جو بھی مصیبتیں ہمیں جھیلنی پڑیں گی ہم بخوشی جھیلیں گے۔

دوسرے شعر کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ سرمستی و نشہ کے تمام سامان فراہم ہیں لیکن بتِ شوخ تری ہی کمی ہے۔ اپنی سرمستی شباب سے لذت اندوز کرنے کے لیے میری خلوت کدہ کو بہشتِ زار بنا دے۔ شعر میں جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں، اُن کو ہٹا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا کو کس حقیقت کا اعلان مقصود ہے۔ وہ دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ علمی کام کرنے کی ساری صلاحیتیں، سارے ساماں اور مواقع موجود ہیں، بس تیری اپنی دلچسپی کے مظاہرہ کی ضرورت ہے۔ اگر تو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے جذبۂ عمل کی مستی سے سرشار ہو جائے تو علم و دانش کے چشمے ابل پڑیں اور ذہن و فکر کی خشک کھیتیاں شاداب ہو جائیں۔

تیسری مثال میں پیش کیے گئے شعر کے سامنے کا معنی یہ ہے کہ اے محبوب اپنے خوبصورت بال اور چہرے سے آہوانِ نجد یعنی ہم عاشق مزاجوں کے شکار کا سامان تیار نہ کر۔ بلکہ ہماری گرمیِ شباب کی چاہت رکھ کر ہماری خواہشِ نفسی کی غلام بننے کو منظور کر۔ شعری علامتوں کے پیرائے سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو شاعر کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ کسی علمی کام کو اس کے مادّی فائدہ پر نظر کر کے شروع نہ کرو بلکہ علم کو آئندہ کی نسلوں تک پہنچانے کے لیے وہ تمام معلوم و نامعلوم مشقت و جاں فشانی گوارا کر لو جو اس راہ میں پیش آنے والی ہیں۔

چوتھی مثال میں جو شعر آیا ہے اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ اے محبوب ہم ترے فراق میں تری

یادوں کو سینے سے لگا کر بیٹھے ہیں اور اپنے آرام و راحت کے تمام وسائل ہم نے تیاگ دیے ہیں۔ یادکو دل سے لگائے رکھنا اور اپنی ذات سے دشمنی کرنا صرف پیرایۂ بیان ہے۔ شاعر کو اپنے علمی نشانے کی تکمیل میں اپنے آرام و آسائش سے بے پروا ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اسی طرح باقی اشعار میں علامتوں کو اس کے مفہوم میں دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ شعر کا ایک ایسا پہلو سامنے آجائے جو جذبۂ جنسی کی لذتوں سے پاک ہو اور جس میں عرفانِ حیات کی رمق اور اس کی روشنی دل و نگاہ کو متاثر کر سکے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ غزل کے موضوعات ہجر و فراق، حسن و عشق، بہار و خزاں، قفس و آشیاں اور اسی طرح کے دوسرے روایتی الفاظ و علائم کے وسیلے سے بیان کیے جاتے ہیں ان جذبات و تصورات کی اہلِ تصوف تربیت کرتے ہیں۔ غزل کے موضوعات و مضامین اور عشقیہ اسلوب و خیال کی مقبولیت کا ایک بڑا راز اہلِ تصوف کے نظریات و رجحانات سے سماج کا متاثر ہونا بھی تھا۔ جسے آج کے کم علم اور بوالہوس کم ہی سمجھ پائیں گے اور اس کو جذبۂ شہوانی کا تابع محمول کریں گے۔ جب کہ اس دور میں آج کی فحاشیت و سوقیت کے مقابلے میں اس طرح کی سماجی برائیوں کا خیال بھی کسی گوشۂ ذہن میں نہیں اُبھرتا تھا۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنی دنیا خود آباد کی ہے۔ اپنے ذہن و فکر کی تعمیر کے معمار وہ خود ہیں۔ اپنی شخصیت کو نکھارنے سنوارنے اور اس کو رنگ و روغن دینے میں، انھوں نے اپنے شعور کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ ان کی تمام جدوجہد اور عملی و فعلی سرگرمیوں میں ان کے خارجی ماحول کا کم ان کے اندرون کا زیادہ ہاتھ ہے۔ ان کے علم و مطالعہ کتب خانوں اور کتابوں کی سیر نے انھیں ایک بڑا عالم دین بنا دیا تھا اور ان کی شخصیت کو اتنا چمکا دیا تھا کہ بڑے سے بڑے محقق بھی ان کی تحقیقات و تجزیہ سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ مولانا کی نظر میں اسلامی فکر کے وہ تمام دبستان اور ملی و تحریکی رجحان تھے، جن کے اثر و نفوذ نے اقوام و ملل کی تاریخ و تہذیب، تحریک و تبلیغ میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے راستے بنائے۔ انھیں منہاج و معیارِ اقدار دیا۔ اسلام کے بنیادی عقائد جن کا براہِ راست ماخذ قرآن و حدیث اور تعامل صحابہ تھا اہلِ علم کے تفحص و تجزیہ میں حالات و زمانہ کے چھائے ہوئے اندھیروں میں ید بیضا بن کر ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ اس لیے اس سے بھی انکار ناممکن ہے کہ ان کی دنیا، ان کی شخصیت، ان کی فکر کی تعمیر کے لیے سنگ و خشت اور مسالے صحت مند اسلامی روایات و اقدار کے وسیع و وقیع ذخیرے سے حاصل کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کو قبول کرنے میں بھی ہمیں کوئی تامل و تکلف، تردد و توقف نہیں کرنا چاہیے کہ انھوں نے ان

تمام کوششوں میں، ردوقبول، اخذ وترک کے سارے عمل میں اپنے شعور، اپنی بیدار طبیعت داری، اپنی ذہنی ساخت سے زبردست کام لیا ہے۔ اپنی مجتہدانہ فکر کو رہنما بنایا ہے۔ ہر اک راہ رو کو راہبر سمجھ کر دور تک اس کے ساتھ نہیں چلے ہیں۔ ان کے اکتسابات علمی ان کے تقلیدی رجحان رکھنے اور نرا مقلد ہونے کی تردید کرتے ہیں۔ ایک جگہ اپنی خود نوشت سوانح عمری'' قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے ص:۲۲ میں لکھتے ہیں:

''میں فقہ کے درس میں اکثر امام شافعیؒ کی حمایت کرتا تھا اور استاذ مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اکثر سوچتا تھا کہ متاخرین ائمۂ احناف خصوصاً علمائے ماوراء النہر کی کتابیں کیوں پڑھائی جاتی ہیں۔ قدماء کی امہاتِ کتب کہاں ملیں گی، جن میں فقہ حنفی کی صاف ستھری روح موجود ہے اور فروعات کا استخراج احادیث وآثار سے کیا گیا ہے''۔

اس عبارت ہی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس کا دورِ طالب علمی اتنا حقیقت آگاہ رہا ہو، کتاب ومطالعہ کے بعد اس کا دورِ آخر حق آشنائی کے کس بلند مقام تک پہنچ چکا ہوگا۔

مولانا قاضی اطہر کی پوری تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں دارالعلوم دیوبند کی دینی واصلاحی، سیاسی وسماجی تحریکات سے متاثر وعلمبردار مولانا شکر اللہ مبارک پوری متوفی ۱۳۶۱ھ کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا شکر اللہ مبارک پوری کی پوری عملی زندگی مبارک پور میں مختلف محاذوں پر جدوجہد اور مناظرہ بازی میں گزری، علم النفس کی روشنی میں محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی جنگوں میں گھرے ہوئے انسان کی نفسیات اپنے مسلکی تصلب وتحزب بلکہ کسی قدر تعصب کے رنگ وآہنگ، تب وتاب کی نمائندہ بن جایا کرتی ہے۔ اسی لیے آج امتِ مسلمۂ ہند کے وہ قائدین ومدارسِ دینیہ جو اسلامی افکار ونظریات پر مبنی سماج کی تشکیل اور معاشرہ کی فکری وعملی تطہیر کا کام بڑے پیمانے پر کرنا چاہتے ہیں یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ مناظرانہ ومجادلانہ طرز اظہار ونقشۂ عمل سے اسلام ومعاشرہ کی کوئی زیادہ بہتر خدمت نہیں ہو پاتی۔ بلکہ یہ اتحاد وارتقائے انسانی کے سفر میں پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتے ہیں۔ مولانا قاضی اطہر کا یہ کارنامہ اپنی معنویت کے اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اپنے فکری دھارے اور اپنی نظریاتی زمین سے ہمیشہ جڑے رہے۔ اس کے باوجود کبھی کسی ایک مسلک وعقیدہ، ایک مکتبۂ فکر وخیال کے مبلغ ومفسر بن کر نہیں رہے۔ ان کی تمام تر علمی وفکری، دینی واصلاحی جدوجہد نقطۂ اتصال اور قدر اشتراک کی تلاش وجستجو سے عبارت رہی۔ میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کرسکا کہ ان کا دل زیادہ بڑا تھا

کہ ان کا ذہن زیادہ کشادہ تھا۔ حقیقت جو بھی رہی ہو ان کی علمی وفنی قدر وقیمت متعین کرنے والا ناقد ومبصر اِس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ مولانا کا قلم ہمیشہ مثبت جہات کو روشن کرتا رہا۔ اُن کے نوکِ قلم سے پھوٹنے والی کرن نے تعصب وتنگ نظری کے اندھیروں سے کبھی مصالحت نہیں کی۔ انھیں ہمیشہ یہ اندیشہ ستاتا رہا کہ:

اسیرِ حلقۂ قوم و وطن ہے دیدۂ مومن
بپا ہے میکدہ میں امتیازِ این آں ساقی
جبینوں کی یہ محرومی نہیں تو اور کیا شے ہے
کہ تیرے ایک کعبہ میں بنے دو آستاں ساقی
گلستاں میں بہار آئی کہ اک دَور نفاق آیا
گل اخلاص میں بوئے ریا معلوم ہوتی ہے
سکوت مصلحت آمیز کب تک اے جنوں کارو!
مبادا ہو نہ جائے محفلِ روح ونظر سونی
سما آئی ہے دل سے شدّتِ نالہ نگاہوں میں
سکوتِ شام آجائے نہ ہستی صبح گاہوں میں
مجھے ڈر ہے نہ لٹ جائے سحر کو کاروانِ شب
ستاروں کی قطاریں ہیں ابھی تاریک راہوں میں

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ دار العلوم دیو بند کی اصلاحی تحریک اور مولانا شکر اللہ مبارک پوری کے اثرات نے قاضی صاحب کے ذہن ودل میں علمی ودینی بیداری کے جذبات وخیالات کو شدت ضرور بخشی لیکن وہ فرقہ وارانہ اور مسلکی فکر وشعور اور تنگ نظری کی لعنت سے کوسوں دُور رہے۔ تعصب وتنگ نظری انھیں اکثر پریشان کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلامیت اور دینی وسعتِ نظر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ قاضی صاحب کو مختلف زاویوں سے جاننے اور سمجھنے کی کوشش ضرور ہوئی، لیکن اصل قاضی اطہر کو ہم آج بھی تلاش نہیں کر سکے ہیں۔ مسلکی عصبیت، علاقائی ونسلی امتیاز، خاندانی فخر ومباہات، جغرافیائی وطبقاتی نخوت کے خلاف ان کا ردِ عمل شدید تھا۔ وہ دین میں زور زبردستی اور لڑائی جھگڑے سے سخت آشفتہ خاطری محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی داستانِ طالب علمی ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں ایک مقام پر

اپنے دور کی مسلکی عصبیت کا ذکر جن تاسف بھرے لفظوں میں کیا ہے۔ اسی سے ان کی تعصب بیزاری اور جماعتی ناوابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں مبارک پور میں شیعہ سنی اور دیوبندی بریلوی لڑائی جھگڑے کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ ہر فرقہ کے پہلوان لنگوٹ کس کر میدان میں زور آزمائی کر رہے تھے اور یہاں کے عوام اپنے اپنے علماء کو باہر سے بلا کر اپنے مخالف کو کافر و بددین بنا رہے تھے۔ مہینوں مہینوں جانبین سے سوالی و جوابی تقریریں ہوتی تھیں، مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے۔ پھر مار پیٹ اور مقدمہ بازی کی نوبت آتی تھی۔ عوام و خواص اس میں وقت، صلاحیت اور دولت خرچ کرنے کو عین دین اور کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ گروہی عصبیت اور جماعتی جانبداری کی وجہ سے انفرادی اور شخصی باتیں پارٹی کا مسئلہ بن جاتی تھیں۔ دیوبندی جماعت کی سرگرمیوں کا مرکز مدرسہ احیاء العلوم تھا''[1]

اس عبارت کے بین السطور اور بطن معنی سے جو تاثر اُبھرتا ہے وہ یہی ہے کہ مولانا کو اپنے گردوپیش کے تکثیری سماج کی وہی اجماعی اور ملی جلی قدریں عزیز ہیں جو قومی دھارے کی شکل اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور جن کی اجماعی و حرکی قوت سے انسانوں کو تقسیم کرنے والی ذہنیت کو بدلا جاسکتا ہے۔ نیچے کی عبارت سے مولانا کی تکثیر پسندی پر خوب اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔ اس عبارت سے میلانِ طبع کے منہاج و منبع کا بھی علم ہوتا ہے۔

''احسان و تصوف کا ذوق فکری حد تک ہے اب بھی ہے گو عملی طور سے اس سے دور ہوں۔ حقیقی تصوف اور صوفیاء سے عقیدت و محبت ہے اور بزرگانِ دین اور مشائخ عظام کے تذکرے میں بڑا لطف و سکون پاتا ہوں''[2]

ان کی اسی طبیعت داری کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مرکزِ عقیدہ و مسلک سے وابستہ رہنے کے باوجود کبھی وہ رویہ نہیں اپنایا کہ حنفی و سنی رہتے ہوئے سلفی شدت مزاج کے بالکل قریب پہونچ جاتے۔ یا وہ روش اختیار کر لیتے کہ بریلوی و شیعی تشخص کی نمائندگی و ہمنوائی کرنے لگتے اور فروعی و نزاعی امور کو فرض و واجب کے درجے میں رکھ کر اس پر تعامل و مداومت اختیار کر لیتے۔

دراصل ان کے تاریخ کے مطالعہ اور اس مطالعہ سے حاصل ہونے والی گہری بصیرت نے ان

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرہ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۷ء (ص:۱۶) [2] ایضاً (ص:۴۸)

میں وہ میانہ روی اور اعتدال پسندی پیدا کر دی تھی، جس سے مختلف فرقہ جاتی وگروہی رجحانات ومیلانات
جماعتی وحزبی تصورات وخیالات، مختلف دبستانی وفقہی عقائد ونظریات اور مسلکی ونظری توجیہات
وترجیحات میں نتیجہ خیز ہم آہنگی پیدا کرنے اور قدر اشتراک کی تلاش کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔

وہ اپنی علمی وتحقیقی صلاحیتوں اور فکری وفقہی بصیرتوں کے حوالے سے ایک ایسے نقطۂ اتصال پر
تھے جہاں ہر مثبت کثیر الجہتی کی روشنی موجود تھی۔ ان کے انحراف میں مرحلۂ سود وزیاں کا تجزیاتی شعور،
کی تقلید میں حالات وزمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ وہم رشتہ ہونے کا اضطراب، ان کے افکار
میں خداداد بصیرتوں کا نور، ان کی تائید وتردید میں چودہ سو سالہ فکر اسلامی کے رنگ صد ہزار کا جلوہ اپنی
خلد یقیں کے ساتھ موجود ہے۔ اس لیے نہ وہ خالص دیوبندی تھے، نہ بریلوی، نہ کم سواد وہابی تھے، نہ
ولایت علی اور بغض معاویہ کو کلِ ایمان سمجھنے والے شیعہ، نہ باطنی تعلیم کے زیرِ اثر ہر نص قرآنی کی تاویل
روحِ اسلامی کے عین موافق کہنے والے بوہرہ تھے۔ نہ وہ معتزلی تھے نہ اشاعرہ کے گروہ سے اُن کا تعلق تھا
وہ دبستانِ ولی اللہی کے خوشہ چیں تھے۔ فکر ولی اللہ براہِ راست قرآن وحدیث کے علوم ومعارف سے
مستنبط ہے۔ جس میں انسان کی جغرافیائی ونفسیاتی پیچیدگیوں کی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ اسی بنا پر
سے اس میں وہ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، جو ہر مسلک وفرقہ اور مکتبۂ فکر کے اساسی پہلوؤں کی
تلاش وشناخت کر کے ایسی بنیاد فراہم کرتی ہے، جس سے تمام اسلامی فرقوں کے درمیان مفاہمت کی راہیں
روشن ہو جاتی ہیں۔

مولانا اپنی عبقریت وعلمیت کی بلندی کے باوجود مبارک پور میں وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکے
جس کے وہ مستحق تھے۔ یہ اُن کی شخصیت اور ان کی عظمت کی کمی نہیں ہے۔ اس میں مبارک پوری سماج کی
دینی سطحیت اور مسلکی جذباتیت کا قصور ہے۔ مبارک پور ایک ایسی بستی ہے جہاں علومِ اسلامی کے کئی
چراغ روشن ہیں، مگر اس بستی کا دِل اس کی روشنی سے محروم ہے۔ یہ عربی طلباء کو مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھائیں گے، ان کی جاگیر لگائیں گے، قیام وطعام کا معقول انتظام کریں گے
مگر اپنے بچوں کو مدرسہ کے ماحول سے دور رکھیں گے۔ یعنی اپنے اندرونِ خانہ کی قندیلیں دوسروں کی دہلیز
میں لٹکا آئیں گے۔ یہ ہے ان کی ایثار نفسی اور دینداری، جب صاحب جبہ ودستار مولوی آئے گا تو نذرانے
کے پردۂ زنگاری میں حسن عقیدت میں کچھ اور اضافہ ہو جانے کے لالچ سے گلا پھاڑ پھاڑ کر اس عمل دین
بیزاری اور اولاد کی حق فراموشی پر کلماتِ تحسین ادا کرے گا۔ فروعی مسائل میں بٹے ہوئے یا اس تکفیری ماحول

رکھنے والے قصبہ، مسلکی و جماعتی منشور کے حصار میں جکڑی ہوئی ذہنیت اور شخصیت پرستی کے دبیز کہرے
میں گھری ہوئی ذہنی غلامی و فکری گھٹن کے ماحول میں اپنی خاک سے اٹھنے والے آفتاب و ماہتاب کو اگر
والے نہ لیں تو کوئی تعجب خیز اور غیر معمولی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ یہاں ہر مسلک کی ترجمانی اور
بچانے والے
نمائندگی کرنے والے کم بصیرت مدارس وخانقاہ سے گہری اور اندھی وابستگی نے اس قصبہ کے تکثیری معاشرہ
سے تہذیبی و دینی مقاصد و ثمرات حاصل کرنے کے تمام راستے مسدود کر رکھے ہیں۔ مسلکی عصبیت کے
کھینچے ہوئے خطِ منحنی سے ذرا سے انحراف کو کفر و ارتداد سے زیادہ سنگین گناہ کا حکم سنانے والا فتویٰ صادر کرنے
والے بے مغز فقیہانِ شہر معاذ اللہ داورِ محشر کے خصوصی اختیارات کو چھین لینے کی تمنا کے ساتھ بندگانِ خدا کو
عذابِ شدید کا ایسا فیصلہ سناتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ:

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غمناک نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

قاضی صاحب کو اس اندھی بہری نظریاتی وابستگی اور جماعتی وفاداری بشرطِ استواری کے ماحول میں کیا داد علم و تحقیق مل سکتی تھی کہ اس کے نہ ملنے کی شکایت کی جائے۔ وہ اپنے علم وشعور، اپنے مزاج ونگاہ اور اپنے مشرب ومسلک کے اعتبار سے کسی بندھے ٹکے نظریہ، کسی غیر نامیاتی سوچ اور منجمد فکر کے انسان نہیں تھے۔ اس لیے ان کی اپنی جماعت نے بھی انھیں نظر انداز کر دیا۔ کیوں کہ یہاں کی زندگی میں اسے ہی فروغ ملتا ہے جو جماعتی جانبدار بن کر رہے۔ جماعت سازی کے ماحول میں ہمیشہ کم سوادوں کو ظلِ الٰہی سمجھا جاتا ہے۔ جذباتیت خواہ کسی طبقہ میں ہو اس کا فائدہ اہلِ علم کو کم، مذہبی سیاست کے بازیگروں کو زیادہ ملتا ہے۔ فرقہ واریت اور مسلکی عصبیت کے ماحول میں صلاحیت وبصیرت سے محروم لوگوں کو ہی ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی لیے تعصب وتنگ نظری ہر دور میں ہر رنگ میں اور ہر اعتبار سے قوم و وطن کے حق میں انتہائی مضر ثابت ہوتی ہے۔

مولانا قاضی اطہر حساس تھے ہی اس کے ساتھ اُن کا مشاہدہ بھی انتہائی غیر معمولی تھا۔ قاضی اطہر فکر وعمل جہدِ پیہم اور کتاب وقلم کے ایسے مجاہد کا نام ہے جو تصورات کی رومانیت اور تخیل کے خلاءِ بسیط سے دور بہت دور حقیقت کی سخت زمین پر اپنے پاؤں مضبوطی سے جمائے کھڑا رہا۔ شخصیت پرستی کی قدیم وخانقاہی روایت اور مدرسائی طرز وطریق کے کہرے میں گھرے ذہن ودل کو بدل کر اسے ہم عصر زندگی کے تقاضوں سے آشنا کیا۔ انھوں نے گل وبلبل کی شاعری سے الگ حقیقت آشنا ہوتی ہوئی دنیا کی گرہ کھولنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے تحقیق کو نظریاتی سیاست کی فسوں کاری اور مسلکی ذہنی تحفظات

سے آگے بڑھ کر عہد و دور میں نئی روشنی کی آئینہ داری کی ہے۔ اصل تلاش اطہر تاریخی تحقیق ہی میں خاص طور سے چار سو سالہ ابتدائی اسلامی عرب و ہند کے تعلقات میں دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کو غزلیہ اندازوں کی پابندی اور تصورات کی رفعتوں سے زمین پر اتار کر زندگی کی سنگین سچائیوں اور حقیقت کی نامعلوم پہلوؤں، نیز واقعات کی تہوں سے نہایت فنکارانہ طریقے سے روشناس کرایا ہے اور اس حقائق شناسی کے وسیلے سے انھوں نے زندگی کی سمت و رفتار کے رخ کو متعین کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے:

بہر قیمت بدلنا ہے نظام میکدہ ہم کو
پہنچے دو اگر پیر مغاں تک بات جا پہنچی

اسلام کی جنس الفت کو آنچ کے تعصب نے لوٹا
مسلم نے نگاہ رحمت کو شمشیر غضب جلاد کیا

اور اپنی اس امید و رجائیت کا اظہار کیا ہے:

ایک ملت، ایک امت، ایک ہی فکر و نظر
سرزمین اندلس سے تا بخاک کاشغر
ہوں گے انسان بھائی بھائی، ہوگی دنیا ایک گھر
آج پھر ہوگی یہ امت، بے مثال و بے عدیل
الرحیل اے رہروان راہ کعبہ الرحیل

مولانا خود شناس بھی تھے اور ادا شناس بھی، وہ اپنی فکری معنویت اور اپنے کام کی اہمیت کو جانتے تھے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ مثبت جہات کو روشن کرنے کا عمل کسی جبین کی شکن کا سبب نہیں بن سکتا۔ انھوں نے ترک و قبول کے عمل میں جو وچار منتھن یا تجزیہ کاری کی ہے، اس کے اچھے نتائج نکلنے کی انھیں قوی امید ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کاموں کی وجہ سے انھیں کوئی گزند پہنچائے ناممکن ہے۔ فرماتے ہیں:

وسعت نگاہ شوق کی محدود کیوں کروں
جلوؤں کو بے پناہ کیے جا رہا ہوں
مری ہستی نگاہ غیر میں ہو خار ناممکن
ہوا جاتا ہوں گم اطہر میں خود اپنی نگاہوں میں

کے دوسرے شعر سے جو ایک اور بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کا قطب معنی یہ فلسفہ ادا[illegible] ہی، ہاں کہ ضمیر کی آواز انسان کی سب سے بڑی محتسب ہوتی ہے۔ حد اعتدال سے تجاوز کرتا ضمیر کے احتساب کا سبب بنتا ہے۔ داورِ محشر کی عدالت میں جو فیصلہ ہونے والا ہے ضمیر کا احتساب اسی جیتی جاگتی زندگی میں اُس سے آگاہ کر کے اِصلاح وتزکیہ کی تنبیہ کرتا ہے۔ وہ مثبت پہلوؤں اور تعمیری قدروں کے فروغ میں حصہ لینے کے لیے ابھارتا ہے۔ مولانا ایک دوسری غزل میں فرماتے ہیں:

بڑی شے ہے جہاں میں ہم نشینو! دل کی خودداری
ہزاروں ذلتیں بہتر ہیں اِک رسوائی دل سے

اسی تناظر میں مولانا کی رجائیت بھی ملاحظہ ہو جس میں دقتِ نظر بھی ہے اور اطمینانِ قلبی کا سامان بھی:

یہ میرا ذوقِ بینش ہے، کہ لطفِ برقِ پیہم ہے
ہر اِک شعلہ میں عکسِ آشیاں معلوم ہوتا ہے
خدا جانے وفورِ درد کو سمجھا ہے کیا میں نے
مجھے ہر گریۂ غم میں ہنسی معلوم ہوتی ہے

مولانا کا یہی ذوقِ بینش ہے جو تخریب میں بھی تعمیر کے پہلو کو دیکھ لیتا ہے اور مستقبل پر اپنے ایمان کو متزلزل نہیں ہونے دیتا:

ہماری بزم سے دامن کشاں وہ چاند ہے لیکن
ہماری شامِ غم میں خود مچل کر چاندنی آئی
قفس کی تیلیاں ٹوٹیں گی، بدلے گا یہ دور اطہر
گرفتاروں سے کہہ دو، اہتمامِ بال و پر کر لیں
پرانے قیدیوں سے پوچھ لو، اے نو گرفتارو!
اسی زنداں میں تعمیرِ گلستاں ہونے والی ہے
فراقِ گوہرِ مقصود میں رو لی ہے کھل کھل کر
نگاہِ پیرِ کنعاں یوسفستاں ہونے والی ہے
مرے آئینۂ امروز میں تصویرِ فردا ہے
اسی زنداں میں کل سیرِ بیاباں ہونے والی ہے

سیہ خانۂ غم کی دنیا سلامت

اگائے ہیں ہم نے یہیں چاند تارے

شاعری کائنات میں کھوئے ہوئے انسان کی بازیافت بھی ہے، امروز و فردا کی آواز کی شناخت بھی ہے، اس کے علاوہ شاعری خود شاعر کی شخصیت کی بھی دریافت ہے اور ماضی کی تلاش بھی۔ شاعری میں اندروں بھی بولتا ہے اور اس کے پردے میں ماحول بھی گنگناتا ہے۔ یہ بیداری کا نغمہ بھی ہے اور سوئے ہوئے انسان کی الہامی کیفیت بھی۔ یہ خواب زندگی بھی ہے اور زندگی کی تعبیر بھی۔ یہ تنقیدِ حیات بھی ہے اور مسائل عصر کی تفسیر بھی۔ جو حواس انسانی کی دسترس سے بالا ہوتا ہے۔ شاعر اس کو اپنے الفاظ کے نگارخانے میں سمیٹ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے شاعر کے ماوراءِ سخن میں بھی اِک بات ہوتی ہے اس طرح کی شاعری ذہنی و روحانی بیداری کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ ذہنی و روحانی بیداری اسی وقت پیدا ہوتی جب سوچ اور تنہائی کے درمیان بامعنی مفاہمت اور نتیجہ خیز رفاقت ہو۔ مولانا کے یہ اشعار پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ یہ اشعار انسان اور کائنات کے باہمی رشتوں کو سمجھنے کے لیے راہبانہ تجرد کی تنہائی اور سوچ کو مہمیز کرتے ہیں:

خودی نے بخشا ہے عشق میں وہ مقام دِل کو نظر سے پہلے

کہ آہ تک ناروا ہے ہم کو کسی کے غم میں اثر سے پہلے

گواہ تابانیِ ابد ہے ازل کے دیباچۂ نمو میں

تجلیاں منتشر تھیں لاکھوں نمود شمس و قمر سے پہلے

کبھی جب غرق ہو جاتا ہوں اطہرؔ اپنے شعروں میں

بہت ہی دور رس طبعِ رسا معلوم ہوتی ہے

مولانا کی شاعری بے وقت کی راگنی اور بے موسم کا ملہار نہیں ہے۔ وہ جب اپنے اندر کوئی جذبہ، کوئی فکر، کوئی تڑپ، کوئی خلش درد، کوئی بیتابیِ دل، کوئی ذہنی کشمکش، کوئی لمحۂ غم، کوئی سوزِ دروں، کوئی محشرِ خیال، کوئی اضطرابِ قومی، کوئی دردِ ملی، کوئی مسئلۂ وطنی اور کوئی کہنے کے لائق بات پاتے ہیں، تبھی ان کی غزل خوانی اور شعرگوئی اپنی زبان کھولتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں سوز و ساز اور دِل میں اتر جانے والے انداز پیدا ہوگئے ہیں۔ ان کی شاعری ''از دِل خیزد بر دِل ریزد'' کی تفسیر ہے۔ سچ ہے ''دِل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' کلام میں آمد کی جو شان ہماری توجہ کو بار بار اپنی طرف مبذول

کراتی ہے۔ اُس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان کا نغمۂ نَے، ان کے گلے سے نکلنے والی لے، ان کی آہ، ان کی واہ سب میں وقت وحالات اور رفتارِ زمانہ کی رعایت موجود ہے:

ہمیں اس بات کا دعویٰ نہیں کہ ہم نہیں پیتے
مگر اتنا تو کرتے ہیں کہ بے موسم نہیں پیتے
طبیعت آ گئی تو پھر کسی موسم کی کیا حاجت
طبیعت جب نہیں آتی کئی موسم نہیں پیتے

مولانا کی شاعری اکتسابی نہیں تھی وہبی تھی، وہ شاعر کا دل ودماغ لے کر دنیا میں آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بے منتِ استادان کی طبعی وخلقی شعر گوئی اپنی صحیح سمت میں اپنے سفر کا سامان تازہ کرتی رہی۔ اپنے بال وپر کو کھول کر ارتقاء کی طرف پرواز کرتی رہی۔ انھوں نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ:

''اردو تعلیم ہی کے زمانے سے شعر وشاعری کا ذوق رکھنے لگا تھا۔ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔ مضمون نگاری کی طرح شعر وشاعری میں بھی کسی سے اصلاح یا مشورہ کی باری نہیں آئی اور اپنے ذوق ہی کو رہنما بنایا۔ خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھا تو اس میں بھی بہت زیادہ انہماک ہوگیا''[1]

مولانا کی اسی جبلی شاعری کی وجہ سے ان کی زبان میں لکنت نہیں۔ وہ بات صاف اور سلیس پیرائے میں کہہ جانے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔ ان کے کلام میں افلاسِ خیال اور فاقۂ فکر کی پرچھائیاں کہیں نہیں ملتیں۔ ان کی خوش خیالی اور فکر آفرینی کی فیاضی اپنے عروج پر ہے۔ ان کی نگاہ سماج اور کائنات کے بکھرے ہوئے رنگا رنگ مظاہر پر ہے۔ وہ ان سے متاثر ہوتے ہیں اور تحریک شعری کے تابع ہو کر شعر خوانی کرتے ہیں۔ واقعات کی جزئیات کے سہارے وہ بڑی سے بڑی اور کارآمد باتیں پیدا کر لیتے ہیں۔ واقعات جو ایک عام انسان کے لیے معمولی درجہ رکھتے ہیں مولانا کی نگاہِ سخن میں وہ بھی اپنے اندر لمبے اور طویل وقوعے کی کڑیاں رکھتے ہیں۔ ان کے شعری تجربے اپنی غذا انھیں چھوٹے چھوٹے واقعات سے حاصل کر کے نشو ونما پاتے ہیں۔ ان کے شعری تجربے سچے اور اثرانگیز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اشاروں میں کہانیوں کی دنیائیں آباد رکھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر اسی طرح کا تاثر چھوڑتا ہے:

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ دائرۂ ملیہ مبارک پور ۱۹۸۱ء (ص: ۴۱)

سنا دیتا ہوں دل کی آپ بیتی پھر بھی دانستہ

بسا اوقات عنوانِ فسانہ چھوٹ جاتا ہے

محبوب کی پھول برساتی ہوئی مسکراہٹوں کے حوالے سے اپنی غزلیہ شاعری میں بظاہر وہ زندگی کی کامیابیوں اور حالات کی شگفتگی کی طرف ہمارا ذہن لے جاتے ہیں مگر حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کا پیرایۂ بیان اختیار کر کے زندگی کے قرب کی شدت اور حالات و مسائل کی سنگینی کے عذاب کی نقشہ کشی کرتے ہیں۔ ان کے تبسمِ زیرِ لب کے پیچھے غم و آلامِ روزگار کا ایک دور تک پھیلا ہوا کالا سمندر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی ظاہری بشاشت اپنی حقیقت میں زخم خوردہ ہی ہوتی ہے لیکن اس زخم خوردگی کا عرفان حاصل کرنے کے لیے فلسفی کی نظر چاہیے اور یہ حقیقت بھی تسلیم کر لی گئی ہے کہ کیفیتِ دل کو ناپنے والا پیمانہ ہر کسی کو نہیں ملتا کہ وہ رمز شناس بن جائے۔ یہ اطہر جیسے روشن دماغ لوگوں ہی کے حصے میں آتا ہے:

تھے غنچے مہر بر لب منتظر ادنیٰ اشارے کے

ذرا سے وہ ہنسے تو گلستاں تک بات جا پہنچی

اس شعر میں ''گلستاں تک بات جا پہنچی'' کا جملہ بڑا معنی خیز ہے۔ اس کے ظاہری و باطنی دونوں پہلو ہیں لیکن شعری مزاج میں ایک بات کے سو پہلو پیدا کرنا، اس کے ماورائے سخن کی جذباتیت یا تیزابیت کے عین مطابق ہوتا ہے اور وہ سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ ہو شاعر کا مطمحِ نظر ٹھہرتی ہے۔ اس لیے کہ بات کی تاثیر بڑھانے کے لیے ناگفتنی بہت بڑا سہارا ہوتی ہے۔

دل کے ٹکڑے تو دامن تک آئے

بات دل کی نہ آئی زباں تک

یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں خموشی زبان بن جاتی ہے اور بے زبانی گفتگو کرنے لگتی ہے۔ مولانا کی شاعری میں یہ مقام بار بار آتے ہیں۔

ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ہیں، جن کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ انھیں اپنی شخصیت، اپنی عظمت اور اپنے علمی وقار کا بھی احساس ہے۔ لیکن اس احساس کے پیچھے کوئی کبر و نخوت یا بے جا تعلّی نہیں ہے۔ وہ اپنی شخصیت کی گہرائی و گیرائی اور ہمہ گیری کو اپنے خدا کا عطیہ تصور کر کے تحدیثِ نعمت کے جذبات سے سرشار رہتے ہیں، اس لیے انانیت کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کے کلام میں

ں کو اپنے مقام و مرتبہ کی بلندی کا جو عرفان حاصل ہوا ہے اس نے انھیں مقام عبدیت سے بھی بہت
یب کر دیا ہے:

ہے سجدۂ بے ریا کا جذبہ، متاعِ کون و مکاں سے بڑھ کر
کہ وجد میں آ کے جھوم اُٹھا، کسی کا در میرے سر سے پہلے
بہت آگے نکل آیا ہوں میں صحرا کی وسعت سے
ابھی تک جستجو ہے، کارواں در کارواں میری
ان کی محفل میں بھی میرا تذکرہ ہونے لگا
اب تو میری داستاں بھی داستاں ہونے لگی
کون پھر آئے سننے سنانے
ہے یہ محفل میری داستاں تک

مولانا نے زندگی میں علم و تہذیب کی امانتوں کا جو بارِ گراں اپنے سر لیا اور شبانہ روز کی
ال فشانیوں، جاں کاہیوں کی اور جگر کاویوں کے سہارے اسے اس کے تمام تر حقوق فرائض کے ساتھ
کمیل تک پہنچایا، اس کی جو مرقع کشی ہو سکتی ہے وہ اس سہلِ ممتنع دو شعر میں منعکس ہے:

چار تنکوں کی ہمت تو دیکھو
اُڑ گئے خود ہی برقِ تپاں تک
سر کی بازی نہیں ختم سر تک
ہارنی پڑتی ہے اس میں جاں تک

نصد میں اخلاص بھی ضروری ہے اور اخلاص ہو تو ناکامی و نامرادی کو نا کام و نامراد ہونا پڑتا ہے:

یہ جبیں کی رسائی عبث ہے
گر نہ سجدے گئے آستاں تک

قاضی صاحب نے جو علمی کارنامے انجام دیے دنیا نے ان کا اعتراف کیا اور انھیں خود بھی اپنے
اموں کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ وہ ان تمام کامیابیوں کے باوجود اپنی زندگی کے اہداف و ترجیحات کو ایک
سرے رخ سے بھی دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ اپنی صلاحیتوں سے واقف تھے، لیکن ان کے ظہور و مظاہرہ
ں جو وقت لگتا تھا، قاضی صاحب کی مصروفیات و مشغولیات کو دیکھتے ہوئے وہ نہیں ہو سکتا تھا، وہ اپنے ہر

کام کو سلسلہ وار حسنِ ترتیب کے ساتھ کرنے کے قائل تھے۔ اس لیے اُن کی سرگرمیوں کو وہ وسیع ابعاد نہیں مل سکی، جس کی تمنا اُن کا نا آسودہ ذہن کر رہا تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے، جن سے جوانی میں ان کی علمی تشنگی اور اظہارِ فن کی نا آسودگی کا اضطراب ظاہر ہو رہا ہے:

ایسے جیے کہ گلشن وہم خیال میں
تنکے بھی چند شوق سے یکجا نہ کر سکے
تُف ایسی زندگی پہ ہے، جیتے رہے مگر
ہم زندگی کا فرض بھی پورا نہ کر سکے

اِسی احساس کے تحت مولانا اپنی جوانی میں شعر و شاعری کی زلفِ گرہ گیر سے اس لیے آزاد ہو گئے کہ انھیں آہ اور واہ سے الگ ہو کر کچھ نئی دنیا، نئی دِشا، نئی روشنی، نئی حقیقتیں، نئی جہتیں، نئی تہیں روشن کرنے کے راستے نظر آنے لگے تھے۔ اُن کے ذوق کو صبحِ فردا کے دامن میں خلدِ یقیں کے دروازے کھلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور اُن کے باطن میں روشنی کے جو دریچے کھل چکے تھے، اس کا نظارہ دِکھانے کے لیے انھیں شاعرانہ زندگی کی بے اعتدالیوں اور نارسائیوں کو خیر باد کہنا ہی پڑا۔

قاضی صاحب نے ارادتاً شاعری چھوڑ کر مضمون نگاری اور خدمتِ نثر کے جذبے سے سرشار ہو کر کچھ کر گزرنے کی تمنا کے ساتھ نثر کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ وہ علمی و تمدنی اور تاریخی و دینی بصیرتوں کے حوالے سے کچھ کہنے اور کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اس کام میں تعبیر و تفسیر، تجزیہ و تحلیل کا حق نثر ہی کے ذریعے سے ادا ہو سکتا تھا۔ شاعری کی ''تنگنائے غزل'' ان کے عظیم اور منصوبہ بند حوصلے کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی اور وہ کارِ خلیلی کی بت شکنی اور کارِ پیمبری کی روایت سازی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اس ترکِ تعلقات اور کاروبارِ سخن سے کوئی سروکار نہ رکھنے سے یہ تاثر قائم کرنا کہ پھر قاضی صاحب کی شاعرانہ حسیت کو گہن لگ گیا، ان کی صلاحیتوں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہو گی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل اور ذہن پوری عمر ایک شاعر کا رہا۔ انھوں نے شاعری کو چھوڑا مگر شاعری ان کو کبھی نہیں چھوڑ سکی اور اس کی گدگدی ہمیشہ ان کے اندروں میں زندگی کی رمق پیدا کرتی رہی اور خواب و خیال کے شفق زار میں دھنک رنگ روشنی بکھیرتی رہی۔ قاضی صاحب نے ترکِ شاعری کے وقت اپنی قوتِ فیصلہ سے زبردست کام لیا ہوگا، کیوں کہ وہ اہم اور مشکل ترین مرحلے میں خود انتقادی و خود احتسابی سے کام لیتے تھے۔ قاضی صاحب کو موزونیتِ طبع کی دولت قدرت کی طرف سے خوب عطا ہوئی تھی۔ اس کے باوجود شاعرانہ مزاج ان کے

صے میں نہیں تھا۔ ان کا استدلالی ذہن شاعروں کی مزاجی جذباتیت کے منافی تھا۔ ابتداء ہی سے ان کے ذہن وکردار میں ایک مفکر کی نشو ونما ہورہی تھی۔ ان کی علمی وعملی دنیا میں ایک فلسفی صورت پزیر ہورہا تھا۔ ان کا مزاج عالم ودانشور کا تھا مگر شاعر کا ہرگز نہیں تھا۔ ان کے پاس تخیل وتفکر کی بھی کمی نہیں تھی۔ وہ شاعری کا دامن زیادہ دنوں تک تھامے رہتے تو ایک بڑے شاعر ضرور بن جاتے ،لیکن ان کو جو صلاحیتیں ودیعت کی گئی تھیں، اس کا مطالبہ وتقاضہ کچھ اور تھا۔ لے دے کے ان کی شاعری آہ اور واہ کے نشہ سے مست و بے خود رہا کرتی اور وہ کوئی تاریخ ساز اور عہد آفریں کارنامہ انجام نہیں دے پاتے۔ اسی لیے انھوں نے قلم کی روشنی کی لکیریں دل ودماغ کی تنگ وتاریک وادیوں تک پہنچانے کے لیے نثر کو وسیلۂ اظہار قرار دیا۔ جب انھوں نے نثر سے اپنے علمی وتاریخی مشاغل کے تعلق کو اور زیادہ ہمہ گیر انداز میں قرطاس وقلم کے حوالے سے گہرا، بامعنی، نتیجہ خیز اور روحانی بنانے کا فیصلہ کیا تو وہ وقت یقیناً تاریخی بصیرتوں اور ثقافتی امانتوں کے لیے زبردست خوشی کا رہا ہوگا:

سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید (اقبال)

اچھی غزل میں نفسِ مضمون، لطفِ زبان، حسنِ بیان، تشبیہ کی تازگی، ترکیب کی دل آویزی، بندش کی چستی، لفظوں کی خوش آہنگی، مصرعوں کے ترنم وغیرہ کا مجموعی تاثر قاری کے ذہن کو مسرور ومخمور کردیتا ہے۔ اچھی شاعری کے لیے صرف عروض وقافیہ کے اصولوں کا پابند ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ فن کے تقاضوں کو بھی سمجھنا، فنکار کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کرنا، زندگی کے سلسلے میں اپنے نظریات وعقائد کا اظہار کرنا اور نظریہ وعقیدہ کو فن بنا کر پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

مولانا کے یہاں شاعری کی صلاحیت کا اظہار بہت اچھے پیرائے میں ہوا ہے۔ انھوں نے زندگی کے قد کو اپنی شاعری کے پیمانۂ نظر سے ناپنے اور اس کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے۔ ذیل کے اشعار کے آئینہ خانے کی متحرک تصویروں کو دیکھیے اور ان میں فنی مظاہرے کی شان ملاحظہ فرمایئے:

کشش کھینچے لیے جاتی ہے اُن کی جانبِ منزل
اُنھیں روندے ہوئے ذروں کو میرِ کارواں کہیے

بہارِ بوئے کہنہ سے ہے شرمندہ گلِ تازہ
نئے سر سے کوئی پھر بندشِ گلزار کر جائے

صبح صحرا کو چلے تھے جو تلاشِ دل میں
شام کو مرحلۂ سود و زیاں تک پہنچے
بالآخر ایک بیک خود جل اُٹھی بزم شباب اپنی
یہ کس شعلے پہ ٹھہری ہے نگاہ انتخاب اپنی
حتمی ہے پہنچنا یوں ہی منزل پہ بھٹکتے
جب جادۂ منزل کی بنا میرے لیے ہے
ایک دور تھا کہ حسن ہی خواب و خیال تھا
اب عشق ہی کو خواب کیے جا رہا ہوں میں
خود ہی نہیں ہوں عشق و محبت میں لاجواب
اُن کو بھی لاجواب کیے جا رہا ہوں میں
سرگرمِ ارتقائے محبت ہوں اس قدر
کونین سے حجاب کیے جا رہا ہوں میں
اطہر جنوں کی حد بھی ہے، کچھ دیکھ تو سہی
کس در سے اجتناب کیے جا رہا ہوں میں

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر سچا شاعر اچھا شاعر بھی ہو، سچی شاعری کچھ اور ہے، اچھی شاعری کچھ اور۔ یہ بھی سچ ہے اور یہ سچ ہزاروں آزمائشوں میں کھرا اُترا ہے کہ شاعر اپنی عملی زندگی میں خواہ کتنا بھی جھوٹا ہو مگر وہ اپنی شاعری میں واردات و کیفیات کے بیان اور اظہار واقعہ میں ہمیشہ سچائی کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اس کی مبالغہ آرائی بھی اپنی بنیاد کے لیے سخت زمین اور مضبوط و مستحکم سطح کی تلاش میں رہتی ہے۔ فنی مبالغہ اپنی حد سے تجاوز کر کے بھی صداقت کے دامن سے بالکل بے رشتہ نہیں ہو پاتا۔ مولانا کی شاعری اپنے کم و کیف، اپنے ابعاد و حدود، اپنے معیار و اختصاص کے اعتبار سے سچی شاعری ہے اور اس سچی شاعری کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ یہ اچھی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ مولانا کے کلام میں اظہارِ واقعہ اور بیان معاملہ ایک خاص طرح کی رمزی شعریت اور ایمائی ادبیت کا حسن لیے ہوئے ہے۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات گہرائی کے ساتھ کہنے کا فن انھیں معلوم ہے۔ ان کی شعری فضا اور غزلیہ کائنات مین ایک شخصی آہنگ سنائی دیتا ہے جو بہت غیر معمولی ہے۔ وہ شاعری میں مصوری کرتے

ہیں۔ان کی غزلوں میں لفظوں کا انتخاب بہت اہمیت رکھتا ہے۔انھوں نے اپنے ماضی کی علامتی شاعری سے اپنے استعارے، اپنے پیکر، اور اپنے رموز و علائم حاصل کیے ہیں۔ ذرا غور کرنے پر یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اس تقلید میں بھی ایک شانِ اجتہاد، اور ایک عظمتِ شعور کارفرما ہے۔ ان کے جذبات محسوسات اور واردات و کیفیات کا لفظوں سے بہت گہرا اور بامعنی رشتہ استوار ہے۔ان کے علائم اور ان کی تشبیہات اپنی گرفت میں ان کے ذہنی ارتعاش اور قلبی تحرک کو کچھ اس انداز سے لیے ہوئے ہیں کہ ابہام و ژولیدگی کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں پڑنے پایا ہے اور مطلب واضح ہوتا گیا ہے۔ترسیل و ابلاغ اور اظہار و بیان کے سارے اسالیب شاعر کی قادر الکلامی کی تصویر بن کر سامنے آتے ہیں۔انھوں نے شعری زبان میں اپنے دور کا مرثیہ بھی بیان کیا ہے اور شہر آشوب بھی کہا ہے۔ نئے دور کی پھیلتی ہوئی روشنی پر بھی نظر ڈالی ہے اور مستقبل کے تابناک چہرے کی بھی مصوری کی ہے۔ان کی شاعری آہ اور واہ دونوں طرح کی کیفیتوں سے واسطہ رکھتی ہے۔ان کا نغمۂ سخن اور نالۂ نیم شبی ان کے حالات و زمانہ کی رعایت سے ترتیب و تشکیل کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ان کی شاعری بے وقت کی راگنی نہیں ہے اور نہ بے موسم کی شہنائی۔ان کے عرفانِ ذات میں عرفانِ کائنات کے جلوے نظر آتے ہیں۔ان کا سارا کلام اپنے دل اور اپنے وقت کی آواز بن کر سامنے آتا ہے۔ان کی شاعری تہذیبِ نفس، تزکیۂ باطن، طہارتِ قلب ہی سے تعلق نہیں رکھتی اس کا علاقہ تہذیبِ مشرق کی اُن اعلیٰ روایات اور ارفع اقدار سے ہے، جو اپنی مسکراہٹوں سے غم و اندوہ کو زخمی بناتی ہے اور بڑے بڑے طوفانِ بلا کو اپنے کوزۂ دل میں سمو لیتی ہے اور جبیں پر شکن تک نہیں آتی۔

یہ میرا ظرف ہے زنداں میں لایا ہوں بیاباں کو
بیاباں میں بھی اے اطہرؔ! میں زنداں لے کے آیا ہوں

بسا اوقات آجاتی ہے رونے میں ہنسی مجھ کو
عطا کی ہے مرے غم نے نوائے دورُخی مجھ کو

میں اور بتوں کا عشق؟ خدا ساز بات ہے
ورنہ خود اپنے درد سے فرصت کہاں مجھے

میں خود ہی چھیڑ کے دردِ کہن نہیں رویا
انھیں بھی بزم میں اکثر رلا گیا ہوں میں

مجھے پہنچا دیا اپنوں نے غم کی ایسی منزل میں
جہاں رہتا نہیں ورد ِل حسابِ دوستاں ساقی

دوسری جگہ کہتے ہیں:

یہ میری زندگی اے کاش! افسانہ ہی بن جاتی
یہ افسانے میں اُن کے تذکرہ میرا کہاں آیا؟

انھوں نے ایک اور مقام پر بڑے نکتے کی بات کہی ہے:

جو جینا ہے تو جی جاؤ، جو مرنا ہے تو مر جاؤ
بہر صورت اب اس دورِ نحوست سے گزر جاؤ
جگا دو بستر غفلت پہ دیکھو کون سویا ہے
بساطِ ہند پہ اک حشرِ امروز برپا ہے

عرفانِ ذات کا اس سے بہتر اور کیا سبق ہوگا:

معلوم ہے حقیقتِ گلہائے رنگ و بو
ذوقِ نظر خراب کیے جا رہا ہوں میں
امواجِ زندگی کا تلاطم ہی ہے سکون
ہر موج کو سراب کیے جا رہا ہوں میں

غزل کے ایک شعر میں حالات و زمانہ کی ہر سبک گام اور تیز رفتار حقیقت کو اپنی نگاہِ نکتہ بیں کی گرفت میں رکھنے کی صلاحیت کو وہ یوں ظاہر کرتے ہیں:

وسعت نگاہِ شوق کی محدود کیوں کروں؟
جلوؤں کو بے پناہ کیے جا رہا ہوں میں

مولانا کا عرفانِ ذات اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ حالات و کوائف کے جبر میں تاویل کی گنجائش پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح تخریب میں تعمیر کا پہلو اور زجر و توبیخ میں پیار کا رچاؤ، ان کی شاعری کے رجائی اور شخصیت ساز عناصر کو اعتبار و اثبات عطا کرتا ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسے بندۂ مومن کا نغمۂ دل ہے، جس نے اپنی امیدیں بڑی سے بڑی آزمائش میں اپنے رب سے وابستہ کر رکھی ہیں اور رنج و بلا کو انعام خداوندی سمجھ کر برملا اظہار شکر کرتا ہے اور کہتا ہے:

گھبرا نہیں سکتا ہوں مصیبت سے، بلا سے
جب دل ہے تو سوز و غم و بلا میرے لیے ہے

پھر مقامِ آدمیت کی وضاحت کرتے ہوئے اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتا ہے کہ خدا کے وجود و اثبات کی سب سے بڑی گواہی خود انسان کا وجود ہے۔ ساری کائنات میں انسان ہی مقصودِ کائنات ہے۔ انسان اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود خداوند کریم، کا مطلوب و محبوب ہے۔ اسی لیے اس کے واسطے نفس و آفاق کی ساری نعمتیں وجود میں آئیں اور قدرت نے اسباب میں تمام تر فیاضیوں کا مظاہرہ کیا:

گر ان کے لیے ہوں میں کونین کی دولت
سب میرے لیے ہے بخدا میرے لیے ہے
میرے ہی سبب روشنیِ شمعِ ازل ہے
فانوس محبت میں جلا میرے لیے ہے

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ماں باپ سے زیادہ رحیم و شفیق ہے۔ ارتکاب جرم پر اُس کا غیض و غضب اور زجر و توبیخ بھی اپنی تہ میں رحمانی صفات رکھتی ہے۔ اس کی خفگی کا راز یہ ہے کہ بندہ اُس کی رحمتوں اور نعمتوں کی ارزانی پر نگاہ کر کے اپنے کیے پر نادم ہو جائے اور اسی راہِ ہدایت پر چلنے کا تہیہ کرلے، جو مرضیِ مولا کی بتائی ہوئی ہے۔ خدا کی عقوبت بیمار ذہنِ انسانی کے لیے شفا ہے۔ اس کی ناراضگی بندے پر رحمت کا دروازہ وا کرنے کے لیے ہی ہے:

صد فخر ہے، صد ناز ہے مجھ کو سرِ محشر
گر میرا خدا مجھ سے خفا میرے لیے ہے

کسی عارف نے کہا ہے "رحمتِ حق بہانہ می جوید بہا نمی جوید" یعنی رحمان کی رحیمی گنہگاروں کی بخشش و مغفرت کے لیے حیلے اور بہانے ڈھونڈھتی رہتی ہے، بندوں کی سزایابی اس کو منظور نہیں وہ ارحم الراحمین ہر حال، ہر رنگ میں اپنی شانِ غفاری کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے بندوں کی لغزش پر اُسے پیار آ جاتا ہے:

رحمت نے پکارا مجھے بے مایہ سمجھ کر
یہ میرے گناہوں کا صلہ میرے لیے ہے

زاہد مرے کریم کی رحمت کا ہے طفیل
ناکام کو سیاہ کیے جا رہا ہوں میں
زمانہ کو نہ کیچھ پر تری رحمت کھنچتی ہے
کہ کیا ہے؟ مدعائے بندگانِ بے زباں ساقی

مولانا نے جذبات نگاری میں منظر نگاری، اور محبوب کی ادا شناسی میں فطرت شناسی کا حق ادا کر کے پہنچایا ہے۔ انھوں نے محبوب کے انداز و ادا کو مناظر فطرت کے وسیلے سے چاہنے اور دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے ان کی جزئیات نگاری اور باریک بینی پر روشنی پڑتی ہے۔ ان شعروں کو دیکھیے:

یہ صحرا کی جبیں پر شام کی بیتاب رنگینی
کسی نے مسکرایا ہے شفق کے سرخ محمل سے
ابھی زخم جگر پر کچھ تبسم تھر تھراتا ہے
ابھی گزرا ہے کوئی مسکراتا کوچۂ دل سے

رنگ و بو، غنچے، شگوفے، چاند، تارے ہنس دیے
تم چمن میں کیا لئے، سارے نظارے ہنس دیے
سماں، رنگ، بو، جام، مے، چاند، تارے
کمی ہے تمھاری، ہیں سارے نظارے

وہ گویا یوں ہوئے کہ سارا گلشن ہو گیا نغمہ
ہوئے خاموش یوں کہ وجد میں ہر ہر کلی آئی

مولانا نے غزلوں میں محبوب کی اداؤں اور اس کے اعضاء و جوارح کا ذکر کچھ اس انداز نظر اور عارفانہ نگاہ سے کیا ہے کہ اس میں فلسفہ اور فکر و خیال کی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس طرح کے مقام پر ان کا شعور فن اور احساسِ جمال ایسے ایسے نکتوں اور گوشوں پر پہنچا ہے، جہاں عام آدمی کی نظر نہیں جا سکتی اور کمال یہ ہے کہ یہ تمام فلسفہ طرازی اور خیال آرائی سادہ و سلیس، عام فہم اور رواں زبان میں کی گئی ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ اور مشکل سے مشکل ترین مقامات کو عوام الناس کی بول چال میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ لہجے اور بیان میں کہیں لکنت اور ژولیدگی کا عیب نہیں۔ جو مولانا کی قادر الکلامی کا بڑا ثبوت ہے۔ لفظوں سے فکر و خیال کی ہم آہنگی ملاحظہ ہو:

کہ وہ انسانی دل کی کیفیات اور جذبات کے لیے مخصوص ہے۔ غزل تخیل کی زبان ہے، احساسات کی ترجمان ہے''۔ ان شعروں میں شعریت ہے، سادگی ہے، لہجے کی شائستگی ہے، فکر و خیال کی تہذیب ہے، حسنِ ادا، رنگِ بیاں، طرزِ اظہار کا کمال ہے اور سب سے بڑی بات کہ ایک عارف کی تلاشِ حقیقت ہے۔

کسی صاحبِ نظر شاعر اور باشعور فنکار کے فن پارے یا اُس کی شاعری کے مطالعہ کے لیے اس کے کلام کا شرح و بسط کے ساتھ مطالعہ ہونا چاہیے۔ اگر شاعر کے شعر کی روح کو سمجھنے کی کوشش نہ کی گئی تو مطالعہ ادھورا رہ جائے گا۔ شاعر کے ذہن و فکر کے تدریجی ارتقا اور اس کے فن کی درجہ بہ درجہ ترقی اور وسعت و توانائی کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کی داخلی و خارجی زندگی اور ماحول سے باخبر ہونا بھی کسی حد تک نہیں بڑی حد تک ضروری ہے۔ اگر شاعر نے زندگی کے متعلق کوئی نقطۂ نظر قائم کیا ہے اور اس نقطۂ نظر کے اظہار و بیان کے لیے اس نے تخلیق کی مختلف یا متعدد صورتیں پیدا کر لی ہیں تو اُن حالات و واقعات کے حوالے سے شاعر کے تاثرات و معکوسات کو جاننے اور اس کی نجی زندگی کے اُن حالات کو سمجھنے کی کوشش ضروری ہے۔ جس کے زیرِ اثر اس کے نظریات و خیالات میں پختگی یا تزلزل در آئے ہیں۔ انسانی زندگی حالات کے جبر سے کبھی آزاد نہیں رہی۔ بدلتے موسم، صبح و شام کے پھیلتے سمٹتے سائے، شب و روز کے سرد و گرم، اُتار چڑھاؤ ماحول کے نشیب و فراز شاعر کی ذہنیت بنانے سنوارنے اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ زمانے کے حالات، نسلی و نسبی اور موروثی اثرات، جسمانی ترکیب اور ساخت، بچپن میں ملنے والا ماحول، گرد و پیش کی زندگی، تعلیم و تربیت، اشخاص و افراد سے تعلقات، اُن کی سیرت و کردار اور مطمحِ نظر، ایامِ جوانی اور شعور و شباب کے ہنگامے، عصری اور انقلاب آفریں واقعات، جسمانی صحت، ذہنی حالت، بیماری و ناآسودگی الغرض یہ کہ سیکڑوں ہزاروں معلوم و نامعلوم اثرات لحظہ بہ لحظہ انسانی زندگی میں تغیرات پیدا کرتے رہتے ہیں اور شعور و لاشعور نیز تحت الشعور کے پیچ و خم سے گزرتے ہوئے حالات شاعر کی شخصیت اور اس کی فکری دنیا میں مرکزیت قائم نہیں رہنے دیتے اور ارتکاز کو اہتزاز آشنا کرتے رہتے ہیں۔ اسی غیر استقلالی عنصر کی گرفت و شناخت تنقید و تاثر کی اساس ہونی چاہیے تاکہ شاعر کی اقدارِ حیات کے پیمانے اور اس کے نقطۂ نظر کی تفہیم و توضیح کے دروازے پڑھنے والے پر کھل سکیں اور قاری بھی خالق کی طرح تخلیقی کرب کو محسوس کر سکے۔ ہمیشہ باشعور قاری یا سامع اچھے فنکار سے لطف اندوز اور لذّت آشنا اسی وقت ہوتا ہے، جب وہ خود کو اُن تاثرات و واقعات کے حوالے کر دیتا ہے، جس کی بھٹی سے گزر کر شاعر یا فنکار نے اپنی تخلیق پیش کی ہے۔

سوانح اطہر سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ قاضی صاحب حد درجہ غیور، صاحب حمیت،
ساس اور نازک طبع انسان تھے۔ بچپن میں آشوبِ چشم کی وجہ سے نگاہ بھی کمزور ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے
ن کی والدۂ گرامی کو ان کی آئندہ کی عائلی اور متاہل زندگی کے سلسلے میں اندیشے رہا کرتے تھے۔ جس کے
رے میں اپنی فکر مندی کا ذکر وہ دوسروں سے بھی کیا کرتی تھیں۔ طالب علمانہ زندگی کے واقعات میں
تا ہے کہ بے نیازی اور استغنا ان کا خاص وصف تھا اور مدارسِ اسلامیہ کے زیرِ تعلیم بچوں کی طرح دو وقت
ی غذا کے لیے ناشتہ دان ہاتھوں میں لیے اونچے آستانوں اور امیر گھرانوں کا طواف کرنا انھیں سخت
گوار تھا۔ خودداری اور خود شناسی ان کی طبیعت کے امتیازی عنصر تھے۔ دین پرستی، خداترسی اور بزرگوں کی
ذر شناسی کی صفات انھیں اپنی والدۂ مکرمہ اور نانی مرحومہ سے ورثے میں ملی تھیں۔ ان کی ابتدائی زندگی
ے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایامِ طفلی میں انھوں نے مذکورۃ الصدر دونوں خواتین کے علاوہ خاندانی
قدار و روایات اور ننھیالی مزاج و ماحول سے بھی بہت کچھ حصہ قبول کیا۔ انھوں نے بچپن میں گھر کی
نتہ مالی حالت کے عذاب بھی جھیلے۔ احیاء العلوم کے مقامی اساتذہ کے فیضِ صحبت کے بھی نمایاں
ثرات قبول کیے۔ خاص طور سے مولانا شکر اللہ مبارک پوری کی زندگی ان کے لیے چراغِ راہ ثابت
ہوئی۔ جس کا ذکر ان کی تحریروں میں خاص انشراح کے ساتھ جا بجا ملتا ہے۔ ان اثرات اور اخذ و قبول
کی نوعیت نے ان کی جو ذہنی تشکیل کی اُس کے رنگ و آہنگ اور سوز و ساز ان کی آخری زندگی تک ان
کے معمولات سے نمایاں ہوتے رہے۔ مولانا کے کلام میں ان تمام اثرات کی واضح جھلکیاں جا بجا نظر
آتی ہیں۔ ان کا کلام ان کے اندروں کا نگار خانہ اور ان کے مطمحِ نظر، عقائد و جذبات، پسند و ناپسند کا
آئینہ خانہ ہے۔ جب ان کی سوانح اور ان کی شعری کائنات کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو حیرت انگیز طور
پر یکسانیت نظر آتی ہے اور کسی مقام پر منافقت کا احساس نہیں ہوتا۔ اسی لیے میں کلام اطہر کو ان کی
زندگی کی سچائیوں کا نقیب مانتا ہوں۔

قاضی اطہر کی شاعری میں ایسے نمونوں کی کمی نہیں ہے، جن میں دوسروں کے دکھ درد کو اپنا غم
بنا لینے دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی خوشی تیاگ دینے، اپنے ہم جنسوں اور ہم نشینوں کے در دل تک روشنی
کی مسکراہٹ لانے کے لیے اپنی زندگی کو اندھیروں میں ڈبو دینے کی تمنائیں کروٹیں لیتی ہیں۔ ان کی
زندگی کا نشاط صوفیانہ زندگی اور فطرت کے منہاج سے ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے دکھ کو بانٹ
لینے سے انھیں روحانی سکون ملتا ہے۔ ان کا فلسفۂ اخلاق اپنی دہلیز کے چراغ اور اپنے طاق کی شمعِ رنگیں کو

اُٹھا کر مسافرانِ شب کی رہگزر میں رکھ دیتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اسی میں منحصر دیکھی تمھاری جب خوشی میں نے
خدا سے مانگ لی خوش ہو کے آزردہ دلی میں نے

وہ غم جس سے تھرائی بزم الفت
کیا میں نے منظور اس کو خوشی سے

سہ لیا میں نے وہ بارِ اُلفت
جس سے تھرائے کون ومکاں تک

چمن کو چھوڑ کے کانٹوں کو گلستاں کرنا
معاہدہ ہے محبت کا ابن آدم سے

مرے ذوقِ طلب کو راس ہے تلخیِ محرومی
وہ لطف جام کیا جو خوگرِ آزار کر جائے

چین کردوں خوشی سے حوالے
تم اگر بے کلی چھوڑ جاؤ

ہزاروں راہ مجھ پر کھل گئیں مجبوریِ دل سے
کہیں آگے نکل جاؤں نہ اے دل حدِ منزل سے

مولانا ابنِ آدم کے منصب سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ مقامِ آدمیت سارلی کائنات میں ہر شے سے بلند ہے۔ یہاں تک کہ عالمِ ملکوت کے ملکوتی صفات رکھنے والے بھی اس کی عظمتوں سے فروتر ہیں اور یہ صرف اس لیے ہے کہ کائنات کی رنگ آمیزی کی ذمہ داری اس کے حوالے کی گئی ہے۔ تکمیلِ کائنات کا جو کام خالقِ کائنات نے ابنِ آدم کے حوالے کیا ہے، اس کی انجام دہی میں کبھی سمندروں کے سینے پر موجِ حوادث کا مقابلہ کرتا ہے، کبھی بحرِ ظلمات کی تہوں میں انسانی ترقیات اور کائنات کو حسین تر بنانے کے زینے تلاش کرتا ہے۔ کبھی خلاؤں میں زندگی کی ناآسودگی کا درماں ڈھونڈتا ہے۔ کبھی ستاروں سے سرگوشیاں کر کے منشائے مشیت کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی آنکھیں بند کر کے اور دل کی کھڑکیاں کھول کر نادیدہ جہانوں اور بے نام زمانوں کی پرتیں ادھیڑنے میں سرگرم دکھائی دیتا ہے۔ کبھی انفس وآفاق کی ساری پہنائی کو اپنی ذات میں انڈیل لیتا ہے۔ کبھی سکوت لالۂ وگل سے کلام کر کے رازِ ازل کو سمجھنے میں اپنے

ذہن ودل اور فکروخیال کے سارے تاروپود بکھیر دیتا ہے۔ کبھی خلیفۂ ارضی اور امامِ کائنات بن کر روز وشب سے زبردست محاسبہ کرتا ہے۔ یہی ظلوم وجہول ساری مخلوق میں تنہا ہے، جس نے امانتِ رب کا بار اپنے کمزور کاندھوں پر رکھ کر اپنے دل کی توانائی اور حوصلے کی برنائی کا ثبوت دیا۔ جب کہ پہاڑوں کے جگر اور چٹانوں کے دل اس بارِ امانت کی خشیت سے پاش پاش ہونے لگے تھے اور پوری کائنات میں ازل سے ابد تک تلاش کرتے جایئے کوئی اس بارِ امانت کا شمہ برابر حصہ بھی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ مولانا کے محولہ بالا اشعار میں دوسرا اور تیسرا شعر اسی حقیقت کی طرف کھلا ہوا اشارہ ہے۔ یہ ابن آدم اپنے کارِ مفوضہ کے ایک محاذ پر کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے تو دوسرے محاذ کی معرکہ آرائی اس کو جشنِ فتح منانے نہیں دیتی اور زندگی کی جفاکاری یا احساسِ ذمہ داری کی بیداری جو بھی کہہ لیجیے، مالِ غنیمت سمیٹنے کی مہلت بھی اس سے چھین لیتی ہے۔ اسی لیے مولانا کی نظر میں قلبِ بشر کے سوا کسی نے خوشی سے ضربِ الفت کا رنج نہیں سہا:

فلک کے تارو! ذرا بتاؤ، زمیں کے پھولوں یہ راز کھولو
کسی نے جھیلی بھی ضربِ الفت خوشی سے قلبِ بشر سے پہلے

یہ زندگی پیہم رواں دواں ہے اور انسان اس کا شہسوار ہے۔ زندگی اس کو چھوڑ کے تنہا آگے نہیں بڑھ سکتی، اسی لیے اس کا سفر کہیں ختم نہیں ہوتا۔ دنیا اپنی حقیقتوں کے ساتھ نئے نئے پیراہن میں سامنے آرہی ہے۔ مگر انسانی زندگی کم فرصتی کی وجہ سے اپنے چہرے سے گردِ سفر کی موٹی تہوں کو صاف نہیں کرپاتی۔ اڑتے ہوئے ماہ وسال کے دامن سے مس ہوجانا ہی اس کا غسل ووضو ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسی لیے انسانی زندگی نشاط کی انجمن میں رہ کر بھی اپنے احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے اسیرِ الم رہا کرتی ہے۔ مولانا چوں کہ تاریخِ اسلامی اور قرآن وحدیث کے رمز شناس ہیں، اس لیے ان کے یہاں ان حقیقتوں کا شاعرانہ اظہار مانند دیدہ کے قبیل سے ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہزار دنیا نے رنگ بدلے مگر نہ اپنا مقام بدلا
نشاط کی انجمن میں رہ کر بھی ہم اسیر الم رہے ہیں
وفا کے دل پر ہزار چرکے دیے جفا نے طرح طرح کے
مگر رہِ جستجو میں آگے، ترے شکستہ قدم رہے ہیں
خدا نے لذتِ الفت ہمیں کو کیوں بخشی
یہ رازِ درد سے ہم خود چھپائے بیٹھے ہیں

اے جنوں کون سی یہ منزل ہے
ساتھ کیوں ہم سفر نہیں آتے

مولانا کے نزدیک حاصل زندگی وہی لمحات ہیں جو فرض کی ادائیگی میں بسر ہوئے ہیں۔ اہداف زندگی اور مقصد حیات سے کنارہ کش رہ کر جو عمر گزری اس کی حقیقت غبار کارواں سے زیادہ کی نہیں ہے:

یوں تو حیات نام ہے سلسلۂ دراز کا
عشق میں پر لٹی ہے جو اسی کو زندگی سمجھ

لمحاتِ سکوں موت ہیں مرے لیے اطہرؔ
طوفان حوادث میں بقا میرے لیے ہے

خدا سالم رکھے اطہرؔ گر انبارِ طوفاں کو
میں ٹکرانے نہیں جاتا سبکسارِ ساحل سے

جو آزاد سا ہے غمِ عاشقی سے
بہت دور ہے مرکزِ زندگی سے

کبھی سوئے زنداں، کبھی سوئے صحرا
مری زندگی آنے جانے میں گزری

مولانا کی ادبی و شعری زندگی تلاش و جستجو سے شروع ہوئی۔ ان کا کلام ان کے ابتدائی مرحلۂ جستجو اور شوقِ تمنا کا ایک دھندلا، غیر واضح اور کسی قدر بے ترتیب خاکہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ انھوں نے شاعری کے حوالے سے اپنی شخصیت اور اپنے دروں کی بازیافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ طالب علمی کے دور سے نکل کر اپنی ذہنی و فکری تشکیل کے خطوط اور خدو خال کو نمایاں کرنے کی زبردست للک اور لگن کے تحت درس و استفادہ سے پرے اپنے طور پر اپنے مزاج سے ہم آہنگ ساز و سامان جمع کرنے لگے تھے۔ جب اُن کی شاعری ان کی اس شخصیت بازیابی کی تحریک اور عہدِ آفرینی کے عزائم کے لیے ناکافی اور نارسا محسوس ہونے لگی تو انھوں نے شعر و شاعری سے اپنا رشتہ بہت کمزور کرلیا۔ انھوں نے دوسروں کے کارنامے خصوصاً قرنِ اوّل کے کارناموں کی تلاش و تحقیق شروع کردی۔ کیوں کہ وہ اپنی نثری تحقیق سے جو نگار خانہ سجا رہے تھے، اس میں انھیں اپنی شخصیت اور اپنے اندروں کے جلوے زیادہ جاذبیت کے ساتھ بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

شعور احساس پھوٹ نکلا ہے توڑ کر بندشِ زمانہ
قفس میں محسوس کررہاہوں کہ بال وپر میرے جم رہے ہیں

اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی تلاشِ ذات کے لیے شاعری ایک کمزور حوالہ تھی۔ پھر بھی اس کے کچھ کچھ نقوش ان کی شاعری میں مدھم انداز میں ملتے ہیں:

ہو بزم شام و سحر یا جہانِ شمس و قمر
نظام جذب وکشش سب میں ہے مرے دم سے
نہ اس جہاں کی محبت نہ اس جہاں کی طلب
مرا مقام تو آگے ہے دونوں عالم سے
خود ہی منزل چلی جستجو کو
کھونے والو! مبارک ہو کھونا
زندگی بھی فریب ہے اے دوست!
زندگی کی حسیں تمنا تک
ترے سجدوں کی لذت نے کچھ ایسی بے خودی بخشی
جبیں میں کر لیے پیدا نقوشِ آستاں ہم نے
سجدوں کے تقاضے سے میں تنہا نہیں مضطر
بیتاب ترا در بھی مرے سر کے لیے ہے
نگاہیں روح کو بھی دعوت پرواز دیتی ہیں
دم آخر مری آنکھوں میں کیسی روشنی آئی
خدا جانے میں کیا بھرتا زمانے کی فضاؤں میں
اگر مجبور نہ ہوتیں یہ رنگیں سی نوا میری

مولانا قاضی اطہر بنیادی طور سے ایک بڑے تاریخ داں اور تاریخ نویس تھے۔ اُن کی کتابیں، اُن کے مورخانہ شعور اور اُن کی تاریخی بصیرت سے بھری پڑی ہیں اور ان سے مولانا کی تاریخی عبقریت علمی کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی نظر سیر و مغازی، تذکرہ و سوانح اور تراجم و شخصیات کے علاوہ احوال و آثار، حالات و جغرافیائی کوائف پر بھی گہری تھی۔ مولانا کا کلام خصوصاً ان کی نظمیں مولانا کی

تاریخیت سے مملو ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں تاریخ سے بڑی مدد لی ہے، مگر اس تاریخ نمائی میں وہ صرف ماضی کے واقعات وحادثات اور اس کے عکس ونقش ہی کو نہیں ابھارتے وہ واقعات وحادثات کے بطن سے ان عوامل وموثرات کو بھی قاری کے سامنے لاتے ہیں، جن سے عہد سازی اور شخصیت آفرینی کو مہمیز ہوا اور وہ اقدار ومعیارات، رجحانات وتاثرات اپنے حقیقی رنگ واثر میں ظاہر ہوں، جو مستقبل کے چہرے کو زیادہ تابناکی سے نکھار سکیں اور جن کی مدد سے کاروانِ زندگی اور قافلۂ فکر ونظر کو نئی سمتوں، نئی جہتوں، نئی دشاؤں کی روشنی نصیب ہو سکے۔ ان کا مورخانہ شعور ماضی کی کہانی نہیں سناتا بلکہ یہ داستاں گوئی اس تاثر ولہجہ کے ساتھ کرتا ہے کہ ماضی، زمانۂ حال اور سمتِ وقت کے قبلہ نما کو بدل دینے کی پوزیشن اختیار کر لیتا ہے اور قاری کے سامنے وہ حقیقتیں بصیرتیں اور بولتی ہوئی سچائیاں آجاتی ہیں، جنھوں نے تاریخ کے دھارے کو ایک فکری دھارے اور تمدن کے رُخ کو عملی فلسفے کی سبک رو میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس وقت توجیہات اور ترجیحات دونوں پڑھنے یا سننے والے کے آگے بے پردہ ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ تاریخیت ان کے یہاں داستاں گوئی کی لذت اور رنگِ مجلس قائم کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کو انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے انسانی اندروں کو بیدار کرنے اور کائنات سازی وکائنات گیری کے جذبے کو متحرک کرنے کا ایک طاقتور وسیلۂ فکر وذریعۂ فن کے درجے میں استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ایک غزل کے یہ شعر دیکھیے جن میں ساقی نامہ جیسی تمناؤں کا اظہار ہوا ہے:

وہ رنگیں جام دے جو ہوش کو بے کار کر جائے
بعنوانِ دِگر احساس کو بیدار کر جائے
بہارِ بوئے کہنہ سے ہے شرمندہ گل تازہ
نئے سر سے کوئی پھر بندشِ گلزار کر جائے

ان میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے مولانا کے مطمحِ نظر اور ان کے نظریۂ شعر گوئی کی تشریح ہوتی ہے۔ مولانا اپنی گفتگو میں عموماً اس بات پر اظہارِ رنج کرتے تھے کہ جب ہم دَورِ غلامی اور سیاسی محکومی کے عذاب جھیل رہے تھے تو ہم نے زندگی، علوم وفنون اور صحافت وسیاست کے میدان میں بڑے بڑے رجالِ عصر اور مردِ کار پیدا کیے۔ زندگی کے جس شعبہ پر نگاہ ڈالیے ایک سے ایک قدآور شخصیتیں ہماری تاریخ ساز صلاحیت کو ظاہر کر رہی ہیں۔ انگریزوں کے جبر واستبداد کا دَور بھی قحط الرجال پیدا نہیں کر سکا اور ہماری زمین کی تھوڑی سی نمی بھی اپنی زرخیزی کے ثبوت میں ایسے ایسے گل بوٹے سامنے لاتی تھی کہ عقلیں دنگ

رہ جاتی تھیں اور یہ احساس ہوتا تھا کہ انگریزوں کی پامالی کے باوجود ہماری قومی وملی خاکستر اپنے سینے میں چنگاریاں چھپائے ہوئے ہے اور اس برسے ہوئے بادل میں ابھی بجلیاں پوشیدہ ہیں لیکن آزادی کا سورج طلوع ہوا اور اپنا راج اپنے ہاتھ میں آیا تو ہماری صلاحیتوں کے سارے سوتے جیسے سوکھ گئے شاید اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہو کہ پابندی ومحکومی کے وقت انسانی غیرت تحریک میں آکر صلاحیتوں کو اتنا بیدار کر دیتی ہے کہ جس جگہ پاؤں کی رگڑ پڑتی ہے اور ایڑی کی ضرب لگتی ہے وہیں چشمے ابلنے لگتے ہیں، بیداریٔ نمو، احساس جوانی اور جذبۂ کائنات سازی کی نمود سیاسی غلامی میں بڑھ جاتی ہے اور سیاسی آزادی میں حصول آسائش ،لذّت آرائش و ذوق زیبائش کا لالچ ذہنی غلامی کے اثرات پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا ماضی کے دریچے سے چھنتی ہوئی روشنی کو جب اپنے ذہنی وفکری افق پر دیکھتے ہیں تو حالات کے سدھرنے اور مستقبل کے اجالے کے جلوس کی بشارت سنانے لگتے ہیں۔ صبحِ فردا کے اس سفیر کا یہ آہنگِ سخن ملاحظہ ہو:

قفس میں کر رہا ہوں تبصرہ انجام گلشن پر
اُتر آئی ہے جب سے کائناتِ گل نگاہوں میں
نغمۂ شیریں سکھادو نالۂ شب گیر کو
زیورِ زریں بنادو آہنی زنجیر کو
گوہر نایاب ہیں گنجینۂ امروز میں
سیکڑوں فردا چھپے ہیں سینۂ امروز میں

مولانا قاضی اطہر کی زندگی کی علمی عبقریت، ان کی مورخانہ وسیع النظری، ان کی فنی عظمت، ان کی وسعتِ مطالعہ، ان کی ذہنی ہمہ جہتی، ان کی فکری صلابت، ان کی ٹوٹ کر ملنے کی ادا، ان کی منکسر المزاجی، ان کی بلند اخلاقی، ان کی اسلامی دردمندی، ان کی انسان دوستی، ان کی دل گدازی، ان کی جگر سوزی صرف ان کی اپنے اہلِ خانہ، اپنے ہم قبیلہ، اپنے حلقۂ دوستاں، اپنے دائرۂ جماعت، اپنے خطۂ وطن، اپنے حدود اربعہ، اپنے عہد، اپنی تاریخ اور اپنی ثقافت تک محدود نہیں تھی۔ وہ ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے، جن کی شناخت اور انفرادیت اس میں پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مکتب و مدرسہ، اپنی مسجد و خانقاہ اور اپنی ذات کے حدود اربعہ سے نکل کر دوسروں کے دبستانِ فکر، خیابانِ نظر اور شبستانِ خیال تک کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیتے ہیں۔ ان کی عصریت میں ابدیت اپنی قدریں تلاش کر رہی ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی علمی روایت کو آفاقیت کی وراثت میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان کی فکری بصیرت تاریخ کا ایک ایسا حصہ بن

ہوئی ہے جو دور تک اور دیر تک تمدن کی ذہنی رہنمائی کا فرض انجام دیتی رہے گی۔ یہی انتخاب روزگار ہستیاں اپنی جگہ خالی کرنے پر اپنوں اور بے گانوں دونوں کو یکساں تڑپاتی ہیں۔ انھیں صدیوں کی امانت سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ذات اپنے اکتساب سے ایک ایسی دولت بن جاتی ہے جس میں تمام اقوام وملل اور تاریخ وادیان کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک فرد، ایک قوم اور ایک عہد کی اجارہ داری میں نہیں رہتے اور نہ ایسے لوگ کسی گروہی وشخصی منشور کی ذہنی غلامی قبول کرتے ہیں ایسے لوگ سب کے ہوتے ہیں اور سب کے رہتے ہیں۔ ان کے عمل قدروں کے پیمانے متعین کرتے ہیں۔ ان کے افکار روایتیں بناتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے ذہنوں کی تشکیلِ جدید ہوتی ہے۔ اسی احساس کو موضوع بناتے ہوئے انھوں نے اپنے حوالے اور اپنے تعلق سے کہا:

تباہی کا مری ماتم ہے اطہر آج اپنوں میں
مگر دیکھے گی کل دنیا کہ بیگانوں پہ کیا گزری

اُن کا یہ شعر کوئی شاعرانہ تعلّی اور بے بنیاد مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ یہ عرفانِ ذات اور خود آگاہی کا نتیجہ ہے۔ اس کی اساسِ خیال نرگسیت کے زیر اثر اُبھرنے والا کوئی معمولی جذبہ نہیں یہ شاعر کی خود شناسی اور روشن ضمیری کا بامعنی اعشاریہ اور خیال آفریں اعلامیہ ہے۔ سادہ وسلیس زبان میں کہے ہوئے اس شعر کو اَنانیت کی سطحیت سے تعبیر کرنا کہنے والے کے ساتھ ظلم تو ہوگا ہی، خود اصولِ نقد اور معیارِ نظر کے حق میں بھی ناانصافی ہوگی۔ شخصیت، عہد اور افکار کو مربوط کر کے جب قدر و قیمت کا تعین ہوگا تو حقیقت اپنے تمام ابعاد اور جہات کے ساتھ جلوہ گر ہوگی۔ اب یہ بتانے کی شاید زیادہ ضرورت نہیں کہ اِن دو مصرعوں میں عرفانِ ذات کا جو اظہار ہوا ہے، وہ کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ ہمیشہ خود شناسی کی تہ سے خداشناسی کی ابتداء ہوئی ہے۔ تاریخ کے کسی دَور میں ایسا نہیں ہوا کہ معرفتِ نفس نے معرفتِ رب کی راہ کا پتھر بن کر رکاوٹیں کھڑی کی ہوں۔ انسان جب اپنے من میں ڈوب کر اپنی تلاش کرتا ہے تو اُس پر سراغِ زندگی کی راہیں روشن ہوجاتی ہیں۔ تصوّف کے اسی مسئلہ کو نظر میں رکھ کر اِس عارفانہ شعر کے رندانہ رنگ پر ذرا غور کیجیے:

اِک رند اور رمزِ حقیقت کی یہ شناس
واعظ کو آب آب کیے جارہا ہوں میں

شاعر کی فطرت شناس نظر قطرہ میں دجلہ اور دجلہ میں طوفان ہی نہیں دیکھتی، بلکہ جس طرح اس

ذات میں پوری کائنات سموئی ہوئی دیکھتا ہے اور ہر طرف خدا کے بکھرے ہوئے جلوۂ ہزار رنگ کا
اہدہ کرتا ہے۔ اُسی طرح اسے یہ سلیقۂ تخلیق اور ہُنر ایجاد بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے رنگ اور طور پر قطرہ کو
فان بنادے، مگر اس عملِ تخلیق میں وہ خدا کے عطا کیے ہوئے اختیارات اور اُس کی احسان شناسی کا
زاف بھی کر رہا ہے۔ شعر کا تیور سراسر مومنانہ بصیرت لیے ہوئے ہے۔ کافرانہ اور گستاخانہ ترنگ
ہنگ سے بچنے کی صلاحیت کے ثبوت میں یہ دو شعر بھی حوالے کا کام دے سکتے ہیں:

مجھے فطرت شناسی دی، نظر کے دینے والے نے
برنگ خود ہر اِک قطرہ کو طوفاں کرتا جاتا ہوں
سَر مستیِ شباب میں تھرّا چکے تھے پاؤں
میرے خدا نے تھام لیا ناگہاں مجھے

مولانا نے جب اپنی فطرت شناسی کی اہلیت اور اس کی قدر و قیمت کو محسوس کر لیا اور
لِ خود و باندازِ خویش ہر اِک قطرے میں ہنگامۂ طوفاں اور شورِ رستاخیز پیدا کرنے کی قابلیت حاصل کر لی
سکوت لالۂ و گل اور خموشی و بے زبانیِ تماشائے چمن نے ان سے کلام کرنا شروع کر دیا۔ کائنات کے
ے ذرّے کی اس گویائی نے فکر و خیال کے ابعاد کو روشن ہی نہیں کیا، اس کو حقیقتوں کے دروازے تک
پادیا۔ اس علم و شعور کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بینی و کائنات نگری کا مرکزِ ثقل انسان کا اپنا وجود، اپنی ذات، اپنا
روں نظر آنے لگا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس مرکزِ ثقل سے ہی کائنات کی ساری تازہ کاری اور زندگی
تمام بوقلمونی اثر پزیر ہے۔ اسی روشن ضمیری سے سیہ خانۂ حیات میں ہر طرف اجالوں کی برسات ہوتی
ہے اور اپنی صلاحیتوں کا احساس جاگتا ہے:

روشن ہوا ہے ہم سے سیہ خانۂ جہاں
ہر سو پھرا کیے مہ و اختر لیے ہوئے

فانِ ذات نے انسانی زندگی کی قدر و قیمت اور معنویت کو اچھی طرح ذہن نشین کراتے ہوئے اس
یقت کو منکشف کر دیا کہ جب تک انسان اپنی اہمیت کو محسوس نہ کرے، اپنے اہدافِ وجود کو نہ جانے،
پنے مقصدِ تخلیق کو نہ سمجھے، انسان میں معنویت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسان کی خلوتیں خدا کی سرگوشیوں سے پُر
رہوتی ہیں، مگر اس کو سننے کے لیے ایسی قوتِ سماعت کی ضرورت ہوتی ہے، جو نبیوں اور رسولوں کے
ادالہام سے گہرا رشتہ اور اٹوٹ نسبت و علاقہ رکھتی ہو۔ جس کو یہ حسنِ سماعت مل جائے وہ اپنی تنہائی کو

انجمن آرائی اور اپنی داستاں کو زیبِ داستاں جاننے لگے۔ اُس کو کسی غیر کی بزم میں جانے اور حدیثِ دیگراں سننے اور کہنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مولانا فرماتے ہیں:

خود اپنی بزم پیدا کیجیے اور داستاں اپنی

یہ بزمِ غیر میں کب تک حدیث دیگراں کہیے

اپنی بزم کو جانِ انجمن اور آپ بیتی کو جگ بیتی اُسی وقت بنایا جا سکتا ہے، جب اپنی خفیہ صلاحیتوں اور مخفی قوتِ تخلیق کا علم وعرفاں ہو، اپنی علمی وفنی شخصیت کی پہچان ہو۔ انسان اس حقیقت کو سمجھ لے کہ دنیا اس کے لیے تو ضرور بنائی گئی ہے، لیکن وہ دنیا کے لیے نہیں بنایا گیا ہے کہ حصولِ لذّات اور کسبِ مال ومتاع میں لگ جائے۔ البتہ ان معنوں میں وہ ضرور دنیا کے لیے بنایا گیا ہے کہ وہ شہوانیت کی سطحیت سے ابھر کر روحانیت کی اس منزل بلند پر پہنچ جائے کہ دنیا کی امامت کا کام اس سے لیا جانے لگے اور زبان ومکان کی زمامِ کار اس کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ زمانے کی ہر گردش اس کی چشم وابرو کی جنبش سے استمزاج کرے۔ وہ خدا کی خدائی کے آگے سر بسجود ہو اور ساری خدائی اس کی گداگری میں اپنی بڑائی تصور کرے۔ تقدیرِ الٰہی اس کی رضا کو اپنا قطب نما بنائے۔ یہ تمام خوبیاں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب انسان کچھ اہداف ونکاتِ نظر متعین کرے، اسی کے ساتھ اپنے اندروں کو متحرک کرنے کی صلاحیت کو بڑھائے، زندگی کی ترجیحات کو نمایاں مقام دے۔ ان تمام فلسفیانہ پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے مولانا نے اپنی ایک غزل کے اشعار میں بہت سی ترغیبیں دی ہیں۔ ذہنی تحریک اور عملی سرگرمی لانے کے لیے بہت سے نکتوں کی وضاحت کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

خلوتِ بے نیاز کو سلطنتِ شہی سمجھ

بے خودیِ خودی میں ڈوب، سِرِّ قلندری سمجھ

آہ سحر کی قیمتیں دے نہ سکیں گے دو جہاں

سازِ شکستہ پر نہ جا، رازِ شکستگی سمجھ

حسنِ نظر سے کام لے غیر کا اعتبار کیا

حسنِ ایاز پر نہ جا، دیدۂ غزنوی سمجھ

مولانا کی یہ پوری غزل زندگی کے فلسفے پر بصیرت افروز گفتگو کرتی ہے۔ زندگی کے بہت سے موڑ ہوتے ہیں۔ زندگی کے سفر میں کئی مرحلے آتے ہیں۔ شب وروز کے دامن میں حالات کے نت نئے پیچ وخم اور واقعات کے تلخ وشیریں نشیب وفراز انسان کو گمراہ بھی کرتے ہیں اور اس کو راہِ ہدایت پر بھی ڈالتے ہیں۔

اس سلسلۂ دراز سے نفع وہی حاصل کرتے ہیں، جنھوں نے ذہن ودل کی آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔ اس غزل کا آخری شعر ہے:

یوں تو حیات نام ہے سلسلۂ دراز کا
عشق میں پر لٹی ہے جو اسی کو زندگی سمجھ

مقصدِ زندگی سے عشق، کام کرنے کی تڑپ، اور اپنے وجود کی معنویت کو پانے کی لگن مولانا کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ وہ بڑے سے بڑا سفر اور لمبی سے لمبی ذہنی وفکری مسافت کے تمام جاں گسل تجربات سے دوچار ہونے کے بعد بھی ان کی شاعری اپنے موضوع سے شمہ برابر بھی نہیں بھٹکتی اور اپنے قطب نما کے زاویے پر کھری اُترتی ہے۔

عموماً غزل میں تسلسلِ خیال، وحدتِ فکر اور اتحاد وتوسیع مضامین کی تلاش وجستجو کو بے معنی بتایا گیا ہے۔ کیوں کہ غزل کی ریزہ خیالی ہی اس کی خصوصیت بتائی گئی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنا ایک انفرادی اور شخصی وجود رکھتا ہے۔ عموماً غزل کا ہر شعر اکائی ہوتا ہے، جس کا اپنے ماقبل یا مابعد کے اشعار سے کوئی فکری تسلسل اور موضوعاتی تعلق نہیں رہتا۔ مگر مولانا کی غزلیہ شاعری میں غزلِ مسلسل کی روایت اپنی توانا فکر کے ساتھ ملتی ہے۔ ان کے یہاں بعض غزلوں میں وحدتِ فکر کی مثالیں موجود ہیں، جن میں ایک ہی خیال کو مرکزی نقطہ بنا کر شعر گوئی کی گئی ہے۔ اس قسم کی غزلوں میں فکری توسیع پسندی کا جذبہ غالب ہے۔ یہ غزل مولانا کے اسی رنگ شاعری کی نمائندگی کر رہی ہے:

وہ رنگیں ملاقات یاد آرہی ہے — برستی ہوئی رات یاد آرہی ہے
وہ کالی سی زلفیں وہ بکھرے سے افشاں — ستاروں بھری رات یاد آرہی ہے
فراموش کرنے لگا ہوں میں خود کو — پرانی کوئی بات یاد آرہی ہے
وہی رنگ و بو اور وہی کیف ومستی — وہی چاندنی رات یاد آرہی ہے
بتائے کوئی جب بھلا تا ہوں ان کو — تو کیوں ان کی ہر بات یاد آرہی ہے

وہ اطہر سحر کے حسیں جھٹپٹے میں
کسی کی ملاقات یاد آرہی ہے

اس غزل کو پڑھتے ہوئے کسی رومانی نظم کا گمان ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس غزل میں ایک ہی خیال کو مرکز مان کر بقیہ اشعار کہے گئے ہیں۔ ان شعروں میں تسلسلِ خیال اور فکر کی توسیع کا انداز قائم ہو گیا ہے۔

ایک اور غزل دیکھیے جس میں اتحادِ مضمون اپنی طرف ہماری توجہ چاہتا ہے:

چاند تاروں کی یاد آتی ہے — حسن پاروں کی یاد آتی ہے
کھل رہی ہے کلی کلی دل کی — گلعذاروں کی یاد آتی ہے
خرمن ہوش زد پہ آیا ہے — برق پاروں کی یاد آتی ہے
آتش دل خموش ہے کچھ کچھ — کن شراروں کی یاد آتی ہے
جن سے مانوس تھی شب ہجراں — ان ستاروں کی یاد آتی ہے

ذکر گل جب کوئی سناتا ہے
مجھ کو خاروں کی یاد آتی ہے

اس غزل کے چند اور شعر ہیں، جن میں ارتکازِ فکر قائم نہیں رہ سکا ہے اور وہ غزل کی ریزہ خیالی کی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں جیسے:

وجد میں آ کے جھوم اٹھیں پلکیں — اشکباروں کی یاد آتی ہے
اے سہارو! ہٹو، بچو، دیکھو — بے سہاروں کی یاد آتی ہے
شان سے ہر خوشی کو ٹھکرادوں — غم کے ماروں کی یاد آتی ہے

ناز کرتی ہے جن پہ ناکامی
ان سہاروں کی یاد آتی ہے

بات ختم کرنے سے پہلے ایک اور غزل کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں، جن سے خیالات کے تسلسل پر روشنی پڑ رہی ہے اور ردیف کی مناسبت سے احساس ہوتا ہے کہ ان اشعار میں ایک ہی فضا اور ایک ہی ذہنی و تاثراتی کیفیت ہے یا شاعر نے ایک ہی شعری تجربے کے مختلف پہلو کو بیان کیا ہے:

کام کی بات تھی وہ نہ آئے — چاندنی رات تھی وہ نہ آئے
کیف میں تھی شرابور مستی — خوب برسات تھی وہ نہ آئے
غرق تھی ظلمتوں میں خموشی — کیا حسیں رات تھی وہ نہ آئے
باوجود سے کہ وہ بھی تھے مضطر — جانے کیا بات تھی وہ نہ آئے

مضطرب میرے تارِ نفس میں
روحِ نغمات تھی وہ نہ آئے

مولانا قاضی اطہر کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی خالص غزلیہ روح میں بھی اسلامی فکر، مذہبی حسیت اور دینی شعور کی روشامل کر لی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ غزل کہتے کہتے اپنی دینی پیاس کی شدت سے بے چین ہو اٹھتے ہیں۔ اب جب تک اپنے اصلی رنگِ طبیعت اور اپنی حقیقی افتادِ مزاج کے ایک دو شعر غزل میں شامل نہیں کر لیں گے ان کی تسکین نہیں ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ غزلیہ رنگ و آہنگ کے پہلو بہ پہلو ان کی اسلام دوستی، مذہب پرستی اور دین و دیانت سے وابستگی کے جذبات جگہ جگہ ہمارا دامنِ توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کی شعری بساط اور سرمایۂ فکری نے بھی اس احساس کو جگایا ہے کہ وہ اسلام کے نفاذ کے لیے جی رہے تھے۔ زندگی میں وہ دینی ترجیحات کے قائل تھے۔ آسودۂ دنیا ہونے کے مقابلے میں ملت کی دردمندی انھیں عزیز تھی۔ اسی لیے غزل کی زلفیں سنوارتے وقت بھی ان کا قلم ایسے آبِ زلال کے قطرات ٹپکا رہا تھا جن سے اس عیش کوش اور راحت جو دنیا کو آسودگی کے باوجود ایک خاص قسم کی ذہنی تشنگی اور فکری ناآسودگی کا احساس ہونے لگے اور یہی ذہنی تشنگی اور فکری ناآسودگی اس کو دین کے میکدے تک کھینچ لائے۔ اُن کے اشعار میں ایک سچے مسلمان کے درد و دروں، ایک مردِ خدا کے سوز و ساز، ایک عاشقِ رسول کے کرب و اضطراب کی لہریں موجود ہیں۔ ان کے یہاں نانِ جویں اور دلقِ درویشی کو سرمایۂ حیات سمجھنے والے بندۂ مومن کے احساسات و جذبات اور فکری ارتعاشات کی سرمستی ملتی ہے۔ قلندری میں وہ سکندری کے جلوے دکھانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں بعض اشعار ایسے کہہ جاتے ہیں جو نعتیہ، حمدیہ، مناجاتی رنگ، یا منقبتی انداز و رجحان کے ہوتے ہیں۔ یوں تو ان کی پوری غزلیہ فکر سوقیانہ رنگ و آہنگ اور عامیانہ الفاظ و جذبات سے مبرا ہے اور کسی مقام پر تہذیب و شرافت کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ لیکن غزلوں میں بعض اشعار کو بالکل اسلامی و دینی جذبہ و شعور کا عکاس بنا دینا انھیں کا حصہ ہے اس سے ان کی زندگی کی اساسِ تقویٰ، شعائرِ اسلامی، اور آثارِ دینی سے ان کی زبردست اثر پزیری کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

کالی کملی ہے اطہر سہارا
پاس اپنے نہ چاندی، نہ سونا

کیا مقدّس سفر ہے اے اطہر
درِ کعبہ سے ربِّ کعبہ تک

بہت مجبور ہے یارب یہ روتی سی نوا میری
میں قرباں تیری رحمت کے کبھی سن لے خدا میری

میں دنیا بھر کی آزادی کا ارماں لے کے آیا ہوں
مسلماں ہوں میں اور شانِ مسلماں لے کے آیا ہوں

بسر کرتا ہوں اپنی زندگی اپنے سہارے پر
میں اپنے باروؤں میں زورِ ایماں لے کے آیا ہوں

مجھے وحشت سی ہوتی ہے اندھیری خانقاہوں سے
میں اپنی بزم میں تنویرِ ایقاں لے کے آیا ہوں

جہاں میں بے نیازِ رنگ و بو ہے طائرِ بطحا
میں اپنے آشیانے میں گلستاں لے کے آیا ہوں

ہے جس پر ناز فقرِ حیدری کو
وہی نانِ شبینہ چاہتا ہوں

سرورِ زندگانی چرخ لے لے
غمِ شاہِ مدینہ چاہتا ہوں

سرمستیِ شباب میں تھرا چکے تھے پاؤں
میرے خدا نے تھام لیا نا گہاں مجھے

عیش و نشاطِ دہر کیا، دونوں جہاں بھی اے خدا
میری نظر میں ہیچ ہیں تو ہی اگر مرا نہیں

قاضی صاحب کے کلام میں ماضی کی طرف مراجعت کا رجحان موجود ہے۔ عہدِ رفتہ کی بزمِ دوشیں اور بساطِ کہنہ کے نقوش ان کی یادداشت سے محو نہیں ہوتے۔ اسی کے سہارے ان کی زندگی کا سفینہ شب و روز اور ماہ و سال کی موجوں سے کھیلتا ہوا گزر رہا ہے۔ انھیں کبھی رونقِ محفل بنے ہوئے اپنے اسلاف کے نشانِ قدم، اور ماضی کے پردے میں چلی گئی علمی شخصیتوں کی متحرک پرچھائیوں کی تلاش ہوتی ہے۔ کبھی اُن کی زندگی کے سوز و ساز سے اپنے دَور کے لیے برگ و بار حاصل کرنے کی تڑپ اور امنگ انھیں بے چین رکھتی ہے۔ کبھی وہ عالمِ اضطراب میں اپنے دَور کا شہرآشوب پڑھتے ہیں۔ کبھی وہ ملّت کی

...ں کا نوحہ غم سناتے ہیں۔ اُن کا قلم رجز خوانی کی لے بدل کر کبھی مرثیہ و ماتم کا انداز و اسلوب اختیار
لیتا ہے۔ کہیں اپنے آباء کے کارناموں کو وہ خراجِ عقیدت پیش کرنے لگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

جز پیروی رسم محبت نہیں چارہ
آواز کہن بانگ درا میرے لیے ہے
جو مے کش تھے کبھی ساماں طراز رونق محفل
میں تجھ سے پوچھتا ہوں، ہیں تو آخر ہیں کہاں ساقی؟
ترے مے کش کبھی تھے مے کدہ بردوش دنیا میں
مگر ہیں آج کل تشنہ لبی سے نیم جاں ساقی
وہ کوئی دور تھا جب موجب عزت تھا سیما ھم
مگر اب باعثِ ذلت ہے سجدوں کا نشاں ساقی
ترے بادہ کشوں کے خون سے ہیں محفلیں رنگیں
تری بے اعتنائی کا ہے منظر خوں فشاں ساقی
جن کے سائے میں نیند آتی تھی
وہ ستارے نظر نہیں آتے
آنے والے تو روز جاتے ہیں
جانے والے مگر نہیں آتے
فرشتوں کے پر جلتے تھے جن کی بارگاہوں میں
نہیں معلوم آج ان کے ہی کاشانوں پہ کیا گزری
جن کے دل و نگاہ میں رقصاں تھی زندگی
وہ تھک کے رہ گئے ہیں مزاروں سے کھیلتے
شمشیر کل لرزتی تھی جن کی نگاہ سے
وہ آج ہیں نگاہ کے واروں سے کھیلتے

ان اشعار کی قرأت کے بعد ان سے ابھرنے والے شعری ارتعاشات اور معنوی اہتزازات
ہمارے اس یقین کو پختہ بناتے ہیں کہ مولانا کی شاعری کی حزنیہ لے میں مرثیہ گوئی کی جو تمنا کی اور

اشک شوئی کی فضا ملتی ہے۔اس کے لیے بھی اور دیگر شعری اصناف پر ان کی طبع آزمائی اور فکر وسخن کے دوران جوالمیہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے،اس کے لیے ٹوٹتے ہوئے اقتصادی، سیاسی،سماجی اور ثقافتی ڈھانچے نے زرخیز زمین مہیا کی ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا اور ان کے حساس شعور ودماغ سے اس کا علاقہ نہ ہوتا توان کی شعری فضا میں وہ ارتعاش اور کانپتی ہوئی پرچھائیوں کے انداز پیدا نہیں ہوتے ،جو ان کے کلام میں ایک نئے رنگ کی نمائندگی کرتے ہوئے ہمیں نظر آتے ہیں۔

قاضی اطہر نے اپنے دَور کے اہم مسائل یعنی جنگ،سیاسی دہشت گردی،فسادات اور ان کی نفسیات پر شعر کا پردہ ڈال کر اظہار خیال کیا ہے۔جس میں ایک خاص قسم کی عمومیت آ گئی ہے۔ورنہ اس قسم کی شاعری میں حالات وزمانہ کا براہ راست ذکر کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ حقیقت اپنی سیال حیثیت کو خیر باد کہہ کے ایک سپاٹ اور خشک چیز بن جایا کرتی ہے۔انھوں نے معاشی بحران اور بے روزگاری پر نوحہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے،دل کے درد اور جذبات کی شدّت کے ساتھ لکھا ہے۔اس میں انھوں نے اپنی فکری سمجھ اور انسان دوستی کے احساس کا ہر مقام اور ہر موقع پر لحاظ رکھا ہے۔ان کی یہی احتیاط،خبرداری اور ہوشیاری ان کے اندیشہ کا عکس یوں سامنے لاتی ہے:

اتر آئی ہے دل سے شدتِ نالہ نگاہوں میں
سکوت شام آ جائے نہ ہنستی صبح گاہوں
یہ کیا معلوم تو نے آتشِ سیال رکھی تھی
ابھی تک جل رہا ہوں جام رنگیں کے شراروں میں

قاضی صاحب کی شاعری کی جو زبان ہے، وہ سادہ وسلیس اور سہل ممتنع کے قریب ہے۔ان کے اشعار میں الفاظ کی ترتیب ونشست نثری اسلوب سے مناسبت رکھتی ہے۔ان کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ اگر ان کی نثر کی جائے تو ہو ہی نہیں سکتی۔ان کے یہاں ژولیدگی اور پیچیدگی کا عمل دخل نہیں ملتا۔اس قسم کے اشعار اس بات کی زبردست دلیل ہیں کہ قاضی صاحب کو اپنے اسلوب، اپنی زبان، اپنے اندازِ گفتار پر اتنی ماہرانہ قدرت اور دستگاہ حاصل تھی کہ وہ اپنے خیالات وتاثرات کو بلا کم وکاست تمام مقتضیات ولوازم کے ساتھ ادا کرتے تھے۔وہ شاعر سے زیادہ ایک کامیاب آرٹسٹ تھے اور ان کی شاعری میں لفظوں کا استعمال وانتخاب بہت اہمیت کا حامل تھا۔انھیں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ کہنے اور وہ بھی گہرائی کے ساتھ کہنے کا فن خوب آتا تھا۔ان کے آہنگ میں ایک شخصی آہنگ اور انفرادی لہجہ سنائی

دیتا ہے جو بہت غیر معمولی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

شرار بن کے آیئے، بہار بن کے آیئے
مگر چمن کے واسطے نکھار بن کے آیئے
ترازوؤں پہ مصلحت کی تو لیے نہ ہوش کو
پکار پر نہ آیئے، پکار بن کے آیئے
ورائے ہوش اک عالم بنائے بیٹھے ہیں
تمھاری یاد میں خود کو بھلائے بیٹھے ہیں
دل و نگاہ کو رہ رہ کے پھونکنے والے
ہم آج محفل ہستی سجائے بیٹھے ہیں
جن کو دانہ قفس کا راس آیا
راس انھیں بال و پر نہیں آتے
نہ پیتے ہوں سرِ مے خانہ لیکن کیوں کہے اطہرؔ
یہ ذمہ کون لے کہ قبلۂ عالم نہیں پیتے
کشش کھینچے لیے جاتی ہے اُن کی جانب منزل
انھیں روندے ہوئے ذروں کو میر کارواں کہیے
بنائے آشیاں رکھ دی ہے میں نے کس کے گلشن میں
یہاں کا پھول بھی برق تپاں معلوم ہوتا ہے

ان اشعار پر غور کرنے سے یہ خصوصیت روشن ہوتی ہے کہ ان میں کوئی لفظ بھرتی کا نہیں ہے۔ جو لفظ آیا ہے اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ ہر لفظ ایک اکائی ہے اور اس لفظ کے آگے جو دوسرے الفاظ آئے ہیں وہ مطلب اور معنی کے قافلے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ لفظ ظاہری طور پر بھی اور اپنی تہ کے اعتبار سے بھی ارتقائے معنی میں معاون و مددگار ہیں۔ ان اشعار میں سے اگر ایک لفظ کو بھی کم کر دیا جائے یا مصرع سے نکال دیا جائے تو مفہوم اپنی تعبیر و تفسیر کے صحرا میں بھٹک کر رہ جائے گا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب کے یہاں لفظوں کی انفرادی حیثیت اجتماعی حیثیت و اہمیت کو بڑھانے کے لیے ہے۔ یہ پہلو قاضی صاحب کی شاعری کے لیے موجب افتخار و امتیاز اس لیے ہے کہ سادہ ہونے کے مقابلے میں پیچیدہ ہونا اور قابل فہم

ہونے کے مقابلے میں پُر اسرار ہونا کہیں زیادہ آسان ہے۔ بڑا ادیب وہ ہے جو اپنے شعور کی پیچیدگی کو ظاہر کیے بغیر نسبتاً سادہ الفاظ میں اپنے شعور کے اظہار کا طریقہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

دردِ مہاجرت مولانا کی عمر تلاشِ روزگار اور سلسلۂ معاش میں گھر اور وطن سے دور پردیس میں گزری ہے۔ وہ امرتسر، لاہور، ڈابھیل (گجرات) اور بہرائچ میں رہے۔ عمر کا بہترین حصہ بمبئی جیسے علم کش شہر میں گزارا، یعنی وہ پوری عمر مہاجر رہے۔ اس لیے ان کی ادبیت وشعریت میں بھی مہاجرانہ فکر ہے۔ ان کا کلام پڑھنے سے دردِ مہاجرت کی آنچ شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ کہیں وہ اخترؔ شیرانی کی طرح اہلِ وطن کی خیریت طلبی میں سوال کرتے ہیں: ع

اودیش سے آنے والے بتا، کس حال میں ہیں یارانِ وطن

کبھی وہ مولانا محمد علی جوہرؔ کے انداز میں نوحہ خواں ہوتے ہیں:

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور؟
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور؟

کبھی شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کے پُرسوز لہجے میں فرماتے ہیں:

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

مولانا تلاشِ معاش میں جن صعوبتوں کے جہنم سے گزرے اور بے روزگاری کے جن جزیروں میں زندگی کے ابتدائی ایام گزارے اُن کے نقوش ان کے کلام میں جابہ جا ملتے ہیں۔ احیاء العلوم میں وہ تحصیلِ علم کے بعد مدرّس ہوئے۔ مگر حالات کے انقلاب اور انتظام کاروں کے سلوک نے انھیں اپنی مادرِ علمی کی آغوشِ محبت سے علیٰحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا اور انھیں دیس چھوڑ کر پردیس کی راہ لینی پڑی۔ ایک ایسا نوجوان جس نے صرف دورۂ حدیث کا ایک سال وطن سے دور باہر رہ کر گزارا ہو اور اس کے علاوہ کبھی اس نے دردِ ہجرت کا عذاب نہ جھیلا ہو، اس کے دل کی دھڑکنوں سے ہی اس کے ذہنی اضطراب واضمحلال کا حال پوچھا جا سکتا ہے۔ مولانا انھیں حالات میں وطن سے اپنی محبت کا اظہار کچھ ایسے لفظوں میں کرتے ہیں کہ درد کی پوری کائنات سمیٹ لیتے ہیں:

مجھے اپنوں سے الفت ہے وگرنہ قاضیِ اطہرؔ
انھیں حالات میں اپنوں سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے

مولانا ایک شعر میں درد کے آہ اور آہ کے فغاں تک پہنچنے کے بین السطور سے جو تاثر پیش
ا چاہتے ہیں، وہ ان کی زندگی کی جہت اور فکر کے قطب نما سے خصوصی تعلق رکھتا ہے۔ مولانا کا شعر سنیے:

درد سے آہ تک آہوں سے فغاں تک پہنچے
خیر سے اب تو یہ مجبور یہاں تک پہنچے

ا دوسری غزل میں فرماتے ہیں:

بتائیں سوئے محمل بے تحاشہ دوڑنے والے
جرس کیسا، ہے منزل کون، صحرا کی ہوا کیا ہے

سلسلے کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں مہاجرانہ فکر بہت واضح اور بے غبار سی ہے:

جن کو یادِ وطن بھی ٹھکرا دے
بھول کر بھی وہ گھر نہیں آتے

عذاب دردناک آیا گنہ گاروں کی بستی پر
یہ ہل چل سی مچی ہے کس لیے ان بے گناہوں میں

جہاں والے اماں دیتے نہیں، جب اہل غیرت کو
پناہیں ڈھونڈھ لیتے ہیں وہ جا کر بے پناہوں میں

وہ عہد کہن، وہ دورِ چمن، یاد آئے بھی تو اب یاد نہ کر
اس وقت پہ رونا لا حاصل، جو وقت کبھی بھی آ نہ سکے

مقید زندگی، احساس گم، اور بند بینائی
قفس والوں سے کیا حالِ فراقِ آشیاں کہیے؟

بنائے آشیاں رکھ دی ہے میں نے کس کے گلشن میں؟
یہاں کا پھول بھی برقِ تپاں معلوم ہوتا ہے

فضائے غم پہ چھائی ہیں گھٹائیں دیدۂ تر کی
بطرزِ نو بہارو! ابر و باراں کرتا جاتا ہوں

کبھی سوئے زنداں، کبھی سوئے صحرا
مری زندگی آنے جانے میں گزری
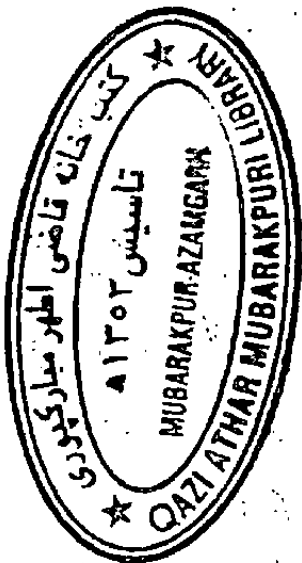
یہ میرا ظرف ہے زنداں میں لایا ہوں بیاباں کو
بیاباں میں بھی اپنے ساتھ میں زنداں لے کے آیا ہوں

بہر حال جینا تھا رو کر کہ ہنس کر
بہر حال جینے کے دن تو گزارے

ترستا ہے قفس میں عمر بھر صیاد گلشن کو
چمن پہ آخری چلتے چلاتے اک نظر کر لیں

میں نے یہ مرحلے یوں گزارے ہیں چمن میں رات دن
برق جب چمکی ہے فکر آشیاں ہونے لگی

ایسے جیے کہ گلشن وہم و خیال میں
تنکے بھی چند شوق سے یکجا نہ کر سکے

تف ایسی زندگی پہ ہے، جیتے رہے مگر
ہم زندگی کا فرض بھی پورا نہ کر سکے

اِن اشعار میں مولانا نے دردِ مہاجرت کی آنچ کو لفظوں کے ریشمی پیرہن اور شعر
حریری دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کی اس قسم کی شاعری اس حقیقت کو منکشف کرتی ہے
اُنھیں اپنی جوانی میں ہندوستانی قومیت کے بکھرتے ہوئے تانے بانے کو دیکھ کر ذہنی اذیت اور روحا
تکلیف محسوس ہورہی تھی۔ وہ متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھنے والوں اور اس خواب کی بہتر تعبیر تلاش کر
والوں کے قبیلۂ فکری سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اتحاد و یکجہتی کے علم بردار اور قومی ایکتا کے بڑے طرفدار
آرزومند تھے۔ اُنھیں ہندوستان کا تکثیری سماج بے حد عزیز تھا۔ وہ فرقہ وارانہ خطوط پر قومول
صف آرائی کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ مطالبۂ پاکستان اور ہندو مسلم امتیاز کے لیے اُن کے دل میں کوئی ج
نہیں تھی۔ ہندی مسلمانوں کی قربانیوں اور وطن کے لیے ان کی طویل جاں فروشیوں کو نظر انداز کرنے ا
ہندو احیاء پرستی کی تحریکوں نے اُن کے قلب و دماغ پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے
مُٹھی بھر مفاد پرستوں اور فرقہ وارانہ رجحانات رکھنے والوں کی شدت پسندی سے کمزور و پسماندہ ا
کم اختیار رکھنے والے طبقے اپنے ہی وطن میں اجنبی ہوتے جا رہے ہیں۔ اُن کے پاؤں اب تک ا
آباء و اجداد کی جن مضبوط اور سخت زمینوں پر ٹکے ہوئے تھے، وہ اِن کے لیے جہنم بنتی جا رہی ہے۔

ہم وطنوں سے جذبہ اخوت کی زمین پر اعتماد و یقین کی عمارت گرتی جا رہی تھی اور کھنڈروں میں تبدیل ہوتی ہوئی بستیاں لٹتی جا رہی تھیں۔ دلوں میں نفرت اور آنکھوں میں دیواریں بننے کا سلسلہ اتنی تیزی سے جاری تھا کہ بڑے بڑوں کی مداخلت سے بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اللہ و گلی اور گھر گھر پھیلی ہوئی خاک وطن بے گناہوں کے خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ ڈر سے سہمے لوگ خانہ بدوشی پر مجبور تھے۔ بے گھر ہوتے ہوئے خاندان اپنی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے جائے پناہ کی تلاش میں در در بھٹک رہے تھے اور انھیں کوئی سہارا دینے والا نہیں مل رہا تھا۔ عزت و ثروت کے بڑے بڑے مینار قلعۂ مکانی کا عذاب جھیل رہے تھے۔ بزرگوں کے پیمانے بے اعتمادی کی دھند میں گم ہو رہے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ پیڑوں کے سائے کی گھنیری چادریں دھوپ سے گھبرائے ہوئے پنچھیوں کے سر سے چھن ہی نہیں رہی تھیں بلکہ خود پیڑوں سے چھاؤں کی رفاقت بھی ختم ہونے لگی تھی۔ جسم و روح کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کی تحریک کا دورِ شباب تھا۔ لباسِ تہذیب کو بدن پر کیا چھوڑا جاتا کہ مردوں کے کفن کو بھی چھیننے کا جنون پیدا ہو چکا تھا۔ قبریں لاشوں کو قبول کرنے سے انکار کرنے لگی تھیں۔ ہر نیا سورج خون میں نہایا ہوا طلوع ہوتا اور عزت و ناموس کو لوٹنے والی رات کے آنے کی خبر سنا کر ڈوب جاتا تھا۔ جو کبھی مصیبت کی گھڑیوں میں غم گساری اور درد کو بانٹنے کے لیے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ اب وہ ان کے خالی ہوتے ہوئے آشیانوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور بلند چوکھٹوں پر قبضہ کر کے خود تنہا مالک بننے کا خواب بننے لگے تھے۔ انقلابِ زمانہ کی ان آندھیوں اور حالات کے جبر کو اظہر جیسا زود حس شاعر کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ انھوں نے درد قومی میں ڈوب کر تباہ ہوتی ہوئی ہندوستانی قومیت اور مسلمانوں کی وراثت کی بربادی کا مرثیہ تمام تر المناک پہلوؤں کی زبردست منظر کشی کرتے ہوئے اپنے خونِ دل سے سوگوار لہجہ میں رقم کیا۔ مذکورہ بالا اشعار کا رشتہ مولانا کی داخلی کیفیتوں سے بہت گہرا ہے۔ ان اشعار کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ غم سے ان کی بڑی موانست اور ازلی رفاقت ہے۔

آہنگِ سخن | قاضی صاحب نے اپنی شاعری میں اپنی ادبیت اور عربیت کا اظہار کرنے سے گریز کیا ہے۔ حالاں کہ وہ عربی کے جید عالم و مصنف بھی تھے۔ ''مقاماتِ حریری'' اور ''مقاماتِ زمخشری'' پڑھنے سے ایسی نظر پیدا ہو چکی تھی کہ وہ عربی کی بلاغت کے رمز آشنا ہو چکے تھے۔ ''مقاماتِ حریری'' پڑھانے کا انھیں بڑا ملکہ تھا۔ وہ مشکل سے مشکل مقامات کو آسان بنا دیتے تھے۔ اسی لیے اُن سے اکثر اشخاص نے مختلف اوقات میں یہ کتاب پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ وہ علمِ لغت کے اتنے واقف کار

تھے کہ اگر الفاظ کے دریا بہانے پر آ جاتے اور اَدق لفظوں کے جوہر دکھانے لگتے تو وہی انداز ہوتا جو ان کی تحقیقی اور علمی کتابوں میں نادر و کمیاب کتابوں کے حوالوں کی بہتات کا ہے۔ اگر وہ ترقی پسندوں کی طرح چاہتے تو اپنی اساطیری زبان دانی کی صلاحیت کا بھی اظہار کرنے میں کوئی عجز محسوس نہیں کرتے۔ مگر سب کے باوجود انھوں نے آسان اور سلیس زبان استعمال کی۔ عوام کی فہم سے قریب کے مضامین وخیالات سے سروکار رکھا۔ سادہ و رواں انداز بیان اختیار کیا۔ بحر و وزن کے انتخاب میں بھی روانی سلاست، ترنم کے بہاؤ اور زبان ولفظ میں اُردو کے آریائی مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے بل اور سکتہ کی رعایت سے صوتی نظام کی شکست وریخت سے بچنے کا التزام رکھا۔ انھوں نے اس کی خاص شعوری کوشش کی ہے کہ غزلوں کی زبان میں کوئی گرہ، گانٹھ اور ژولیدگی پیدا نہ ہو اور ان کی ادائیگی میں پیچیدگی کا کوئی مسئلہ نہ اُبھر سکے۔ ایک عام آدمی بھی پڑھنے میں اسی لے اور ترنم، آہنگ اور دھن کے نظام کو باقی رکھ کے جو ایک واقف کار ماہر صوت کی خوش الحانی کے انداز میں ہوا کرتا ہے۔

مولانا نے اپنے حالات ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں ایک جگہ اپنی ذہن ساز کتابوں کے ذکر میں حالی کی مسدسِ حالی کا نام لیا ہے اور ''کاروانِ حیات'' میں بھی کچھ نثری کتابوں کا حوالہ اس تعلق سے دیا ہے کہ ان کے مطالعہ سے ان کے ذوق وشوق کو جلا ملی۔ مگر کہیں اور اُردو شاعروں کی کسی اور شعری کتاب یا دیوان کا نام نہیں لیا۔ البتہ اپنے تعلقات کے ذکر میں علامہ تاجور نجیب آبادی وغیرہ کا کچھ تذکرہ کیا ہے۔ حفیظ جالندھری سے اثر پزیری کی بات کہیں تسلیم نہیں کی ہے۔ مگر اشارتاً اُن کے ''شاہنامۂ اسلام'' کے والہانہ وعقیدت مندانہ انداز میں ان کی نظم ''اصحاب صفہ'' کے بین السطور میں کچھ اندرونی قرائن اور داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ اگر کھل کر کسی سے متاثر ہونے کا اعتراف ہے تو وہ اصغر گونڈوی اور احسان دانش کا ہے۔ انھوں نے اپنے حالات میں احسان سے اپنے اصلاح لینے پر کبھی کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ اس کا تذکرہ احسان دانش کی خودنوشت جہانِ دانش کے حصہ اوّل میں آیا ہے کہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری میرے شاگرد ہیں۔ بعض مقامات پر علامہ انور صابری، ظفر ملتانی اور اظہار اثر کرت پوری کا بھی نام لیا ہے۔ علامہ انور صابری سے تو قاضی صاحب کے گہرے مراسم تھے۔

ان سب صورتِ احوال کی کڑیوں کے ملانے سے جو تاثر اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا ان تمام شخصیتوں سے کسی نہ کسی حد تک اپنی شاعرانہ زندگی میں متاثر ہوئے ہیں اور ان کے زبان وبیان کے اصول وشرائط اور قواعد وضوابط فن کے بعض بعض نکات کی پیروی کی۔ علامہ تاجور نجیب آبادی زبان کے بڑے

ماہر اور مشہور شاعروں کے ایک بڑے قافلے کے استادِ فن تھے۔ جن میں احسان دانش، حفیظ جالندھری، شورش کاشمیری، ساغر نظامی کے نام سامنے کے ہیں۔ ماہر اقبالیات اور اُردو کے شاعر جگن ناتھ آزاد نے بھی کلامِ اقبال کی گرہ کشائی کا فن علامہ تاجور نجیب آبادی سے اپنی طالب علمی میں سیکھا تھا۔

مولانا نے جب شاعری شروع کی تو کوئی نہ کوئی شعری نمونہ ان کے سامنے رہا ہوگا۔ ظاہر ہے بحر و وزن اور اندازِ بیان میں اُس کا کچھ نہ کچھ تتبع ضرور کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں بحر و وزن کا جو انتخاب ہے اس کے مطالعہ سے ایک تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی پرائمری کی تعلیم میں اسمٰعیل میرٹھی، حالی، اقبال اور بچوں کے دوسرے شاعروں کی مناجات، نظم وغیرہ نصابی کتابوں میں پڑھیں۔ اُن سب کے صوت و آہنگ کا اثر ان کی حسِ ترنم کی تشکیل اور صوتی نظام کی ترتیب میں بہت نمایاں طور پر پڑا ہے اور وہ کبھی اس سے اپنے شعر کہنے کے ایام میں بچ نہیں سکے۔ انھوں نے اس دَور میں پڑھے ہوئے نصابی کلام سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں مختصر بحروں، رواں اور مترنم اوزان ہی کا انتخاب ہوا ہے۔ وہ حسی تھکن پیدا کرنے سے بچتے ہیں۔

قاضی اطہر صاحب کے کلام میں غنائیت، موسیقی اور دل و دماغ میں ارتعاش پیدا کرنے والی دھن اور لے کی بہتات ہے۔ ان کی شاعری کی اندرونی ساخت اور اس کا آہنگ ان کے احساسِ ترنم سے ہم آہنگ ہے۔ مولانا کے الفاظ و تراکیب کا داخلی سُر ان کے مزاجِ موسیقی کا نمائندہ ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ مولانا نے جن اوزان و بحور کو استعمال کیا ہے۔ اس کے استعمال میں ان کے شعور کو کوئی دخل نہیں وہ مجبوری اور بے چارگی یا لسانی عجز کی وجہ سے ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی بات کہنے کے لیے جو فارم، جو ہیئت، جو تال سر اختیار کیا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر اور احساسِ ترنم کی پوری بیداری کے ساتھ ہے۔ اس میں غفلت شعاری یا اجباری نفسیات نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ہماری راگ راگنیاں اور احساسِ موسیقی عجمیوں اور عربوں کے مزاجِ موسیقی سے بعض معاملات میں مختلف ہیں۔ ہندوستانی لسانی شعور میں عربوں کی بہ نسبت گرہ کم، ژولیدگی نامعلوم، اور صوتی پیچیدگی نامحسوس ہے۔ اس میں روانی، سلاست، سادگی اور جھرنے کی سی نرم و شیریں روانی پائی جاتی ہے۔ مولانا کی شاعری کا عروضی تجزیہ گو کہ عربی و فارسی عروضی قواعد و شرائط کے زیرِ اثر ان کے کلام کے داخلی آہنگ کو ظاہر کرتا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا مزاجِ شعری، احساسِ ترنم اور ارتعاشِ آہنگ اپنی فطرت، اپنی بے ساختگی اور اپنے صوتی نظام کے اعتبار سے غیر عربی، غیر عجمی اور سراسر ہندوستانی ہے۔ ان کی عربی و عجمی نے میں ہندی لے چھپی ہوئی ہے۔ ان کا

نطق شعری ہمیشہ نغمۂ ہندی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی فکر حجازی ضرور ہے مگر آواز کی زیر یں لہروں میں ہندوستانیت اپنے اتار چڑھاؤ کو ظاہر کر رہی ہے۔ کلام کو پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی یہ احساس ابھرتا ہے کہ قاضی صاحب نے کلاسکی عروض پر خط تنسیخ نہیں پھیرا البتہ اپنے ہندوستانی مزاج آہنگ کے سہارے انھوں نے اس کی تشکیل نو کی ضرور کوششیں کی ہیں۔

گیان چند جین نے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے ایک نرالے تجربے کا بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے اپنے قیام پیرس میں ۱۹۵۲ء میں بحرِ ہزج مثمن سالم (مفاعیلن ۸ بار) کا عربی، فارسی اور اُردو کا ایک ایک شعر منتخب کیا۔ ان کے ایک عرب دوست، ایرانی دوست اور خود انھوں نے باری باری سے اپنی اپنی زبان کا شعر تحت اللفظ پڑھا ہر بار بقیہ دو سامعین نے اعتراض کیا کہ قائل شعر کو وزن سے خارج کر کے پڑھ رہا ہے۔ اس تجربے کا ذکر کرنے کے بعد گیان چند جین اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ایک ہی وزن کو ادا کرنے میں مختلف قوموں کا زیر و بم مختلف ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر قوم لفظ کے صوتی رکنوں اور جملے کے الفاظ میں مختلف مقامات پر بل دے کر بولتی ہے[1]

مذکورہ حوالہ اس یقین کے لیے کافی ہے کہ انسانی آوازوں اور اس کے صوتی شعور پر خطہ، نسل، قوم کے جغرافیائی، نسلی اور قومی اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی مان لینا چاہیے کہ ایک ہی خطہ، ایک ہی نسل اور ایک ہی قوم کے افراد بھی جس طرح باہم ''من تو شدم تو من شدی'' کی تفریق مٹا کر بالکل ہم مزاج اور ہم طبیعت نہیں ہوتے بالکل اسی طرح صوتی شعور و مزاج اور فطری و خلقی آہنگ میں بھی کچھ نہ کچھ حد تک مختلف ہو سکتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب کے کلام کے اندرونی آہنگ کے نظام پر غور کرنے اور ان کے صوتی شعور کے تجزیہ سے اس کی تصدیق و توثیق ہو جاتی ہے کہ ان کا نظام موسیقی ان کے مزاج سخن سے پوری طرح ہم آمیز ہے۔ وہ رواں، مترنم اور بہتی ہوئی لے کی نمائندگی کرنے والے آہنگ میں شاعری کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں اسی لیے ان کے کلام میں آوازوں کا ہجوم کم ہے۔ ان کے یہاں ہکلاتے، ہچکچاتے، توتلاتے اور رکتے اٹکتے لہجے نہیں ملتے۔ انھوں نے جو صوتی آہنگ اپنی شاعری میں اپنائے ہیں ان میں غنائیت اور موسیقیت بہت ہے۔ انھوں نے چند بحروں اور ان کی مزاحف صورتوں میں اشعار کہے ہیں۔ سب سے زیادہ انھوں نے جس بحر کو استعمال کیا ہے اور جس میں شعری اظہار کیا ہے، وہ بحرِ ہزج مثمن سالم

---

1. اُردو کا اپنا عروض۔ گیان چند جین۔ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی ۱۹۹۰ء (ص: ۱۱-۱۲)

(مفاعلن ۴ بار ایک مصرع میں) ہے۔ یہی بحر ان کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے اور اسی میں کثرت سے ان کے کلام ملتے ہیں۔ ایک بات اور نوٹ کرنے کی ہے کہ ان کی غزلیں جو دوسرے اوزان و بحور میں ہوئی ہیں ان میں سے بھی زیادہ تر ایسی ہیں جو بحر ہزج سالم کی مزاحف بحروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یوں کہ عرب میں یہ بحر موسیقی کے لیے بہت مقبول و متداول رہی اور اس کے مفہوم میں بھی اچھی اور سُریلی آواز والے گانے کی آواز شامل ہے۔ اس لیے قاضی صاحب کے ذہنِ حجازی سے اس کا رشتہ استوار ہے۔ غور کرنے پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس بحر کا داخلی آہنگ اور اس کا صوتی نظام جھولے میں جھولتے ہوئے جسم جیسا محسوس ہوتا ہے اور اس کے زیر و بم میں لہریں لیتے دریا کی سی روانی چھپی ہوئی ملتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ بلندی سے ڈھالو زمین پر اُترتے ہوئے چشمے جیسا بہاؤ اس میں موجود ہے، اس کی موسیقیت اور غنائی سحر آفرینی نطق انسانی اور نغمۂ شاعر کو نوائے سروش اور لحن داؤدی کا نظام صوتی فراہم کرتی ہے۔ اس میں جو تاثیر غنا ہے وہ دل و دماغ کے تاروں کو چھیڑنے کی زبردست صلاحیت سے معمور ہے۔

مولانا کے یہاں اکثر غزلیں مختصر صوتی نظام کی پابند ہیں۔ ان کے مصرعے چھوٹے چھوٹے اور رواں ہیں۔ جن کو پڑھنے یا ترنم سے ادا کرنے میں سنگریزوں اور ریگزاروں کی بے ترتیبی میں سانسیں دم نہیں توڑتیں اور نہ ہی سانسیں اکھڑتی ہیں۔ اُن کی غزلیں تحت اللفظ پڑھیں، یا ان کو صدا بند کریں، دونوں صورتوں میں ایک صوتی لذت اور داخلی کیف کا احساس ہوتا ہے۔ طبیعت میں انقباض یا ذہن میں انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ کلام موزوں کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ پروفیسر خورشید الاسلام کی ایک غزل کا مطلع ہے:

غزل بھی فن ہے کسی دل نواز قاتل کا
اگر سنو تو کلیجہ نکل پڑے دل کا

قاضی صاحب کی غزلوں کا صوتی حسن بھی کچھ اسی قسم کا ہے، ان کی غزلوں کا نظام صوتی بھی کچھ اسی رنگ سے ملتا جلتا ہے۔ ان کے آہنگ کی داخلی ساخت اور اندرونی بہاؤ سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے اور دل و دماغ کو جو حظ حاصل ہوتا ہے اس کی کیفیتوں کا بیان لفظوں کے ذریعہ ممکن نہیں۔ یہ لذت محسوس کی جا سکتی ہے، زبان سے کہی نہیں جا سکتی۔

مولانا نے اپنی شاعری کے آہنگ اور اس کے داخلی صوتی نظام کو صرف اپنے مزاج سخن اور

شعور فن سے ہم رشتہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان کے اس اضافے کو تحسین کی نظروں سے دیکھا جائے گا کہ انھوں نے اپنی شاعری کے آہنگ کی تشکیل اور اس کی غنائیت کی لہروں میں جھولے کے جھولنے کی کیفیت ابھارنے کے لیے ہندوستانی مزاج موسیقی سے لاشعوری طور پر دوری مٹا کر قربت اختیار کر لی ہے۔ مولانا اپنے مزاج و احساس کے اعتبار سے جس ماحول کے پروردہ اور جس تہذیب اسلامی کے نمائندہ تھے اُس کے زیر اثر یہ کبھی بزم رقص و سرود میں شریک نہیں ہوئے اور نہ ہی راگ راگنیوں سے دلچسپی لی بلکہ اس طرح کی تقریبات و اہتمام کو وہ لغو اور لہو و لعب میں شمار کرتے تھے۔ اس لیے ہندوستانی نظام موسیقی سے شعوری طور پر استفادہ کرنے کی بات بالکل خلاف واقعہ رہے گی۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود میرا احساس یہی ہے کہ مولانا کو ہندوستانی راگ راگنیوں سے غیر شعوری طور پر ہی سہی فائدہ پہنچا ہے اگرچہ وہ ہمیشہ ایسے لوگوں، ایسی صحبتوں، ایسی مجلسوں سے دور و نفور رہے۔ اُن کا دینی مزاج تو ایسا تقویٰ شعار تھا کہ:

"رضا شاہ پہلوی سابق شاہ ایران کی ہند آمد کے وقت تین روز تک حکومت کی طرف سے شراب بندی ختم کر دیے جانے کے احتجاج میں انھوں نے دعوت نامہ کے باوجود دعوت کو ٹھکرا دیا"[1]

اس کے علاوہ مولانا کی اس تحریر سے ان کی حسِ تقویٰ پر بہت گہری روشنی پڑتی ہے جو انھوں نے اپنے حالات میں لکھی ہے اُس کا ایک اقتباس پیش ہے:

"شاہ حسین والیِ اردن بمبئی آئے۔ جناب محمد زینل علی رضا صاحب نے ان کو شاہی انداز کی دعوت دی۔ میرے پاس بھی دعوت نامہ بھیجا مگر میں اس میں شریک نہیں ہوا کیوں کہ شاہ حسین کے اعزاز میں انڈو عرب سوسائٹی کی طرف سے رقص و سرود کا پروگرام ہوا تھا، اس لیے مجھے انقباض تھا"[2]

اس اقتباس سے یہ بات بہت صاف ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی افتادِ طبع اور دینی احساس کی بیداری کی وجہ سے راگ رنگ کے قریب کبھی نہیں پھٹکے، تو یہ کیسے سمجھا جائے کہ انھیں غیر شعوری انداز ہی میں سہی ہندوستانی فن موسیقی سے فائدہ پہنچا۔ دراصل مولانا کی حسِ ترنم ہندوستانی گائیکی سے بہت مطابقت و مناسبت کھاتی تھی۔ جغرافیائی، نسلی اور قومی اثرات کا نتیجہ تھا کہ وہ فطرتاً اور خلقاً ایسا عروضی شعور یا حسِ ترنم

---

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخو پور (ص:۱۳۵) [2] ایضاً (ص:۱۳۵)

رکھتے تھے، جس نے ان کی شاعری کے آہنگ دروں اور صوتی نظام کی تشکیل میں حصہ لیا۔ مولانا اپنے ایمانی وحجازی دل ودماغ کے باوجود کسی نہ کسی مرحلۂ زندگی میں ہندوستانی مزاج واقدار سے متاثر ہوجایا کرتے تھے۔ ان کی کتابیں جو عرب وہند کے درمیان مختلف سطح کے روابط کی وضاحت میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی تبویب وتسوید نے اس کے شواہد کو اجاگر کردیا ہے کہ اگر وہ ہندوستانیت اور عربیت کے درمیان قدر مفاہمت اور رنگ اشتراک پیدا کرنے کا جذبہ نہ رکھتے تو اس طرح کی کتابیں تحریر میں نہیں آپاتیں۔ اس لیے یہی سمجھنا چاہیے کی ان کے کلام میں جو غنائیت، لوچ، موزونیت اور لہجے کی جو روانی ہے وہ نطق ہندی کے ساتھ حب وطنی کی بھی دین ہے۔

بعض ائمۂ ادب الفاظ وبحر کا تعلق اصناف سخن سے جوڑتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ مثنوی، غزل، قصیدہ، رباعی کے مزاج کی مناسبت سے کس طرح کی زبان، کس طرح کے خیالات، کس طرح کے انداز بیاں اور کون سی بحر استعمال کی جائے یعنی وہ لوگ اصناف کی تقسیم کے لحاظ سے اوزان وزبان کے مسئلۂ انتخاب کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ ناقدین فن موضوعات ومواد اور خیالات ونظریات کی روح کی رعایت سے انتخاب اسلوب وہیئت اور اندرونی آہنگ ونظام بحر کی بات کرتے ہیں۔ لیکن اُردو شاعری کے سرمائے کے مطالعے سے یہ بات بہت صاف ہوجاتی ہے کہ انحراف وتلاش کے جذبے سے باشعور شاعروں کا قافلہ کسی دور میں دستبردار نہیں ہوا۔ ہر زمانے میں شعور کی رو نے کچھ نئے رجحانات کا اشاریہ ترتیب دیا اور ہر عہد میں دانشوری نے تازہ فلسفے دنیا کے سامنے پیش کیے۔ علم وادب زندگی کی طرح آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہ جمود اور سکون کے خلاف انسانی ذہن کو تیار کرتے رہتے ہیں۔ یہ منزل کی تلاش میں راستے بدلنے کے ساتھ اپنے رہنما کو بھی تبدیل کردینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

قاضی صاحب کا نالہ بھی پابند نے نہیں، ان کی لے اپنی لو اور اپنی رو سے علاقہ رکھتی ہے۔ ان کی شاعرانہ طبیعت اپنے مے رنگ آہنگ سے تسکین پاتی ہے۔ ان کے اندر کے فنکار کا ذہن اپنے منشور کا حامی ہے اور اسی کا قائل بھی۔ وہ شعراء کی موشگافی اور ناقدین کی نکتہ سنجی کے چکر میں نہیں پڑتے۔ ان کا ذوق شعری انھیں جس راہ پر لے جاتا ہے وہ اسی راہ پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں وہ کسی اور کی ذہنی غلامی اور لکیر کو اپنے علم ووجدان کی موت سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ رد وقبول اور ترک واخذ اور انتخاب واختیار میں ان کی بصیرت کام نہیں کرتی۔ وہ اپنے شعور سے کام لیتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ وہ اصناف کی تقسیم کے اعتبار سے اپنے آہنگ، اپنے الفاظ، اپنے خیالات اور اپنے اسلوب کی

زمرہ بندی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں اثر آفرینی، ادبیت، حسن و ادائے فن کے لیے بہت سی چیزیں نظر انداز ہو سکتی ہیں اور ہو بھی جاتی ہیں۔ وہ کرتب بازی اور شاعری میں صنعت گری کے نمائندہ بن کر سامنے نہیں آتے۔ وہ ایک فطری شاعر ہیں اور فطری شاعر ہی بنے رہنا انھیں پسند بھی ہے۔ اسی لیے وہ ادب وفن کے گل گونہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے تصورِ فن میں ان کے نظریۂ سخن میں فطری حسن سب سے بڑا معیار ہے۔ وہ اسی حسن بینی کی تمنا میں سوتے اور جاگتے ہیں۔

قاضی صاحب کے آہنگ پر غور کرتے وقت اس بات کو خاص طور سے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ فنِ شاعری کا امتحان دینے اور اپنی شاعری کے ذریعہ دوسروں کے ذوق وفن کا امتحان لینے سے عملاً گریز کرتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے کلام میں عوامی اور سماجی قدروں کی نمائندگی بہت نمایاں صورت میں ملتی ہے۔ ان کے کلام، ان کے آہنگ، ان کے صوتی نظام کی سماجیات کی تجزیہ کاری کی کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ تاکہ اس پر کھل کر بحث ہو سکے اور ان کے فکری وفنی پہلو عام لوگوں کے سامنے آسکیں۔

نظمیں مولانا کی شاعری کے موضوعات میں بہت تنوع اور رنگا رنگی تھی۔ ان کی شاعری کا محور زندگی کی جدلیت تھی۔ وہ زندگی کی سرگرمیوں سے فنی سروکار رکھتے تھے اور مواد و موضوع کی تلاش کے لیے انھیں انسانی معاشرہ میں راہ عمل سجھائی دیتی تھی۔ ان کی شاعری ایک آئینہ تھی اس آئینہ کے سامنے جو چیز آیا کرتی تھی، اس کی پرچھائیں اس میں منعکس ہو جایا کرتی تھی۔ مولانا کی شعر و شاعری کے بال و پر نکلنے کے دور میں ہندوستان کے سیاسی مطلع پر بہت سی قومی تحریکیں اپنی ہنگامہ آرائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ نمودار ہوئیں اور انسانی زندگی کو متاثر کرنے لگی تھیں۔ مولانا بھی اپنی نظم نگاری کو زندگی کی ان کروٹوں کی تصویر کشی کے لیے ساز گار ماحول فراہم کرنے لگے اور شاعری کے موضوعات میں قومی و سیاسی پہلو کا اضافہ کر کے اپنی فکری وفنی بیداری کا ثبوت دینے لگے۔ مولانا کی طالب علمی کے وقت تحریکِ خلافت، مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاسی سرگرمیاں، آریہ سماجیوں کی مذہبی تحریکیں، شدھی کرن کی مہم، مدحِ صحابہ اور قدحِ صحابہ کی آویزش، آئے دن کے جلسے اور جلوس کی تیاریاں، مسجد و مدرسہ کے چندہ کی ٹولیاں، بدیسی مال کے بائیکاٹ کی تحریک، ستیہ گرہ، مطالبۂ آزادی، مطالبۂ پاکستان، غرض کہ بیسوں چھوٹی بڑی تحریکیں عروج پر تھیں۔ کتنی ذیلی سرگرمیوں نے رنگ پکڑا اور پھر وہ قصۂ پارینہ بن کر تاریخ کے ملبے میں دفن ہو گئیں۔ مولانا کے موضوعات ان انقلاباتِ زمانہ اور تحریکات ملکی میں بکھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی افتادِ مزاج اور مناسبت رجحان کے مطابق سیاسی وقومی نظمیں کہیں۔ ان نظموں میں شاعر مزدور احسانؔ دانش

کے رنگ و آہنگ اور ان کے طرزِ فغاں کو اپنے لیے نمونہ بنایا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے نظموں میں احسان دانش کا تتبع کیا، اسی کے ساتھ سیاسی نظمیں بھی کہتا تھا۔[1]

قاضی صاحب کی سیاسی نظموں میں ایک نظم ''جمعیۃ العلمائے ہند'' بھی ہے جو بارہ اشعار پر مشتمل بصورتِ غزل ہے۔ ۲۰/نومبر ۱۹۴۷ء میں کہی گئی اس نظم میں مولانا حسین احمد مدنی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو ذوقِ عمل پر اُبھارا گیا ہے۔ ان اشعار کے خون گرمانے والے اور جوش دلانے والے تیور ملاحظہ ہوں:

چلو اٹھو، بڑھو، حملہ کرو، باطل سے ٹکراؤ
اُگیں کشتِ وفا میں غازیانِ دیں کی للکاریں
جب آجاتی ہے دستِ حق پرستی میں یداللّٰہی
لرز جاتی ہیں قصرِ کفر کی مضبوط دیواریں
خیالِ دوریِ منزل سے رک جاتی ہیں جب راہیں
کہ میرِ کارواں کی دم بخود ہوتی ہیں گفتاریں

اس کے بعد مولانا حسین احمد مدنی کی قیادت پر اعتماد کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

حسین احمد امیرِ کارواں ہیں اہلِ ہمت کے
جو دشواری سے گھبرائیں نہ کچھ دوری سے جی ہاریں
ہزاروں مرحلے باقی ہیں مردانِ محمد کے
پسِ دیوارِ مستقبل ہیں جانے کتنی یلغاریں
ہے اطہرؔ روحِ مذہب اصل میں جمعیۃ علماء
ہیں جس کے دم سے قائم ہند میں ملت کی دیواریں

مولانا قاضی اطہر نے یہ نظم ۲۰/نومبر ۱۹۴۷ء کو کہی ہے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ قاضی صاحب اپنی تعلیم کے زمانے میں ہی جمعیۃ العلماء سے متاثر ہو چکے تھے۔ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور تحریکِ آزادی کی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ پورے ضلع کا مرکز ان دنوں میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین تھا۔ مولانا مسعود ندوی کی ذات ان تمام سرگرمیوں کا قطب نما اور محور تھی۔ مولانا شکر اللہ مبارک پوری قاضی صاحب

[1] کاروانِ حیات۔ مشمولہ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۴۸)

کے مربی واستاد تھے ہی، جن کی دھڑکنوں میں آزادیِ ہند کے تمام ہنگامے اور شور شرابے شامل ہو چکے تھے۔ مولانا سید محمد میاں تحریک آزادی کے قائدین اور جمعیۃ العلماء کے اہم اراکین میں شامل تھے جو احیاء العلوم کے طلباء و اساتذہ کو بھی متاثر کیے ہوئے تھے بعد میں قاضی صاحب کے مدرسہ شاہی مرادآباد میں عربی کے استاد بھی ہوئے۔ مرادآباد سے ایک ماہ نامہ قائد نکالتے تھے۔ مرادآباد جانے سے پہلے قاضی صاحب کے مضامین و اشعار اس میں شائع ہونے لگے تھے۔ اس تعلق کا اثر قاضی صاحب پر ہونا لازمی تھا۔ وہ مولانا سید محمد میاں صاحب کی اور حیثیتوں کے علاوہ ان کی آزادیِ وطن کی سرگرمیوں سے بھی متاثر ہوئے۔ ان تمام حقیقتوں کے اعتبار سے قاضی صاحب کی شاعری میں اپنے دور کی عکاسی ہونے لگی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی، وطنی مسائل اور سیاسی حالات کو پوری احساس ذمہ داری سے موضوع قرار دے کر شاعرانہ لہجے میں اظہارِ خیال فرمایا۔

انھوں نے اپنی نظم ''اشارات'' میں غزلوں کا لہجہ اختیار کیا ہے مگر اس میں سیاسی شعور کی جھلکیاں شامل ہو گئی ہیں یہ نظم ایک قومی مرثیہ کی حیثیت سے مطالعہ کی چیز بن گئی ہے۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

زمانہ کے تغیر سے ہوئی یوں عام بربادی
کہ ویرانہ ہے ویرانہ، نہ آبادی ہے آبادی

اس کے بعد کے اشعار میں آپ بیتی کی شکل میں جگ بیتی کا رنگ ملتا ہے اور اس دور میں مسلمانوں کی تباہی کا جو نقشہ تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شعر کی زبان میں داستانِ درد بیان ہوئی ہے:

نظر اٹھتی ہے جس جانب، ہے بربادی ہی بربادی
سلیقے کی اسیری ہے، قرینے کی نہ صیادی
نہ پوچھو ہم دمو! ہم بے کسوں کی وجہ بربادی
کہ آکر اس جگہ خاموش ہو جاتے ہیں فریادی

اس کے بعد ایک شعر میں ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں والا نظریہ پیش کر کے اپنے دردِ دل کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

بسا اوقات عرفانِ قفس کی سرد آہوں سے
وبالِ جان بن جاتی ہے صیادوں کی صیادی

نظم مارچ ۱۹۴۸ء میں موزوں ہوئی ہے، جو ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ فسادات کی تباہی کا زمانہ ہے۔ مسلمان ہندوستان کی آزادی میں ہر موڑ پر برادران وطن کو ساتھ لے کر قائدانہ انداز میں چلے مگر حصول آزادی کے کچھ پہلے اور حصول آزادی کے بعد برہمنیت نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مسلمان دفاعی محاذ کے ساتھ حاشیے پر آ گئے۔ اگر اپنی تباہی پر کچھ کہتے بھی تھے تو وہ فرقہ پرست ذہنیت کو شاق گزرتا تھا اور اُلٹے وہ مسلمانوں ہی کو مورد الزام ٹھہرانے لگتے تھے کیوں کہ اس دور میں کانگریس کی زمام اقتدار جن ہاتھوں میں تھی مسلمانوں کے سلسلے میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا اور وہ مسلمانوں کو ہر خرابی کا ذمہ دار مانتے تھے۔ وہ ہندوتو اور ہندو تہذیب کے اثر و نفوذ کے قائل تھے اور اس کو حق سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی تمام قومیں، تمام تہذیبیں ہندو دیو مالائی رنگ میں رنگ جائیں اور پھر کوئی تفریق من و تو باقی نہ رہے۔ انھیں ہندوستان کی برسوں سے چلی آ رہی گنگا جمنی تہذیب اور تاریخ کی رنگا رنگ ثقافت کی قدریں عزیز نہیں تھیں۔ وہ اس تکثیری سماج کو ایک لمحے کے لیے برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اسی میں ان کو خوشحالی اور ہندوستان کی ترقی کا زینہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ تھا وہ تباہی اور فلاکت و ہلاکت کا سبب تھا۔ قاضی صاحب اس نظم کے آخر میں اسی تاثر کے تحت مقطع کہہ کے اپنی کہانی ختم کر دیتے ہیں:

شکایت ہائے رنگیں کہہ تو دوں لیکن ہے ڈر اطہر
کہ ہو جائے نہ ان کی طبع نازک پر گراں باری

ساقی نامے عموماً اپنے دور کے عکس اور پرچھائیں کو اپنے کیمرے میں بند کرتے ہیں۔ ان سے حالات و زمانہ کے رخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ نئی کروٹوں کا احساس بھی اس میں ملتا ہے۔ قاضی صاحب نے بھی "ساقی نامہ" کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظم "ساقی نامہ" ان کی سیاسی بصیرت کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ مگر اس کا انداز، اسلوب، آہنگ سراسر غزلیہ ہے۔ ان پر غزل حاوی ہے۔ ان کا انداز سخن نظم نگاری کے میدان میں بھی اس کے اثرات سے اپنے کو آزاد نہیں کر پاتا۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

اسی اک بات میں گر زندگی مستور ہے ساقی — تو پھر یہ جام زہر آلود بھی منظور ہے ساقی
تری محفل میں آتے ہی نگاہیں غرقِ ظلمت ہیں — یہاں کا ذرہ ذرہ تو چراغ طور ہے ساقی
اسی پر ہے نظر جو بے نیاز نشہ دے ہے — تری بزم کہن کا کیا یہی دستور ہے ساقی

مری محرومیِ قسمت اگر منظور ہے تجھ کو
تو اطہر اپنی محرومی پہ بھی مسرور ہے ساقی

ان کی شاعری کی طرح ان کی سیاسی و قومی نظموں کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ یہ جگہ جگہ اہلِ ایمان کی عالمانہ شان، علمِ دین سے واقفیت، اسلامی جذبات و رجحانات اور دینی و ملی حیثیت کا برملا اظہار کرتی ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب فرد اور معاشرہ کی ذہنی و فکری اور نفسی و حسی تربیت کرتا ہے۔ ایک با مقصد اور اہداف سے پُر زندگی گزارنے کا سلیقہ و تصور بخشتا ہے۔ دنیا و آخرت کے لیے ایک باقاعدہ اور مرغوب لائحۂ عمل پیش کرتا ہے۔

نپولین بھی مذہب کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"مذہب انسان اور اس کے سماج کے لیے سمندری جہاز کے قطب نما کی مانند ہے۔ اگر مذہب کا وجود نہ ہوگا تو انسان اس سمندری گرداب میں غوطے کھاتا رہے گا اور کبھی نجات کے ساحل پر نہیں پہنچ پائے گا"[1]

تہذیبیں مذہب کی بدولت ہی وجود پذیر ہوتی ہیں۔ زبان، علم، ادب، فرقے اور نسلی تفریق و امتیاز مذاہب کی بدولت ہی حاصل ہوتا ہے اور اس ترقی یافتہ دور میں بھی جب کہ مذہب بیزاری کی وبا عام ہو چکی ہے، اس سے مفر نہیں ہے۔ بہت سے سائنس داں حکیم اور فلسفی جب زندگی کی تمام مصروفیات اور شعبے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو انھیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ پلٹ کر مذہب ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ آج مغرب کا انتشار ذہنی، اس کی نفسیاتی بیماریاں مذہب میں اپنا درماں تلاش کر رہی ہیں۔ قاضی صاحب اگر مذہب کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں تو یہ ان کی بلند خیالی اور خوش فکری کی دلیل ہے۔ قاضی صاحب کی ایک نظم ''غازی'' کے عنوان سے ان کی بیاض میں ملتی ہے۔ اس نظم کا موضوع بھی مسلمانوں کی عصری زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ اس نظم کا باطنی شعور خانقاہ و تصوف سے شکوہ سنج ہے اور وہ ایسے غازیوں سے ذہنی مناسبت رکھتا ہے، جو زندگی میں ہر دم جواں پیہم رواں کا تصور دیتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

گھس جاتا ہے جب دیکھ کے ہنگامۂ باطل
روباہ صفت خانقہِ غم میں سپاہی
سجادۂ ناپاک پہ جب بے اثری سے
دم توڑتی ہے یاس میں ہر آہِ پگاہی

---

[1] بحوالہ ہندوستانی مذہب۔ ڈاکٹر رضی احمد کمال

تسکین ہو جب گوشہ نشینانِ حرم کو

ہتھیائیں گدا دہر کے اسلام کی شاہی

اس وقت بپھرتا ہے کوئی غازیِ میداں

باہمت و باہیبت و با ژرف نگاہی

اس نظم کا مرکزی خیال انسان کو جد و جہد کرنے اور زندگی کے رخ کو موڑنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کو ہموار کرنے اور زمین کو کاشت کے قابل بنانے کے لیے کچھ شکست و ریخت، کچھ کھودنے پاٹنے کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ نئی تعمیر کے لیے کھنڈرات کا انہدام بھی عمل میں لایا جاتا ہے۔ غازی کے فرائض میں ہے کہ وہ راستے کی تمام رکاوٹوں، فصیلوں اور گھیرابندیوں کو دور کرے یا توڑ کر فتح و کامرانی کی منزل کو قریب تر کرنے کی جد و جہد کرے اور اگر ایسا نہیں کرتا اور تمام سدِ راہ بنی ہوئی مشکلات کو بحالیِ امن کا نام دے کر باقی رکھنے کے حق میں نظر آتا ہے تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ غلط بنیادوں پر زندگی سے معاہدہ کرکے اپنی ذہنی و جسمانی مشقتوں سے جی چرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ قاضی صاحب اسی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں:

وہ امن بھی یلغار سے بچتا نہیں اطہرؔ

جس امن کا ہر رخ ہو تباہی ہی تباہی

قاضی صاحب نے اپنی ایک دوسری نظم میں اپنے نظریۂ حیات کو اور کھل کر بیان کیا ہے۔ اُن کا شعر ہے:

ہوں امن و صلح کا داعی مسلماں نام ہے میرا

مگر باطل کی گردن کاٹ لینا کام ہے میرا (نوجوانِ مسلم)

اسلام دشمن تحریکوں کی زبان میں یہ اسلامی دہشت گردی نہیں ہے۔ یہ تصور اور یہ خیال زندگی کی ترقی کا پہیہ ہے۔ حالات کے جبر اور مزاجی کیفیت کے آثار کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا ہی ترقی کے شارعِ عام پر زندگی کو لاکر کھڑا کر دینا ہے۔ اسی سے قومیں سرخ رو ہوتی ہیں۔ تہذیبیں پھلتی، پھولتی اور پھیلتی ہیں۔

قاضی صاحب کی یہ نظم ''غازی'' ۲۲ر نومبر ۱۹۴۷ء کو ان کی نظم ''جمعیۃ العلمائے ہند'' کے موزوں ہونے کے دو روز بعد معرضِ تحریر میں آئی ہے۔ جب ان دونوں نظموں کے باطنی ارتعاشات پر گہرائی کی نظر ڈال کر جائزہ لیا جاتا ہے تو ان دونوں میں بڑی مماثلت، یکسانیت اور مشابہت کا احساس ہوتا ہے۔ ان دونوں نظموں میں وحدتِ فکری موجود ہے۔ مسلمانوں کو قدرت نے کارِ امروز اور

صورت گری فردا کا جو منصب خلافت بخشا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان خاص طور پر مسلمان حالات سے مجبور ہو کر نچلا نہ بیٹھے۔ اس کا کار جہاں بانی اور انداز جہاں بینی کسی وقت اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہ رہے۔ حالات کو اپنے قابو میں کرنے اور کائنات کو اپنی مرضی کے مطابق چلنے کے لیے ایک مرتب لائحہ عمل تیار کرنے میں لگے رہنا چاہیے۔ ان دونوں نظموں میں جمعیۃ العلماء ہند کی اہمیت اور اس کے اصول و مقاصد کی حمایت کا انداز ہے تو نظم کے درمیانی اشعار میں مولانا حسین احمد مدنی کے نہج و انداز عمل کو سراہا گیا ہے۔ ''غازی'' میں اسی تصور کو توسیع دے کر بعض نکات نظر پیش کیے گئے ہیں اور ہندوستان کے اس وقت کے تناظر میں ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے کیا کیا چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اس کا اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس وقت کے حالات مسلمانوں کی ذہنی، فکری، معاشی، اقتصادی، سیاسی، تمدنی اور اخلاقی قوت توڑنے کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ان کے مذہبی تشخص اور تمدنی شناخت کو مٹانے کی منظم سازش نظر آرہی تھی۔ بڑے سے بڑے محب وطن اور ملک دوست کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ وطن عزیز کی خوش حالی اور اس کی تعمیر کے لیے جن بزرگوں نے اپنا خون جگر دیا ان کی قربانیوں کی وقعت کو گھٹانے اور دبانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اُن عناصر کو چھوٹ مل گئی تھی جو وطن کے سینے کو زخمی کرنے اور من و تو کی تفریق پیدا کر کے دلوں میں مینڈ بنانا خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ قومی یکجہتی کی سمت میں کام کرنے والے اور فرقہ وارانہ رجحانات کو کمزور کرنے والے اس وقت کمزور پڑ گئے تھے۔

قاضی صاحب نے اپنی شاعری کے حوالے سے جہاں قومی نظموں کا لفظ استعمال کیا ہے، وہاں اس لفظ سے مراد ملی اور اسلامی خیالات کی ترجمانی کرنے والی نظمیں ہیں۔ وہ قومی کو ملی کے معنی میں لیتے ہیں۔ اس لیے جب ہم اس پس منظر میں ان کی نظموں کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے اندر ایک مومنِ کامل کا دل دھڑک رہا ہے۔ ان کی فکر میں ایک اضطراب ہے، ان کے ذہن میں ایک نامعلوم سا کرب انھیں ہر دم جولاں اور اُفتاں و خیزاں رکھتا ہے۔ وہ جب نثر کی طرف آتے ہیں تو مسلمانوں کی تاریخ پیش کر کے ان کا مقدر سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب نظم نگاری کو ذریعۂ اظہار بناتے ہیں تو زبان کی جمالیاتی اور اثباتی قدروں کی آمیزش سے ان کی سیاسی و تمدنی زندگی کو خروش آشنا کر کے دل میں طوفان پیدا کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی نظم و نثر دونوں کا مقصد شخصیت سازی اور تاریخ گری ہے۔ اسی جذبے نے ان سے نالۂ اطہر، ترانۂ مجاہد، وقت کی پکار، نوجوان مسلمان، بانگِ جرس، حیاتِ ابدی، ہمارا ماضی، ترانۂ جہاد، عزمِ مومن، عزمِ تعمیر، امیری اور مفلسی، جوش و خروش، تم اور ہم جیسی نظمیں کہلائی

ان نظموں میں دنیا کو کھلی آنکھ سے دیکھنے والے انسان اور زندگی کی رفتار کا عرفان رکھنے والے مفکر کی
[illegible] ملتی ہے۔ ان نظموں کو پڑھنے کے بعد مولانا انور صابری دیوبندی کے ان جملوں کی صداقت کو تسلیم
کرنا پڑتا ہے جو انھوں نے ''اذانِ کعبہ'' کی نظموں کو دیکھنے کے بعد اپنے تاثرات کے بیان کے لیے
[illegible] کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کی صورت مولوی کی ہے، نگاہ عاشق کی، دل درویش کا اور دماغ فلسفی کا ہے۔ ان
عناصرِ حیات کا نام ہے: ''اطہر قاضی''۔

قاضی صاحب اپنی نظموں میں تاریخِ اسلامی سے بڑی مدد لیتے ہیں۔ وہ اس بحر کے غواص
ہیں۔ اس لیے اس دریا کی تہ میں اتر کر بڑے آبدار موتی نکال لاتے ہیں۔ ان کی نظمیں ان کی قدرتِ کلام
[illegible] ہیں۔ وہ لفظوں کے انتخاب میں بھی حسنِ سلیقہ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ غزلوں کی طرح نظموں
میں بھی سادہ و شیریں اور سہل و عام فہم زبان کا استعمال ملتا ہے۔ البتہ ان کی عالمانہ شانِ تکمیل ان کی نظموں
میں بھی اپنا احساس کراتی ہے۔ وہ اپنی قوم کی پستی پر خون کے آنسو روتے ہیں اور انھیں اسلاف کے
منہاج و اہداف کی طرف لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ قصۂ پارینہ نہیں داستانِ حیات سناتے ہیں اور
زندگی کی ان قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں، جن سے کائنات کی تصویر میں رنگ پیدا ہو اور اس کے حسن
میں اضافہ ہو۔ وہ اپنی نظم ''تقاضا'' کا اختتام اپنے اس فارسی شعر پر کرتے ہیں، جس میں ساری غفلت اور
نادانی سے نجات پانے کا درس چھپا ہوا ہے:

جہانِ نو پئے افرادِ کہنہ، درد شد اطہر
بیاباں بہرِ استقبالِ لیلیٰ گرد شد اطہر

قاضی صاحب کہتے ہیں کہ پورا کا پورا بیاباں لیلیٰ کے خیر مقدم کے لیے گرد گرد ہو چکا ہے۔
عہدِ نو کی نئی دنیا پرانے لوگوں کی تلاش و جستجو میں سراپا درد بن چکی ہے۔ اس کو اسلاف کی ضرورت ہے۔ یہ
دنیا عصر کے زخموں سے چور چور ہو چکی ہے اور راستے کے بیچ میں گر کر کراہ رہی ہے۔ وہ اپنے ایک
دوسرے مقطع میں اپنی شاعری کے حوالے سے پردہ اٹھاتے ہیں:

پرانے قہقہوں سے مردنی چھائی ہے اے اطہر
مجھے آہوں سے کرنا ہے نیا ہندوستاں پیدا (عزمِ تعمیر)

اور اپنی رجائیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

گلوں سے مستی چھلک اٹھے گی، ہوائے گلشن مہک اٹھے گی
خموش بلبل چہک اٹھے گی، بہار کا فیضِ عام ہوگا
شراب کہنہ کی تلخ مستی سے بند ہے نبض سے پرستی
نئی شرابیں، نئے شرابی، نیا نیا دور جام ہوگا
بہار کے خوش گوار پربت پہ جھوم اٹھے گا ابر باراں
برس پڑے گی نگاہ ساقی، نہیں کوئی تشنہ کام ہوگا
(بہار)

ان کی ایک نظم ''امیری اور مفلسی'' ہے۔ اس نظم میں مولانا کی قوتِ مشاہدہ زندگی کی موجِ تہ نشیں کو دیکھ رہی ہے۔ مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ اپنے رب کے حضور دعا گو ہیں کہ:

یا خدا افلاس کو توجہِ بربادی نہ کر
یہ تری نعمت ہے اس کو وقف ناشادی نہ کر

ان کی ایک نظم صبحِ آزادی ہے، جس میں آزادی کی صبح کا تذکرہ اور جشن جیسی کیفیت کا بیان ملتا ہے اس نظم میں انھوں نے وطن کے لیے قربانیاں پیش کرنے والوں کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور یہ کہا ہے:

لیے عزمِ جواں مردی، لٹا کے اپنا تن من دھن
ہمارے جاں نثاروں نے سجائی صبحِ آزادی
کیا آباد زنداں کو، کبھی دارورسن چوما
لگائی جان کی بازی تو آئی صبحِ آزادی
نشاں باقی ہیں اب تک گولیوں کے سینوں پر اطہر
بہا کر خون اپنا ہم نے پائی صبحِ آزادی

مگر مولانا کو یہ سب قربانیاں وطن کے لیے پیش کرنے کے باوجود اپنے ہم وطن بھائیوں سے شکوہ ہے کہ وہ انھیں آزادی کی نعمتوں سے محروم کیے ہوئے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی دورِ غلامی گیا نہیں ہے۔ ابھی آزادی کی منزل بہت دور ہے۔ نظم ''اعلانِ آزادی'' میں طنز بھی موجود ہے۔ مولانا اس نظم کے آخر میں فرماتے ہیں:

مزاج جب ہے مرتب ہو کے اس ماحول میں آئے
مرے دیوان کا عنوان ہو عنوانِ آزادی

ایک نظم اس مجموعہ میں ''جنگی جہاز'' کے عنوان سے ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ جنگ عظیم کے وقت کہی گئی نظم لگتی ہے۔ اس میں انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کی تباہی اور تہذیبی قدروں کی پامالی، اخلاق سوزی اور برہنہ رقص ابلیسی پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ یہ نظم اس حقیقت کی غماز ہے کہ جب انسان اپنی تہذیب کی جڑ سے پیوستہ نہیں رہتا اور مذہبی و اخلاقی قدروں کو پامال کر دیتا ہے تو وہ ہزاروں سالہ تمدن اور قوت تسخیر کے باوجود دلوں پر راج نہیں کر پاتا۔ وہ درندہ بن جاتا ہے اور اپنے مفادات کی قربان گاہ پر قد آوروں کی صلاحیتوں کو بھی ذبح کر کے تمدن کا چلتا پھرتا مزار بن جاتا ہے۔ اُس کے کاندھے پر انسانی ترقیات کی متاع گراں بہا کا بوجھ نہیں بلکہ تاریخ کا جنازہ ہوتا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے تہذیب جدید کی برہنگی و درندگی پر تبصرہ کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

پیکرِ ناز و ادا پہ کیا مصیبت آ گئی
اُف برہنہ تن، نئی تہذیب کی آوارگی
جل گیا بھک سے رُخِ تہذیب کا رنگیں نقاب
کس قدر مکروہ و بدصورت ہے یورپ کا شباب

قاضی صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہمت شکن حالات میں بھی امید و بیم کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ یاسیت میں بھی قنوطیت کے عنصر کو تلاش لیتے ہیں۔ یہاں بھی ان کا رجائیت میں رچا ہوا لہجہ ملاحظہ ہو:

وقت کہتا ہے یہ قومیں اب فنا ہو جائیں گی
قعرِ ذلت میں ابد تک کے لیے سو جائیں گی
وقت کی لائی قضا اِک لحہ ٹل سکتی نہیں
وقت کے آگے کوئی تدبیر چل سکتی نہیں

قاضی صاحب کی اب تک کی ان نظموں کا ذکر ہوا ہے جو موضوعاتی اور ہنگامی شاعری کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کی نظموں میں زندگی کی جمالیاتی اقدار اور رومانی تصورات بھی ہیں اور حسنِ فطرت کی عکاسی بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔ ان کا فن کارانہ شعور ''کوکن کی ایک چاندنی رات'' جیسی نظم میں ظاہر ہوا ہے۔ اس نظم میں ان کے اندر کا شاعر اپنی شخصیت کی تلاش کا منتظر ہے اور اس نظم کا استعاراتی و تشبیہاتی نظام قابل توجہ ہے۔ اس کے متفرق اشعار یہ ہیں:

جاڑے کا زمانہ تھا، نومبر کا مہینہ
سیّال فضاؤں میں تھا، خنکی کا سفینہ
تنویر کے دربار میں تھی رات کی رانی
تھی چاند پہ چھائی ہوئی بھر پور جوانی
رگ رگ میں سمانے لگی الفت کی کہانی
ڈھلنے لگے الفاظ کے کالم میں معانی
اس حال میں دل عہد جواں ڈھونڈ رہا تھا
کھوئی ہوئی الفت کا نشاں ڈھونڈ رہا تھا

قاضی صاحب کی اس طرح کی اور بھی نظمیں تھیں، جن میں حسنِ فطرت اور مناظرِ قدرت کے جلوے سمیٹے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے آنچل میں کائنات کے گل بوٹوں سے الفاظ وتخیل کی گلکاریوں کے نقوش اُبھارے تھے۔ ان کی نظمیں تشبیہ واستعارہ، تخیل وتفکر اور مرتعش جذبات کی قوس وقزح کو بھی منعکس کیے ہوئے تھیں۔ لیکن اس وقت ان میں سے کوئی نظم محفوظ نہیں رہی اور سب کی سب دست بردِ زمانہ کی شکار ہوگئیں۔

شخصی مرثیے | مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے منجملہ اور اصناف کے مرثیہ بھی کہا ہے۔ یہ مرثیہ واقعات کربلا سے متعلق نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی وفات سے متاثر ہو کر مرثیے کہے ہیں۔ اس قسم کے شخصی مرثیے کی روایت اُردو شاعری میں قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ جب اُردو شعروادب کا کوئی طالب علم اُردو شاعری کے پھیلے ہوئے سرمائے پر نظر ڈالتا ہے تو اس صنفِ سخن میں بھی بڑی وسعتوں کا احساس ہوتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اُردو زبان کے سرمایۂ سخن میں مرثیہ گوئی کی روایت صرف واقعاتِ کربلا، ائمہ واولیاءِ دین کی وفات وشہادت پر ہی آنسو بہانے اور رونے رُلانے تک محدود نہیں ہے بلکہ مرثیہ کی روایت میں وہ حصہ بھی بڑا جاندار اور فنی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ جو شخصی اور ذاتی غم یا نوحۂ ماتم سے تعلق رکھتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے اپنے بھتیجے زین العابدین خان عارفؔ کی وفات پر جو مرثیہ غزل کے رنگ وآہنگ کو باقی رکھتے ہوئے کہا ہے، اس کی ادبی حیثیت اور فنی وقعت شاعری کی نئی وسعتوں کا پتہ دے رہی ہے۔ اسی طرح غالبؔ کا وہ مرثیہ بھی مشہور ہے جو غزل ہی کی شکل میں انھوں نے اپنی کسی محبوبہ کی وفات پر کہا تھا، جس میں ٹوٹ ٹوٹ کر اثر بھرا ہوا ہے۔ مومنؔ کا

بھی ایک مرثیہ بہت مقبول ہوا جو انھوں نے ترکیب بند کی شکل میں اپنے محبوب کی وفات پر لکھا تھا۔ حالی نے غالب کی وفات پر اپنے دردِ دلی کو آنسو بنا کر نوکِ قلم سے ٹپکایا ہے اور زمینِ شعر کو نم کیا ہے۔ اس مرثیۂ حالی کا یہ شعر آج بھی جذبات کی ترجمانی کے لیے بار بار کام دیتا ہے:

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اِک چراغ تھا نہ رہا

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے بھائی اسحٰق کا نوحۂ غم لکھا اور ایسا لکھا کہ اُردو مرثیہ نگاری کی نئی جہتوں اور نئی سمتوں کے لیے قطب نما ٹھہرا۔ چکبست نے گوکھلے کا مرثیہ فنی لوازمات کے ساتھ کہا۔ ان کے دوسرے مرثیے جو رہنمایانِ قوم کے سانحۂ ارتحال پر کہے گئے ہیں، مرثیوں میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ علامہ اقبال نے اس سرمائے کو متعدد مرثیے کہہ کر وسعت بخشی۔ اس صنفِ سخن میں بھی نفسیاتی اندازِ نظر اور فلسفیانہ خیالات پیدا کر کے انھوں نے اُردو شعر و زبان کو کئی جہانِ معنی کی نمود سے آشنا کیا۔ ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں'' اور داغ پر جو اُن کا مرثیہ ہے اس میں تنقیدی بصیرتوں اور زندگی کے فلسفے کا غم انگیز انداز خاصے کی چیز بن گیا ہے۔ ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں'' جس خلوص و عقیدت کے ساتھ غم کی آنچ کو ایک ایک شعر میں سمونے اور سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا اب تک کوئی دوسرا نمونہ سامنے نہیں آیا۔ ان کا یہ شعر جو بچے بچے کی زبان پر جاری ہے۔ آج بھی اہم شخصیتوں کی دائمی جدائی پر جذبات کی ترجمانی کے کام آتا ہے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

داغ کا جو مرثیہ انھوں نے لکھا ہے اس میں اقبال کے ناقدانہ شعور کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار فکری و فنی ابعاد کو روشن کرتے ہیں اور اُردو شاعری میں داغ کے اضافات کی خبر دیتے ہیں:

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے، صاحبِ اعجاز بھی
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی ردائے خاکِ دلّی! داغ کو روتا ہوں میں

صفی لکھنوی نے بھی شخصی مرثیے کے ذریعے اپنی زبان دانی اور بیان کی سادگی میں بڑا نام کیا اور رثائی ادب کو گراں مایہ بنایا۔ انھوں نے اوصاف نگاری پر نظر رکھی ہے۔ تلوک چند محرومؔ کی شاعری تو قومی و وطنی موضوعات سے خصوصی علاقہ رکھتی ہے۔ ان کی فکر نے شخصی مرثیہ نگاری کی روایت کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ احسانؔ دانش نے بھی اپنی والدہ کا مرثیہ ''گورستان'' لکھ کر اُردو کے رثائی ذخیرے میں بہتر اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری کا المیہ لہجہ اس مرثیہ کی فضا کو بہت پُرتاثیر بنا رہا ہے۔ اسی طرح ''دیارِ شبلی'' اور ''دبستانِ شبلی'' کے صفِ اوّل کے قومی و وطنی شاعر اقبال سہیلؔ نے فارسی مرثیہ نگاری کی روایتوں کو نیا رخ دینے کے ساتھ اُردو کی شخصی مرثیہ گوئی میں بھی قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کے مرثیے ''مرگِ حیات آفریں'' اور ''گاندھی جی'' بڑی خصوصیت رکھتے ہیں، جو اخلاقی اور حکیمانہ و فلسفیانہ اعتبار سے رثائی ادب و شاعری میں اہم درجے پر رکھنے کے لائق ہیں۔ اسی شبلی اسکول کے نمائندہ شاعر یحییٰ اعظمی نے بھی رثائی شاعری کو سرسبز بنانے میں اپنی قادرالکلامی اور خوش بیانی کے حوالے سے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

مولانا قاضی اطہر کے دستیاب مرثیوں کی تعداد صرف چار ہے۔ جس میں ایک عربی مرثیہ بھی ہے جو علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات پر کہا گیا ہے۔ ان کا ایک مرثیہ مولانا شکر اللہ مبارک پوری صاحب سے متعلق ہے۔ گو کہ اس کا براہِ راست تعلق مولانا شکر اللہ کی وفات سے نہیں ہے، لیکن اس کے جو موضوعات، اس کی زیریں لہریں اور اندرونی آہنگ ہیں ان کا تعلق، ان کی ادھوری چھوڑی ہوئی قوم سازی اور دینی ماحول بنانے کی مہم کا وہ حصہ ہے جس نے مبارک پور کی دینی سمت و رفتار کو نت نئی کروٹوں کا احساس دلایا ہے۔ مولانا کی وفات سے جو کام ادھورے رہ گئے تھے خصوصاً جامع مسجد کی تعمیر و تزئین کا جو منصوبہ تشنۂ تکمیل رہ گیا تھا اس کو آگے بڑھانے اور ان کی یادگاروں کو باقی رکھنے کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کے بین السطور میں مولانا کا نوحۂ غم اور ان کے کارناموں کی یاد کو بھی روشن کرنے کی شاعرانہ انداز میں کوشش کی گئی ہے۔

مولانا شکر اللہ اپنے علمی کارناموں اور دینی خدمات کا جو سلسلۃ الذہب رکھتے تھے اس نے مبارک پور کی زندگی اور معاشرت کو زبردست طریقے سے متاثر کیا تھا۔ ان کی عبقریت کے پھر بھی اتنے نقوش تھے جن تک بہتوں کی نظر نہیں گئی تھی۔ قاضی صاحب کو ان کی اہمیت و اہلیت اور انفرادی خصوصیت کا

احساس تھا اسی تاثر کے تحت انھوں نے اپنے مرثیہ میں یہ شعر کہا ہے:

گیا بھی کاروانِ گم شدہ کی رہبری کر کے
مگر اس مردِ خود آگاہ کو ہم نے نہ پہچانا

مولانا شکر اللہ میں جو جہاں بانی اور جہاں بینی کی صلاحیتیں مبدأ فیاض کی طرف سے ودیعت کی گئی تھیں ان اشعار میں انھیں کی طرف شعری زبان و بیان میں اشارہ کیا گیا ہے اور ان کی خدمات ملی پر اعترافی و تحسینی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

نئی راہیں کھلیں جن کی نگاہوں کے اشارے سے
ہوئیں وہ بند آنکھیں اور ہم کو دور ہے جانا
وہ اندازِ نظر، وہ طرزِ بینش، ہم کہاں پائیں؟
مگر ہر ایک ہم میں ہے اسی محفل کا پروانہ

ایک شعر میں اس مضمون کو شعر کی زبان دی گئی ہے کہ مولانا مرحوم کو جب جنت کی بہاروں میں مسجدِ جامع کے نامکمل رہ جانے کا خیال آتا ہوگا تو وہ سکون بخش لمحات اور جنت کی غم سے بے نیاز فضا میں بھی تڑپ جاتے ہوں گے اور ان کا یہ اضطرابِ قومی انھیں خوابِ راحت اور آسودگی رحمت سے چونکا کر جگا دیتا ہوگا۔ وہ جنت کی لذتِ کیف و سرور کو بھی بھول جاتے ہوں گے۔ اہتزازِ حسی اور نشاطِ روحانی کی کیفیتیں بھی ان کے درد کا درماں بننے کی اپنی صلاحیتیں کھو دیتی ہوں گی:

پھڑک جاتا ہے گلشن میں ابھی خلدِ آشیاں طائر
حریمِ قدس میں آتی ہے جب یادِ خدا خانہ

مولانا شکر اللہ کے بارے میں ان کو دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ انھیں جامع مسجد کی تعمیر سے اتنا والہانہ شغف اور اس تعمیرِ ملّی میں انھیں اتنا زیادہ انہماک تھا کہ وہ اپنی بیماری کو بھی بھولے ہوئے تھے۔ جب ان کے قویٰ اور صحت کے آثار انھیں تھوڑی سی بھی راحت دیتے تو وہ بیمار ہوتے ہوئے بھی مسجد میں لائے جاتے اور کرسی پر بیٹھا دیے جاتے۔ وہ مسجد کا کام دیکھ دیکھ کر لذت و خوشی محسوس کرتے تھے۔ اس تناظر میں قاضی صاحب کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

بنایا جامع مسجد کو جس نے مقصدِ ہستی
رہا فکرِ حسیں میں لذتِ دنیا سے بے گانہ

مرثیہ میں تحریضِ ملّی اور تشویقِ دینی پیدا کرنے اور اُبھارنے کی یہ کوشش بھی ملاحظہ ہو:

مسلمانو! یہ تکمیلِ بنائے جامعِ مسجد
انھیں کی آرزوئے زندگانی کا ہے بر لانا
ہمیں اور آپ کو، اللہ کا یہ کام کرنا ہے
نہ خود وہ ہیں، نہ ان کا جوش ہے، نہ ان کا فرمانا

قاضی صاحب کو اپنے استاذ و مربی سے جو فیضِ صحبت حاصل ہوا ہے اس کے اعتراف و قدر افزائی کا انداز بھی ملاحظہ ہو:

خیالِ حضرت استاذ دل سے جا نہیں سکتا
مجھے اطہر بہت کچھ دے گئے ہیں میرے مولانا

اس مجموعہ میں دوسرا مرثیہ ''تصویرِ درد'' کے عنوان سے نامکمل صورت میں والدۂ مرحومہ حمیدہ بنت مولانا احمد حسین رسول پوری کے سانحۂ ارتحال کے حوالے سے ہے۔ مولانا قاضی اطہر اپنی والدہ کے انتقال پر اپنے خوابوں کے شہر کو اجڑتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ ان کی زندگی میں آفات و آلام کی جو لہریں اور آندھیاں اٹھی تھیں۔ ان سب میں ان کی شخصیت اور ذہن کے لیے ان کی والدۂ گرامی کا سفرِ آخرت انتہائی شدید اور اذیت ناک تھا۔ والدہ کی وفات پر مولانا کا یہ تاثر قابلِ توجہ ہے:

> ''۱۳۵۲ھ میں جب کہ میں کافیہ وغیرہ پڑھ رہا تھا والدۂ مرحومہ کا انتقال ہو گیا۔ جس کے صدمہ سے میری اٹھتی جوانی خاک میں ملنے لگی۔ سالوں غم و اندوہ کی وادی میں بھٹکتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ والدۂ مرحومہ کی یاد میں اپنے کو بھول جاؤں گا''۔[1]

اس مرثیہ کی اندرونی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ انتقال کے کچھ ایام گزرنے کے بعد اس وقت کہا گیا ہے جب مولانا فاتحہ خوانی کے لیے قبر پر حاضری دینے گئے تھے اور اس وقت جو تاثرات ہوئے تھے اسی غم و اندوہ کے عالم میں یہ مرثیہ کہا گیا ہے جس میں جذبے کی شدت انتہائی عروج پر ہے۔ مرثیہ کی ابتداء میں تمہید کے انداز میں اس کا تخلیقی پس منظر اور شعری ماحول بیان کیا گیا ہے جس کے ابتدائی اشعار یوں ہیں:

درد تھا، رنج الم تھا، غم تھا اور اِک رات تھی
رات کیا تھی؟ بہرِ دل افسانۂ آفات تھی

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ طبع اوّل ۱۹۸۷ء دائرۂ ملیہ مبارک پور (ص: ۱۳)

پڑ رہا تھا ہر طرف پہرہ اندھیری رات کا
وادیِ ظلمات میں تھا کارواں ظلمات کا
روح میری یک بہ یک دنیا سے گھبرانے لگی
جانے کیوں ایسے میں یادِ والدہ آنے لگی

اس مرثیہ کی فضابندی کے اشعار پڑھتے ہوئے ان کے استاذِ سخن احسان دانش کی منظر کشی کا رنگ سامنے آجاتا ہے اور قاضی صاحب نے جو استفادہ احسان کی شاعری سے اپنے فن کی تشکیل اور مزاجِ شاعری کی تہذیب میں کیا ہے، اس کا واضح ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔ اس مرثیہ میں احسان دانش سے اثر پذیری کے علاوہ علامہ اقبال کے مشہور مرثیہ ''والدہ محترمہ کی یاد میں'' کی آہٹ بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ اس میں حکیمانہ و فلسفیانہ انداز بھی سمونے کی کوشش ملتی ہے اور اپنے دَور کی رفتار و سمت کا عرفان بھی جھلکتا ہے۔ ان کے دَور میں طبقہ واریت اور معاشی استحصال کے خلاف جو تحریکیں چل رہی تھیں اور جن مسائل پر خاص طور سے بحث ہوتی تھی۔ اس پر بھی کن انکھیوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مثال میں یہ اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں:

ہو رہا تھا تمکنت کا ذرہ ذرہ سے ظہور
سارے گورستان پہ چھایا تھا خموشی کا غرور
انقلاب ان بستیوں کو آنکھ دکھلاتا نہیں
جنگ کا دور تباہی بھی کبھی آتا نہیں
اس جگہ فانی مظاہر کا نہیں ہرگز گزر
ایک ہی حالت میں رہتی ہے یہاں شام و سحر
آدمی کو آدمی اس ملک میں کھاتا نہیں
یاں امیری اور غریبی کا سماں بھاتا نہیں
یاں کے انساں رہتے ہیں انساں کی سفاکی سے دور
فحش گوئی، بد نہادی، بیر، ناچاقی سے دور
اس گلستاں پر خزاں کا بس نہیں چلتا ذرا
یاں بہاریں بھی دبا کر پاؤں چلتی ہیں سدا

زندگی ہی زندگی ہے اس سکون آباد میں
موت کا خطرہ نہیں اس خطۂ آزاد میں

اس مرثیہ میں مولانا کی ذہنی تصویروں کے نقوش اور تاثرات سے غم کے خدوخال ابھرتے ہیں۔انھوں نے اپنے سوزِ نہانی کی تڑپ کا شعری اظہار یوں فرمایا ہے:

بول اٹھی انبارِ غم سے ہو کے بے قابو زباں
آپ کا لختِ جگر ہے سامنے اے میری ماں
اب کوئی نغماتِ زیرِ لب سنا سکتا نہیں
اب کوئی جذباتِ فطری کو جگا سکتا نہیں
اب گھٹائیں لاکھ برسیں لطف مل سکتا نہیں
گلشن پامال اپنا آہ کھل سکتا نہیں
کس طرح ہم نے سلایا جاگتی امید کو
کس طرح ہم نے بنایا ہے محرم عید کو

آخری شعر میں شدتِ الم سے آبگینہ گدازی اور جام شکنی کی کیفیت نمایاں ہوگئی ہے۔وہ یہ ہے:

کس طرح سے ہم جیے ہیں آپ کے مرنے کے بعد
آپ تو گھر کو نہیں لوٹیں سفر کرنے کے بعد

یہ مرثیہ مولانا کے کاغذات میں نامکمل صورت میں دستیاب ہوا ہے۔جگہ جگہ اس میں سطریں چھوڑی گئی ہیں، جو بروقت مناسب مصرع یا شعر موزوں نہ ہونے کی وجہ سے کسی اور لمحۂ فرصت میں فکر کر کے لکھنے کے لیے چھوڑی گئی ہیں۔غالباً مولانا اس کاغذ کو اوراق کے انبار میں رکھ کر بھول گئے، یا انھیں یاد تو آیا مگر ان کو اپنی علمی و تحقیقی مشغولیتوں نے اس طرف ان کو آنے نہیں دیا اور یہ مرثیہ ہمیشہ کے لیے تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

تیسرا مرثیہ جو سات اشعار پر مبنی ہے، انھوں نے اپنے دوست مولوی عبدالحیٔ آثر قاسمی مئوی کے صاحبزادے ممتاز احمد کی وفات پر ان کی دِل بستگی اور تسلی و تشفی کے خیال سے کہا ہے۔اس میں قاضی صاحب نے اپنے اوپر غم کی کیفیت کو طاری کر کے اشعار کہے ہیں، جس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب میں دوسروں کے غم کو بھی اپنا بنا لینے کی بڑی صلاحیت موجود تھی اور وہ اس شعر کی سچی تصویر تھے:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے (امیرؔ مینائی)

چوتھا اور آخری مرثیہ عربی میں ہے جو علامہ سید سلیمان ندوی متوفی ۱۹۵۳ء کی کراچی پاکستان میں موت پر کہا گیا ہے۔ مولانا اُردو شاعری کے دوش بدوش عربی اور فارسی زبانوں میں بھی شعر کہنے کی صلاحیت سے متمتع تھے۔ مولانا کا عربی ذوق بہت نکھرا ہوا اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے عربی زبان و بیان اور لغت و کلام سے بڑی دلچسپی لی تھی۔ ان کے اس مرثیہ میں ان تمام اثرات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اذانِ کعبہ اذانِ کعبہ قاضی صاحب کی اُن نظموں کا مجموعہ ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں جامع مسجد متعلقہ احیاء العلوم مبارک پور کی تعمیر کی غرض سے کیے جانے والے چندہ کے سلسلے میں چندہ خواں ٹیموں اور دوسرے احباب و اساتذہ خصوصاً مولانا شکر اللہ مبارک پوری کی فرمائش پر کہی گئی تھیں۔

جامع مسجد کے سنگِ بنیاد کے سلسلے میں ۱۰/۱۱/۱۲/ جون ۱۹۴۰ء مطابق ۳/۴/۵/ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ یوم دوشنبہ، سہ شنبہ، چہار شنبہ کو ایک سہ روزہ عظیم الشان جلسہ محلّہ حیدر آباد میں مبارک پور کے مشہور قبرستان شاہ کے پنجہ سے ذرا پورب اتری فاصلے پر منعقد ہوا تھا۔ جس کا گراؤنڈ موضع سکٹھی تک بڑے دینی و مذہبی احساس کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ مبارک پور میں پہلی بار لاؤڈ اسپیکر کا استعمال اسی جلسۂ سنگ بنیاد میں ہوا تھا۔ اس میں پورے ہندوستان سے مشاہیر علماء جو رزم و بزم، منبر و محراب، درس و افتا، تقریر و تحریر، انگریز دشمنی اور قومی و دینی نظریات کی نمائندگی کرتے تھے تشریف لائے تھے۔ اس میں علامہ انورؔ صابری نے ایک انقلابی نظم پڑھی تھی۔ جس میں جلیان والا باغ اور جھانسی کی رانی وغیرہ پر پُر جوش اشعار کہے گئے تھے۔ اس نظم میں پہلا مصرع یہ بھی تھا: ع

تمنا ہے کہ لوں بدلہ پشاور کے شہیدوں کا

مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیۃ العلماءِ ہند اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ نے انگریزی حکومت کے خلاف اور مسلمانوں کو راہِ عمل پر لگانے کے لیے شعلہ بار تقریریں کی تھیں۔ انگریز گورنمنٹ نے اس کا سخت نوٹس لیا اور کل ہند جمعیۃ العلماء کے ناظم مولانا احمد سعید دہلوی کو اعظم گڑھ میں جیل کی سزا ہوئی۔ ان کی کتاب ''خدا کی باتیں'' اسی اعظم گڑھ جیل کی یادگار ہے جو دینی بک ڈپو دہلی کی شائع کردہ ہے۔

جامع مسجد کی تعمیر کے لیے مبارک پور میں دروازہ دروازہ گھوم کر بڑے پیمانے کا چندہ جلوس کی شکل میں ہوا تھا۔ جس کی قیادت مولانا شکر اللہ صاحب کرتے تھے اور ان کے ساتھ نظم خوانوں اور عوام کا بڑا

قافلہ رہتا تھا۔ نظمیں پڑھی جاتی تھیں، لوگوں کو مسجد بنانے اور چندہ دینے پر ابھارنے والے اشعار کے ذریعہ ایک دینی وروحانی ماحول بنایا جاتا تھا۔ اس ماحول سازی میں قاضی صاحب کی شاعری کا زبردست حصہ ہوا کرتا تھا۔ ان کی اس قسم کی شاعری نے مولانا شکراللہ صاحب کو کس قدر متاثر کر رکھا تھا۔ اس کا اندازہ قاضی صاحب کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی نظموں کی تشجیع وتحسین کے بارے میں لکھی ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

''مولانا شکراللہ صاحب بھرے مجمع میں خوب خوب تشجیع فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ایک حکیم صاحب کی دوکان پر بھیجا، انھوں نے مجھے کوئی مقوی دماغ معجون دیا، میں اس کو مولانا کے پاس لایا تو کہا کہ تم اس کو صبح وشام استعمال کرو۔ اس سے دماغی طاقت بڑھے گی''۔[1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا شکراللہ قاضی صاحب کی شاعری کے سلسلے میں بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ ورنہ وہ حوصلہ افزائی کے لیے قاضی صاحب کو جوانی کی ابتداء میں دماغی قوت میں اضافہ کرنے والا معجون کیوں دیتے۔ قاضی صاحب کی چندہ میں پڑھی جانے والی نظمیں مولانا شکراللہ کے علاوہ علمی وعوامی حلقوں میں بھی سراہی گئیں۔ ان نظموں کی وجہ سے چندہ دہندگان کے جوشِ سخا اور بارشِ کرم میں اضافہ ہوجاتا تھا اور بقول قاضی صاحب روپیہ برسنے لگتا تھا۔ اذان کعبہ کے پیش لفظ میں لکھا کہ:

''ایک ایک نظم پر مسلمانوں نے پانچ پانچ ہزار اور دس دس ہزار کی رقم مسجد کے لیے عطا کی ہے اور یہ چیز ان نظموں کی قبولیت کی کھلی دلیل ہے''۔

مولانا قاضی اطہر نے اپنی اس قسم کی نظموں کا ایک مجموعہ ''اذانِ کعبہ'' کے نام سے مرتب کرکے اس پر علامہ انور صابری کے تاثرات بھی ۷ار مارچ ۱۹۵۴ء کو ان سے لکھوائے اور خود قاضی صاحب نے اپنا پیشِ لفظ ۲۲ر اپریل ۱۹۵۲ء سہ شنبہ کو روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی کی اپنی اسسٹنٹ اڈیٹری کے زمانے میں لکھا۔ غالباً اُن کا خیال ''اذانِ کعبہ'' کے چھپوانے کا تھا مگر کسی وجہ سے یہ تشنۂ اشاعت رہ گئی۔

احیاء العلوم سے متعلق اس جامع مسجد کے چندہ کے علاوہ قاضی صاحب نے قریب ودُور کی دوسری مساجد کی تعمیر کے لیے بھی چندے کی نظمیں کہی تھیں۔ جو اپنے نتائج وثمرات اور اثرات وتاثرات کے اعتبار سے اس قسم کی عارضی شاعری اور تاثراتی کیفیت میں بہت کامیاب سمجھی جاچکی ہیں۔ ان نظموں کی شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر ان کی ایک یادگاری اور ثقافتی ودینی حیثیت بھی ہے۔ جس سے صرف نظر

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ طبع اوّل ۱۹۸۷ء دائرۂ ملیہ مبارک پور (ص:۴۱)

کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ کیوں کہ انھیں ذرّوں سے تہذیبوں کے ستارے اُبھرتے ہیں اور انھیں دانوں سے تاریخ کی تسبیح روز و شب تیار ہوتی ہے۔

قاضی صاحب نے ''اذانِ کعبہ'' میں جو نظمیں درج کی ہیں ناچیز مرتب نے اس میں دوسرے ماخذ اور بیاضوں کی مدد سے کچھ اضافہ بھی کر دیا ہے۔ اس سلسلہ کو ابھی ختم نہیں سمجھنا چاہیے مزید تلاش و تحقیق سے اس میں اور اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ اس لیے کہ قاضی صاحب کو اس قسم کی نظموں کے لیے عموماً یاد کیا جاتا تھا اور ان سے کام لیا جاتا تھا۔ کیوں کہ ان نظموں کے مضامین اور موضوعات عامۃ المسلمین کے مزاجِ دینی اور جذبۂ مذہبی کے مطابق ہوا کرتے تھے۔ جن کا خاطر خواہ نتیجہ چندہ کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔

قاضی صاحب نے اپنی تازگیٔ فکر اور ندرتِ کلام سے ان وقتی تقاضوں کے تحت کہی گئی نظموں میں بھی ایسی خصوصیت پیدا کر دی ہے کہ وہ خاصے کی چیز بن گئی ہے جس کی وجہ سے ان نظموں کی عمر تاثیر بڑھ گئی ہے۔ ''اذانِ کعبہ'' کی نظموں کے موضوع، انداز پیش کش اور اسلوب سخن پر اظہار خیال کرتے ہوئے علامہ انور صابری اپنے مخصوص رنگ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''زیر نظر مجموعہ کو میں نے بغور پڑھا وہ ایک خالص، خشک موضوع سے متعلق ہے مگر قاضی صاحب کی رنگیں طبیعت اور حسین مزاج نے اس کے لیے بھی رنگیں الفاظ اور حسین انداز بیان تلاش کر ہی لیا۔ بعض مقامات پر کچھ ایسی لغزشیں بھی ہوگئی ہیں جو نہ ہوتیں تو عصمتِ نظم مجروح ہو جاتی۔ دینی نظم میں غزل کا مزاج شامل کرنا غلطی بھی ہے اور بہترین خوبی بھی۔ اب یہ فیصلہ میں آپ کے ذوق نظر پر چھوڑتا ہوں کہ اس قسم کی لغزش کا صحیح مقام نظم میں معلوم کریں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ اسے لغزش سمجھتے ہیں یا خوبی''۔

''اذانِ کعبہ'' پر علامہ انور صابری کی یہ رائے بہت وقیع ہے۔ اس مختصر تبصرہ میں انھوں نے ان نظموں کی تمام خصوصیات پر روشنی ڈال دی ہے۔ انھوں نے نظم و غزل کا مسئلہ بھی چھیڑ کر ایک اچھی فنی بحث کا آغاز کر دیا ہے۔ یقیناً بعض لوگ ان کی نظموں کے مزاج پر جز بز ہوں گے اور دینی اشتغال میں رنگینیٔ خیال اور رعنائی الفاظ کی آمیزش کو پسند نہیں کریں گے۔ لیکن بات ادب کی ہے، اس لیے ادبیت پیدا کرنے اور اسلوب بیان میں نکھار لانے کے لیے جو راہ مل سکتی ہے، اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ موضوع اور ہیئت کا مسئلہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ اندازِ بیان کا تعلق مواد و موضوع سے ہو یا اُسلوبِ خیال

سے کچھ انحراف بھی چاہیے۔ غالبؔ نے بہت پہلے کہا تھا:

بقدرِ ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

انھوں نے ''ظرف تنگنائے غزل'' کہہ کے اس کا اطلاق ہر ادب پارے پر کیا ہے۔ شاعری احساس کو گل پیرہنی عطا کرنے کا نام ہے۔ یہ گل پیرہنی اپنے تانے بانے کے لیے کس گوشۂ چمن کی طرف جھانکے اس کا فیصلہ کوئی حاکم، کوئی محتسب، کوئی ناقد نہیں کرے گا۔ اس کی رہنمائی ذوقِ سخن اور مذاق سلیم کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ہر تعمیر کے لیے تخریب، ہر یقین کے لیے تشکیک، ہر منزل کے لیے انحراف، زندگی اور زندگی ہی کی طرح ادب کے اٹل اصول میں سے ہے۔ غالبؔ نے ایک جگہ کہا ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

لیکن یہ صرف ایک استعجابی کیفیت پیدا کرنے کے لیے ہے۔ غالبؔ پوری بصیرت کی بیداری کے ساتھ زندگی کے تقاضوں کو سمجھ رہے ہیں۔ وہ ہر راہ رو کے ساتھ تھوڑی دور چل کر اپنے علم و عرفان کی کائنات کو وسیع کر رہے ہیں بعد میں کائنات سازی یا آشیاں بندی کے لیے یہی برگ و ساز ان کے کام آئیں گے جب شاعر اپنے احساس و تاثر کو جذبے کی زبان دے گا تو اس کے اظہار کا وسیلہ اسی عرفان کے بطن سے پیدا ہوگا۔ قاضی صاحب غزلوں کے رنگ اور عشقیہ آہنگ کا سہارا لے کر ان مذہبی نظموں کی موضوعاتی خشکی کو دور کرنے کا سامان سامنے لا رہے ہیں۔ ان کا غزلیہ انداز حسن آفرینی اور تازگی روح کے لیے ہے۔ ملاحظہ ہو:

پہلے در پردہ بیٹھ کر اس نے اپنا مسکن کیا جگر اس نے

کردیا دل کو جلوہ گر اس نے پہلے روپوش تھی مگر اس نے

رُخ سے پردہ ہٹا کے لوٹ لیا

اس بند میں تغزل سے انکار نہیں، لیکن کیا فن پر اس سے کوئی آنچ آرہی ہے، یا تقدس پر داغِ عصیاں لگ رہا ہے۔ مقصود ہے ادب کا ساجی یا افادی پہلو، لیکن یہاں اس کا وسیلہ بن رہی ہے۔ ایک مذہبی مقصد حاصل کرنے کے لیے جمالیاتی حسیت، یہ مجاز سے حقیقت کی طرف سفر ہے۔ حسن سے مذہب کی طرف مراجعت ہے۔ اہمیت مقصد کی ہے وسیلہ کی نہیں، گو کہ وسیلے ہی پر مقصد کا دارومدار ہے۔ اس لیے اس کی

اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ دونوں کے تال میل سے نظامِ کائنات قائم ہے۔ اسی نظم کا ایک اور بند پیش ہے جس کے بہاریہ رنگ نے ادبی فضا بندی کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے:

گلستاں میں بہار آئی ہے بو ہوا پر سوار آئی ہے
رحمتوں کی قطار آئی ہے خلد سے یہ پکار آئی ہے
مجھ کو مسجد بنا کے لوٹ لیا

قاضی صاحب میں بڑی قادرالکلامی اور زود گوئی تھی، وہ بسیار گو بھی تھے۔ ان میں جب شعر گوئی کی تحریک پیدا ہو جاتی تو ابرِ مطیر کی طرح اشعار کی بارش ہونے لگتی۔ مولانا اپنی طالبِ علمی کے دور کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"آئے دن جلسوں کے لیے ملی، قومی، سیاسی اور مذہبی نظمیں کہنے لگا۔ ان ہی ایام میں جامع مسجد کی تعمیر کا اجتماعی انداز میں چندہ ہونے لگا اور لوگوں میں بے انتہا جوش تھا۔ اس کے لیے ایک ایک دن میں چار چار پانچ پانچ نظمیں کہتا تھا۔ اس وقت میری شاعری جنون کی حد تک پہنچ گئی اشعار اُبلتے تھے۔ بعض اوقات چاروں طرف سے مجمع مجھے گھیر کر کہتا کہ ابھی ایک نظم کہو فلاں صاحب کے یہاں چندہ میں پڑھنی ہے اور میں اسی حالت میں اشعار کہتا جو فوراً پڑھے جاتے تھے اور روپیہ برسنے لگتا تھا۔ مولانا شکر اللہ صاحب بھرے مجمع میں خوب خوب تشجیع فرماتے تھے۔"[1]

اس اقتباس سے پوری وضاحت ہو جاتی ہے کہ مولانا کی قادرالکلامی اور پر گوئی کی صفت ان کی تحصیلِ علمی کے دور ہی سے موجود ہے۔ مشقِ سخن نے ان کی زود گوئی کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ ان کی یہ خوبی آخری عمر تک باقی رہی اور ذرا سا غور کرنے پر اشعار کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔

مولانا کی اس وقت کی کہی ہوئی چندہ کی نظمیں مترنم اور خوش گلو ٹیمیں یا طالب علم پڑھا کرتے تھے اور داد و تحسین اور شاباشیاں لوٹتے تھے۔ ان کا کلام قوالی کے دور و نزدیک تک مبارک پور کے مشہور اکھاڑے کے سرغنہ نور العین قوال، قاری انوار الحق متوفی ۷ر جنوری ۲۰۰۱ء اور مولانا محمد عوف سیتاپوری کے علاوہ دوسرے مترنم حضرات دروازے دروازے پڑھتے اور جذبۂ سخاوت میں تلاطم پیدا کر دیتے تھے۔ مولانا کی چندہ کی نظموں کی دھوم مبارک پور تک ہی محدود نہیں تھی اس نے غلغلہ کا حصار توڑ کر اطراف کی

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔ طبع اول ۱۹۸۷ء دائرۂ ملیہ مبارک پور (ص:۴۱)

بستیوں میں بھی ان کی مقبولیت وشہرت کا آوازہ پہنچا دیا تھا اور ان کا نام بڑے بڑوں کی مجلس سے گزر کر بچے بچے کی زبان پر لا دیا تھا۔ مولانا اعجاز احمد اعظمی جو بھیرہ ضلع اعظم گڑھ سے وطنی نسبت رکھتے ہیں، زمانے میں اپنے لڑکپن کی یادوں کے نقوش وتاثرات کو اُبھارتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا شعور جب بیدار ہونا شروع ہوا تو اپنے اطراف میں اپنے گاؤں میں جن لوگوں کا نام بار بار سننے میں آیا، ان میں ایک نام قاضی جی کا بھی تھا اور یہ نام بطور خاص اس لیے بھی آتا تھا کہ کچھ ہی مدت پہلے گاؤں میں کسی مسجد کے لیے چندے کا زور وشور تھا۔ اس وقت چندے کا یہ طور بن گیا تھا کہ اس کے لیے ولولہ انگیز ترغیبی نظمیں لکھی جاتیں اور کچھ لوگ انھیں خوش الحانی سے پڑھتے، جس کے گھر چندہ ہوتا اس کا نام بھی نظم میں آتا۔ اس طرح رقم کی فراہمی میں بڑی آسانی ہوتی۔

بعض اوقات نظم پڑھنے والے پارٹیوں میں تقسیم ہوجاتے۔ اس طرح مسابقہ کی ایک صورت ہوجاتی۔ یہ پارٹیاں اپنے اپنے پسندیدہ شعراء سے رابطہ رکھتیں اور ہر روز تازہ نظمیں لکھوا کر پیش کرتیں۔ ہمارے یہاں بھی دو پارٹیاں ہوگئی تھیں۔ ایک پارٹی استاذ محترم حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحرؔ مبارک پوری اور حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری سے رابطہ رکھتی اور دوسری پارٹی مولانا محمد ادریس آزادؔ رحمانی اطوی سے تعلق رکھتی۔ میرے والد صاحب اس وقت شاعری کرتے تھے۔ مولانا آزادؔ رحمانی کے ساتھ والد صاحب کی بھی نظمیں ہوا کرتی تھیں۔ اس تقریب سے بار بار قاضی جی کا ذکر گھر میں آتا تھا۔ واقفیت کی بنیاد تو یہیں سے پڑی۔''[1]

مولانا کی اس طرح کی نظموں میں آج بھی وہی تازگی، ندرت اور تاثر کرنے کی صلاحیت محسوس ہوتی ہے، جو ان کے لکھنے کے دور میں تھی۔ حالاں کہ لوگوں کا مزاج بدل چکا ہے، شعر وادب کی قدریں تبدیل ہو چکی ہیں۔ کلام کو آنکنے اور پرکھنے کے پیمانے بہت مختلف ہو چکے ہیں۔ نقد ونظر اور محاکمہ ومحاسبہ کے انداز پہلے جیسے نہیں رہے۔ اسلوب اور زبان کے تیور اب قدیم طرز وفن سے جدا رنگ رکھنے لگے ہیں، لیکن آج بھی عوام وخواص کے تار رگِ جاں کو چھیڑنے کی وہی قوت ہے، جو نصف صدی پہلے ان نظموں میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی مسجد ومدرسہ کے چندہ کی فراہمی کے مقصد

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص: ۲۴۷)

نظم خوانی کے منصوبے تشکیل پاتے ہیں تو مولانا کی ان نظموں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔یہی حال ان نظموں کا بھی ہے جو مذہبی و دینی جلسوں میں پڑھنے کے لیے کہی گئی تھیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا نے انسانی نفسیات اور ذہنی وفکری جہات کو روشن کرنے کے لیے جو خیالات ونظریات اور مسائل وواقعات اپنی نظموں کے ذریعے پیش کیے ہیں ان کا راست اثر انسانی قلب ودماغ پر ہوتا ہے۔وہ انسانی معاشرہ کے بہت بڑے مزاج شناس اور فطرت وکائنات کے رمز آشنا کے طور پر ابھرتے ہیں۔ان کا فن، ان کی نظر، ان کا جذبہ وتاثر، ان کا انداز ومعیار انسان کی اندرونی کیفیتوں کو مہمیز کرنے میں ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ان کی کمان کے تیر نشانے کو تاک کر چلتے ہیں اور پھر دل میں ترازو ہو جاتے ہیں۔اس ہُنر اور ہنر کا ایک بہت اہم راز مولانا کے اسلوب کا بیانیہ انداز اور راست اظہار بھی ہے۔وہ سامنے کی بات سامنے کے انداز میں کہتے ہیں۔تشبیہ واستعارہ کی شیشہ گدازی اور تندیِ صہبا کی جام شکنی سے ان کی نظمیں کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔یہ نظمیں مولانا کی ابتدائی شاعری کے نمونوں میں سے ہیں اس لیے ان میں فنی سقم نظر آئیں تو صرفِ نظر کیا جائے کیوں کہ ان خامیوں کا احساس شاعر کو بھی تھا۔اسی احساس کے تحت انھوں نے کہا ہے:

> ''یہ نظمیں چاہے فنی اعتبار سے کیسی ہوں مگر اخلاص وایثار اور دیانت وروحانیت کے لحاظ سے بہت کامیاب ہیں''۔

قطعات ومتفرقات اس حصے میں قاضی صاحب کے قطعات کے ساتھ ان کی غزلوں کے وہ متفرق اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو مختلف ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں۔قاضی صاحب غزل کہنے کے لیے متفرق شعر کہہ لیتے تھے۔ان کی غزل گوئی کا اس طرح کا کوئی باضابطہ نظامِ فکر نہیں تھا کہ وہ پہلے مطلع کہیں، پھر درمیان کے اشعار موزوں کریں اور آخر میں مقطع کہہ کے غزل مکمل کرلیں۔چوں کہ غزل میں ریزہ خیالی ہوتی ہے، اس لیے قاضی صاحب بھی قسطوں میں فکرِ غزل کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے اشعار مکمل غزل کی شکل اختیار نہیں کر سکے اور وہ منتشر رہ گئے۔انھیں بھی اس مجموعہ میں شامل کر کے ان کے تمام فرمودات شاعری کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

قطعہ دَرحقیقت عربی کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے ٹکڑا۔اہلِ لغت وزبان کے درمیان اس کے تلفظ میں اختلاف ہے۔بعض کا خیال ہے کہ اس کا پہلا حرف زیر کے ساتھ اور دوسرا حرف ساکن ہے۔لیکن بعض یہ کہتے ہیں کہ قاف مفتوح ہے یعنی اس پر زَبر ہے اس لیے یہ قِطعَہ، اور قَطعَہ دونوں طرح تلفظ میں رائج ہے۔قطعہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت وسعتیں رکھتا ہے۔اس کے معنی میں وحدتِ فکر ہونی

چاہیے اور پہلے شعر کے بعد جو اشعار آئیں وہ مرکزی خیال سے الگ نہ ہوں ہر شعر ترقی مضمون کا نمائندہ ہو اور تسلسل مضامین باقی رہے۔ یہ کم از کم چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ آگے کے اشعار کی تعداد میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ کچھ کا بیان ہے کہ قطعہ میں اشعار کے عدد چار سے کم نہیں ہوتے[1]

مولوی نجم الغنی بحر الفصاحت میں اس کی تعداد دو شعر سے لے کر سترہ شعر تک مقرر کرتے ہیں۔ مرزا محمد عسکری کم از کم دو شعر کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔

مثنوی اور رباعی کی طرح یہ صنف شاعری کسی مقررہ بحر و وزن کی پابند نہیں۔ قطعہ کبھی بے مطلع ہوتا ہے اور کبھی اس میں مطلع بھی ہوتا ہے اس دور میں قطعہ نگاری کا رواج بہت بڑھ گیا ہے اور تقریباً ہر بڑا شاعر قطعہ ضرور کہتا ہے۔ لیکن اس دور کے قطعات عموماً مطلع کے پابند ہوتے ہیں۔ اس صنف شاعری میں ہر موضوع اور ہر مضمون بیان کیا جاسکتا ہے مگر عموماً اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین اس میں نظم کیے جاتے ہیں۔ حال کے شعراء نے رومانی انداز و آہنگ کو زیادہ اختیار کیا ہے اور شاعری کی جمالیات کو روشن کرنے کے لیے اس کا بڑا سہارا لیا ہے۔ قاضی صاحب کے یہاں بھی قطعہ نگاری میں تشبیہ و استعارہ اور جمالیاتی قدروں سے مدد لینے کا رجحان ملتا ہے ان کی قطعہ گوئی ان کی بہترین شاعری کا نمونہ ہے۔ ان کے فکر و خیال اور ان کی طبیعت میں مناظر فطرت سے متاثر ہونے کی جو صلاحیت تھی ان کے قطعات سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے قطعہ کو دینی و مذہبی جذبات کو پیش کرنے کا بھی ذریعہ بنایا ہے۔ اسی کے ساتھ معاشی، سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی کے لیے بھی اس صنف کو استعمال کیا ہے۔ جس کا اندازہ ان کے عنوانات سے ہوسکتا ہے۔ ان کے قطعات جو اس مجموعہ میں کسی نہ کسی عنوان کے تحت آئے ہیں ان کی فہرست اس طرح ہے:

مکاری، جمع اضداد، قحط بنگال، یہودی اور فلسطین، ایمان کا سودا۔ اس کے علاوہ مولانا کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے لاہور قیام کے دور میں جب فسادات کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا اور ایک فرقہ دوسرے فرقے کا جانی دشمن بلکہ قاتل بنا ہوا تھا اس دور میں انھوں نے قطعہ نگاری کے حوالے سے فرقہ وارانہ یکجہتی اور سماجی و قومی ہم آہنگی کی فضا بنانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ اس زمانے کے زمزم اور دوسرے رسائل میں ان کی اشاعت بھی ہوئی تھی۔ لیکن ان رسائل تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے" دستیاب نہیں ہوسکے۔ ورنہ ان سے اُردو شاعری کا ایک اہم رجحان قومی یکجہتی کا رنگ مولانا کی شاعری میں بھی وافر تعداد میں نظر آ جاتا اور اس سے ان کی وسعت نظر، فراخیِ دل اور کشادگیِ ذہن کا علم ہوتا۔

[1] کاشف الحقائق دوم۔ امداد امام اثر (ص: ۲۵۷)

قاضی صاحب کے قطعات میں کم سے کم لفظوں اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں زندگی کی بڑی گہری بات کہہ جانے کی صلاحیت ہے۔ ان کے دامن میں بڑی وسعتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ ان کے قطعات میں سیال لفظوں، سیماب وش اور مرتعش جذبات روحانی، دم بدم بہتے ہوئے احساسات کی دھنک رنگی بڑا لطف پیدا کر رہی ہے۔ ان کی فنکاری کی اصل معراج ان کے وہ قطعات ہیں جو انھوں نے "مشاعرہ ماہتابی بزم شباب سخن"، بمبئ منعقدہ ۱۹؍مارچ ۱۹۵۴ء کے لیے کہے تھے۔ ان قطعات میں فطرت کے حسن کو سمیٹنے کی بڑی کامیاب کوشش ملتی ہے:

تیرتے ہیں نور کے دریا میں نغمات حیات
رات کے پچھلے پہر چھیڑا ہے فطرت نے رباب
دے رہی ہے درسِ رنگ و بو چمن کو چاندنی
نورزادے پڑھ رہے ہیں صف بہ صف سیمیں کتاب

☆

تھم گیا ماحول کی رنگینوں کا ارتعاش
اہتمامِ بزمِ شب کا ہو گیا پورا نصاب
رنگ و بو کی گود میں شبنم کی چادر اوڑھ کر
سو رہی ہے دامنِ گل پر عروسِ ماہتاب

قاضی صاحب کی نظر اپنے سماج میں پھیلی ہوئی اخلاقی بیماریوں اور روحانی وباؤں پر بھی رہا کرتی تھی۔ وہ کنج تنہائی اور گوشۂ علم میں رہنے والے آدمی تھے لیکن ان کا شعور اتنا بیدار تھا کہ وہ حالات زمانہ کی ذرا سی آہٹ کو بھی سن لیتے تھے اور سن لیتے ہی نہیں تھے، وہ تمام حقیقتوں کی تہ تک بھی پہنچ جاتے تھے۔ شراب ہماری زندگی کی ایک ایسی سماجی بیماری ہے، جس کا درماں بڑے سے بڑے سماجی مصلحین بھی نہیں ڈھونڈھ سکے ہیں۔ قاضی صاحب کی نظر میں جام شراب کی تنگیِ ظرف وہ گہرائی رکھتی ہے کہ اس میں خاندانوں کی روایتیں، نسلی شرافتیں، عظیم شخصیتوں کی عظمتیں، نوابوں اور شہنشاہوں کی دولتیں، حکومتیں، دارائیاں، سلطانیاں، علم و دانش کی متاعِ گراں مایہ یوں ڈوب جاتی ہیں کہ پھر ڈھونڈھنے پر اُن کے نشانات بھی نہیں ملتے۔ حکومت بمبئ کی طرف سے ہفتہ شراب بندی کے اصلاحی مشاعرہ منعقدہ ۱۰؍مارچ ۱۹۵۴ء میں پڑھا گیا ان کا ایک قطعہ اسی تناظر میں دیکھیے:

عقل کو، روح کو، اخلاق کو جو شل کردے
میرے نزدیک وہ تخریب ہے تعمیر نہیں
رقص ہو، نغمہ ہو، طاؤس ہو، یا پھر ہو شراب
کون ان میں دلِ انساں کے لیے تیر نہیں؟

اس طرح کے فکری قطعات سے قاضی صاحب کی شاعرانہ عظمت اور ان کی انفرادی حیثیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ خارج سے موضوع حاصل کر کے اُس کو تخلیق و تشکیل کے کتنے مراحل سے گزارتے ہیں، اُس کا سانچہ تلاش کرنے کے لیے ان کی نگاہ کو کتنے طواف کرنے پڑتے ہیں اور ان کی معتکفانہ فکر کتنے ہنگاموں اور رونق بازار سے گزرتی ہے، کچھ وہی لوگ سمجھ پائیں گے جو اس طرح کے کرب تخلیق میں پڑے ہوں۔ ورنہ ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کا نظارہ کرنے والے تو بہت سے ہوتے ہیں جنھیں صحیح طور سے اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا البتہ وہ تماشابیں تو ضرور کہے جاسکتے ہیں۔

قاضی صاحب نے غزلوں کو اپنی صلاحیتیں زیادہ دی ہیں۔ یہ صنف شاعری اُن کی توجہ کا مرکز کچھ زیادہ دنوں تک رہی۔ اس لیے ان کی فکر میں غزلیہ اسلوب و آہنگ پورے طور سے رچ بس گیا تھا۔ وہ کسی صنف میں اپنی قادرالکلامی اور شاعرانہ مہارت کا ثبوت فراہم کریں ہر پھر کے وہ غزل کے دائرے میں قدم رکھ ہی دیتے ہیں۔ ان کے قطعات بھی اس رنگ سے خالی نہیں۔ یہ چند قطعات اس کی گواہی میں پیش کیے جاسکتے ہیں:

تمھیں پیار کرنے کو جی چاہتا ہے ۔۔۔ کچھ اظہار کرنے کو جی چاہتا ہے
وہی کار کرنے کو جی چاہتا ہے ۔۔۔ نہیں جس کا آغاز و انجام کچھ بھی

☆

ذرا بات کرنے کو جی چاہتا ہے ۔۔۔ ملاقات کرنے کو جی چاہتا ہے
خرابات کرنے کو جی چاہتا ہے ۔۔۔ تم آؤ کہ مست و حسیں چاندنی کو

قاضی صاحب کے قطعات بھی ان کی غزلوں کی طرح ہمارے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ بعض وجوہ سے ان کے قطعات ان کی غزلوں پر بھاری ہیں۔ ان کو سن کر اور ان کو پڑھ کر خوش وقتی کا ہی احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ ان سے حالات و زمانہ کی رفتار کا علم بھی ہوتا ہے اور عرفان حیات کی دولت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ذہن و فکر کو وہ روشنی ملتی ہے جو زندگی کی راہ میں چراغ سفر کا کام دیتی ہے۔ اس لیے ان کے قطعات بھی

اردو شاعری میں ایک اہم اضافہ سمجھے جائیں گے۔

متفرقات کے اسی حصے میں مولانا کی وہ شعری یادگاریں بھی شامل کر لی گئی ہیں جو انھوں نے بچے اور بچیوں کی پیدائش کے موقع پر اہل تعلق کی خواہش پر نظم کی تھیں۔ اگر چہ اس طرح کی شاعری وقتی اور ہنگامی ہونے کی وجہ سے کوئی دیر پا اثر نہیں چھوڑتی لیکن قاضی صاحب کی اس رنگ کی شاعری میں بھی کچھ خصوصیات ایسی جمع ہو گئی ہیں، جنھوں نے مل کر اس رنگ سخن کو بھی خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں شعریت اور رنگِ سخن کا اندازِ تاثر ملاحظہ کے لائق ہے:

جو خرد کو بنائے پیمانہ　　در حقیقت وہی ہے فرزانہ
تا کہ بچی رہے سعادت مند　　خوب رکھا ہے نام سعدانہ

☆

شہر امید کی فصیلوں پر　　ہر طرف جشن ہے، چراغاں ہے
رقص کرتی ہے چاندنی ہر سو　　روئے عدنان ماہ تاباں ہے
بچ کے جس سے خزاں گزرتی ہے
تو حقیقت میں وہ گلستاں ہے

کچھ اس مجموعہ کے بارے میں | یہ مجموعہ حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی چھوٹی بڑی تین بیاضوں اور کچھ متفرق و منتشر اوراق کی مدد سے مقابلہ و موازنہ کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ ایک دو کلام ان کے اہل تعلق سے بھی حاصل کیا گیا ہے۔ اس میں ایک غزل سماعی ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

ہمیں اس بات کا دعویٰ نہیں کہ ہم نہیں پیتے
مگر اتنا تو کرتے ہیں کہ بے موسم نہیں پیتے

قاضی صاحب کی اس غزل پر رحمتِ الٰہی برقؔ اعظمی کے لڑکے تشنہؔ کی تضمین بشکل خمسہ موجود ہے۔ یہ تضمین نور العین قوال مبارک پوری کے قوالی کے اکھاڑے کے نمائندہ سراج الدین قوال موضع سکٹھی شاہ محمد پور، مبارک پور کو زبانی یاد تھی۔ اسی تضمین سے قاضی صاحب کی غزل کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ سراج الدین قوال کے بقول اس کے علاوہ قاضی صاحب کے اور بھی کلام نور العین قوال کے اکھاڑے میں متداول تھے۔ اس کی روایت و شہادت ایک اور جگہ بھی ملتی ہے کہ جامع مسجد کے چندہ سے متعلق ان کا کچھ کلام نور العین قوال چندہ کے ایام میں اپنی ٹیم کے ساتھ دروازہ دروازہ گھوم کر پڑھا کرتے تھے اور

مولانا شکر اللہ مبارک پوری وغیرہ سے داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ لیکن نور العین قوال کے اخلاف سے اب ان کی بیاض حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس لیے اور کلام کی دستیابی نہیں ہوسکی۔

اس مجموعہ کا نام ''مئے طہور'' قاضی صاحب کا ہی منتخب کردہ ہے۔ کیوں کہ اخبار و رسائل میں ان کی غزلیں ''مئے طہور'' ہی کے عنوان سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی بیاض بھی اسی نام سے مرتب کی ہے مگر اس پر ان کا کوئی مقدمہ نہیں ہے اور نہ کبھی انھوں نے کوئی مقدمہ لکھا تھا جیسا کہ ان کے بیٹے قاضی ظفر مسعود صاحب نے لکھا ہے کہ:

''قاضی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جسے ''مئے طہور'' کے نام سے مرتب کر کے اس پر مقدمہ لکھ چکے تھے مگر پریس کو نہیں دے سکے''۔[1]

ظفر مسعود صاحب سے یہ تسامح ہوگیا ہے البتہ قاضی صاحب نے ''اذانِ کعبہ'' کے نام سے مساجد کے چندہ والی نظموں کا جو مختصر مجموعہ اپنے قلم سے مرتب کیا تھا اس پر خود بھی مقدمہ لکھا تھا اور علامہ انور صابری دیوبندی سے بھی اس پر مقدمہ لکھوایا تھا۔ جس کو ''اذانِ کعبہ'' کے شروع میں شامل کردیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں کہیں کہیں فنی تسامحات بھی راہ پاگئے ہیں۔ جان بوجھ کر اس پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے کہ قاضی صاحب کا بیشتر کلام ان کی نومشقی کے دَور کا ہے۔ جب کہ وہ کسی صاحبِ فن سے متعلق نہیں ہوئے تھے اور ان کا کلام بے منتِ استاد تھا۔ انھوں نے اپنے علم و مطالعہ اور ذوقِ شعری کو رہنما بنایا تھا۔ لاہور جانے کے بعد وہ احسان دانش کے سلسلۂ سخن سے وابستہ ہوئے تھے۔ پھر جلد ہی انھوں نے شاعری بھی ترک کردی تھی۔ ان کے مشاغل نے اصلاح و ترمیم کی فرصت فراہم نہیں کی، ورنہ کلام کا معیار کچھ اور بلند ہوگیا ہوتا۔

ہدیۂ تشکر ہزاروں شکر و احسان اس خالقِ کائنات کا ہے، جس نے اس مجموعہ ''مئے طہور'' کو مکمل کرنے کی توفیق بخشی اور اس طرح قاضی صاحب کے ایک بہت بڑے علمی قرض سے راقم الحروف کو سبکدوش ہونے کا موقع ملا۔ پھر بھی بقول غالب: ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس مجموعۂ کلام کی ترتیب و اشاعت میں مجھے سب سے زیادہ تعاون قاضی صاحب

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ مجلہ ترجمان الاسلام بنارس (ص:۲۱۲) و قاضی اطہر مبارک پوری نمبر ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ (ص:۱۷۹)

کے فرزند مولانا قاضی سلمان احمد مبارک پوری کا حاصل رہا۔ اگر ان کی حوصلہ افزائی اور قدم قدم پر مدد شاملِ حال نہ ہوئی ہوتی تو شاید ''مئے طہور'' کی اشاعت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ قاضی سلمان احمد مبارک پوری صاحب اپنے پدرِ شفیق مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے مضامین ومقالات، مکاتیب و افادات اور تصنیفات و تالیفات کی طباعت و اشاعت سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ نئے نئے لائحۂ عمل بنا کر ملک کے مشہور اشاعتی اداروں، شخصیتوں اور اہل علم سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ خود بھی سفر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی قاضی صاحب پر کام کرنے کے لیے ابھارتے رہتے ہیں۔ ان کی دلی تمنا اور کوشش ہے کہ قاضی صاحب کی ہر تحریر کتابی صورت میں محفوظ ہو جائے اس خصوص میں دیگر اخراجات بھی برداشت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں دین متین کی خدمت، درس و تدریس میں اخلاص نیت اور مولانا مورخ مبارک پوری کی علمی و قلمی یادگاروں کی اشاعت ثانی کی توفیق ارزانی کرے اور ان کی خدمات کو شرف قبولیت سے نواز کر ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین

بڑی احسان فراموشی ہوگی اگر قاضی ظفر مسعود صاحب کی خصوصی دلچسپی، رہنمائی اور اہم ماخذوں خصوصاً قاضی صاحب کی بیاضوں کی فراہمی کا ذکر نہ کیا جائے۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ میری دی ہوئی علمی زحمتوں کو برداشت کیا اور کسی مقام پر یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ اس کام میں حقیر مرتب تنہا ہے۔ ان کا خلوصِ محبت، ان کا حرفِ تحسین، ان کا ذوق علمی اپنے والد گرامی کی ذات اور کام سے ان کا عشق صادق اس کام میں میرے لیے بہت معاون ثابت ہوا۔

اسی کے ساتھ چشتی کمپیوٹر سینٹر کے مالک داغ اسکول کے نمائندہ شاعر وادیب محترم ماسٹر مظہر علی چشتی صاحب اور ان کے صاحبزادے جاوید چشتی کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے واجبات میں سے ہے۔ جنھوں نے کمپوزنگ کی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر مجھے اندیشۂ دور دراز سے بے نیاز کر دیا۔ عزیزم علاء الدین سلمہٗ کی فنکارانہ دلچسپیوں کا اظہار نہ کرنا بھی بڑی ناانصافی ہوگی جنھوں نے ''مئے طہور'' کی تزئین میں اپنی بلند ذوقی اور فنکارانہ صلاحیتوں کا اظہار تاجرانہ ذہنیت سے بالاتر ہو کر کیا ہے۔

ان تمام معاونین کو اللہ تعالیٰ اپنے حفظ وامان میں رکھے اور انھیں اپنی طرف سے بہترین صلہ عطا فرمائے۔ آمین

قمر الزماں مبارک پوری

۱۴ر دسمبر ۲۰۰۵ء مطابق ۱۱ر ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

نعتیں

◎
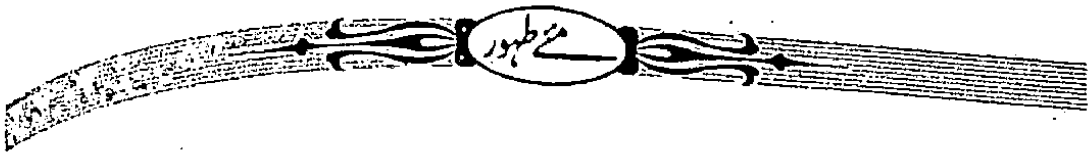
سلام اُس ذات پر جس کا لقب ہے فخرِ انسانی
سلام اُس ذات پر آئی جو بن کر ظلِ سُبحانی

سلام اُس ذات پر جو باعثِ تکوینِ عالم ہے
سلام اُس ذات پر جس کے سبب کونین کا دَم ہے

سلام اُس ذات پر جس کا تبسّم رُوحِ میخانہ
سلام اُس ذات پر جس کی نگاہیں جام و پیمانہ

سلام اُس ذات پر جس کی ادا صبحِ حنیفانہ
سلام اُس ذات پر جس کی ادائیں شامِ میخانہ

سلام اُس ذات پر جس کی صباحت فخرِ کنعانی
سلام اُس ذات پر جس کی ہیں زلفیں سلکِ نورانی

سلام اُس ذات پر روئے جو اُمّت کی خطاؤں پر
سلام اُس ذات پر جس نے دُعائیں دیں جفاؤں پر

سلام اُس پر جو چمکا کفر کی کالی گھٹاؤں میں
سلام اُس پر جو نغمہ بن گیا روتی فضاؤں میں

سلام اُس پر جو اٹھا ہاتھ میں تیغِ دو دم لے کر
سلام اُس پر جو آیا ساتھ بارانِ کرم لے کر

سلام اُس پر جو جلوہ گر ہوا روشن جبیں ہوکر
سلام اُس پر جو آیا رحمۃا للعالمیں ہو کر!

سلام اُس پر جو سویا بھی تو حالِ قوم پر روکر!
سلام اُس پر جو راتیں کاٹ دیتا خاک پر سوکر

سلام اُس پر جو دیتا ہے فقیروں کو بھی دارائی
سَلام اُس پر جو دیتا ہے مریضوں کو مسیحائی

سلام اُس پر جو ہے شمعِ ہُدا انوارِ سُبحانی
سلام اُس پر جو ہے تفسیرِ رحمت، فیضِ ربّانی

سلام اُن پر ہو اور اُن کے صحابہ کی جماعت پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے فدا کاروں کی تربت پر

سلام اُن پر ہو اور اُن کے گلوں کی پاک نکہت پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے لگائے باغِ جنت پر

سلام اُن پر ہو اور اُن کی ادا پر مرنے والوں پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے کنارے سارے ہالوں پر

سلام ان پر ہو اور ان کے فدا پرُ جوش لوگوں پر
سلام ان پر ہو اور ان کے کفن بردوش لوگوں پر

یہ نامکمل نعت قاری انوار الحق مبارک پوری کی ایک مخدوش بیاض میں ملی ہے۔ جو اُن کی طالب علمی کے دور کی ہے اور جس کے بہت سے اوراق مرورِ زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں۔ (مرتب)

عرب ہی کیا! غرض دنیا کا ہر گوشہ اندھیرا تھا
تباہی نے بنی آدم کی ہر بستی کو گھیرا تھا

ہلاکت خیز طوفاں بحرِ شیطانی سے اُٹھے تھے
تم اے اہلِ جہاں اک آگ کے دریا میں ڈوبے تھے

خدا کے قہر کی انسان پر آتش برستی تھی
یوں ہی صدیوں سے کھیتی آدمیت کی جھلستی تھی

ہدایت کے طریقے کو بنی آدم نے چھوڑا تھا
خدا کو چھوڑ کر شیطان سے رشتے کو جوڑا تھا

وہ اپنے باپ، دادا، قوم کی رسموں کو پکڑے تھے
خیال و وہم کی مضبوط زنجیروں میں جکڑے تھے

زمیں کا ذرہ ذرہ خون سے سیراب رہتا تھا
قتالِ باہمی کا وا ہمیشہ باب رہتا تھا

غرض سارے جہاں پر اِک گھٹا ظلمت کی چھائی تھی
جہالت نے تمام عالم میں اک آفت مچائی تھی

یہ حالت دیکھ کر دریائے رحمت جوش میں آیا
خدا نے اپنی سنّت کے موافق رحم فرمایا

محمد مصطفیٰ صلِّ علیٰ تشریف لے آئے
عرب کے ملک مکہ میں حرا کی راہ سے آئے

وہ آئے ساتھ اُن کے رحمتِ پرور دگار آئی
گلستانِ جہاں میں اک نئی تازہ بہار آئی

وہ آئے اس جہاں میں اور کیسی شان سے آئے
جلالی آن سے آئے، رحیمی بان سے آئے

وہ آئے ناخدائے کشتیِ اہلِ زمیں ہوکر
وہ آئے اس جہاں میں رحمۃ اللعالمیں ہوکر

نعتیہ قصیدہ

مولانا کی بیاضِ خرد میں یہ نعتیہ قصیدہ درج ہے۔ اندازِ کتابت سے خیال ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ نامکمل ہے۔ مولانا اس میں اضافہ کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر تحقیقی و علمی انہماکات سے اس طرف توجہ کا موقع نہیں ملا۔

اندھیری رات، بادل کی گرج، بجلی، ہوا، پانی
زمیں بھیگی، فضا پر ہول، ہر سُو دَورِ طوفانی

پپیہے کی صدائے درد آگیں شاخساروں میں
گھنیرے جنگلوں میں جا بجا جگنو کی تابانی

اُدھر کوئل کی رنگیں کوک لہراتی ہے رہ رہ کر
اِدھر جذبات پر ہوتی ہے پیہم برقِ اَرزانی

جھڑی برسات کی، جل تھل زمیں ہے، ابر گردوں پر
یہ کس کی یاد میں کی آسماں نے اشک افشانی

نظر سہمی سی، دل ڈوبا ہوا، اوسان وا رفتہ
کوئی ایسے میں سن لیتا نوائے سوز پنہانی

تلاشِ کوئے طیبہ ہے۔ اندھیرے دشتِ غربت میں
متاعِ بندۂ ناداز ہے بے ساز و سامانی

◎

عطا ہو ساقیا! تشنہ لبوں کو جامِ عرفانی
حریمِ نعت میں آئی نظر ہر چیز نورانی

نہ پوچھ اس دم مزا سوز و گدازِ شاعری ہم سے
درِ معنی پہ سجدہ ریز ہے لفظوں کی پیشانی

وفورِ بے خودی میں ہے نئے انداز سے پیہم
حریمِ حسن میں دستِ طلب کی پردہ جنبانی

تری ذات مقدس مبدأِ الطافِ بے پایاں
تری ذات مقدس منتہائے فضلِ ربانی

کھلا ہے صفحۂ قرآں ضیائے روئے انور میں
جبیں پر گیسوئے پرپیچ ہیں آیاتِ قرآنی

بیانِ والضحیٰ پیشانیِ سیمیں کے جلوے ہیں
ہے شرحِ سورۂ واللیل زلفوں کی پریشانی

تری آنکھوں کو ساقی! چشمۂ کوثر سے کیا نسبت
جو اک جنبش میں چھلکائیں ہزاروں جامِ عرفانی

◎

ابو بکر و عمر، عثمان و حیدر، واہ کیا کہنا
انھیں چاروں سے ہے آئینۂ ملت میں تابانی

قسم ہے گردشِ چرخِ کہن کے دورِ آخر کی
زمانہ لا نہیں سکتا ہے ان حضرات کا ثانی

بلال و بوذر وسلماں کے فاقہ مست چہروں پر
فدا دارا کی دارائی، سلیماں کی سلیمانی

کنیزیں ہیں گدایانِ شہِ ''الفقر فخری'' کی
شکوہ و شانِ فغفوری و کرّو فرِّ خاقانی

درِ محبوب تک کیوں کر پہنچ سکتا ہوں میں اطہرؔ[1]
نہ رہبر ہے کوئی اپنا، نہ منزل اپنی پہچانی

---

[1] بیاض خرد میں اول کے پانچ اشعار کے بعد یہ مقطع مولانا نے ارقام فرمایا تھا۔ بعد میں نظر ثانی کے وقت اس کا پہلا مصرع جس میں تخلص ہے قلمزد کر دیا تھا اور مصرع ثانی کو علیٰ حالہ باقی رکھا تھا۔ شاید کبھی موقع ملنے پر اس پہلے مصرع کی جگہ پر کوئی دوسرا بے تخلص مصرع کہہ کر اس کو بھی تشبیب کا شعر بنانے کا خیال تھا اور جب مزید اشعار بڑھا کر یہ قصیدہ مکمل کر لیتے تو بہت ممکن تھا کہ اس وقت مقطع کچھ اور ہوتا۔ میں نے اسی قلمزد مصرع کو بحال کر کے آخر میں بطور مقطع درج کر دیا ہے۔ (مرتب)
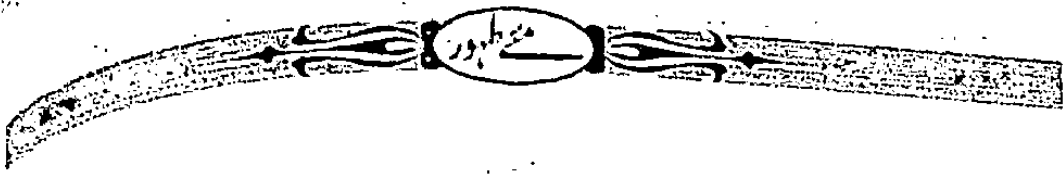
بہارِ مدینہ

نظر آرہا ہے دیارِ مدینہ
دیارِ محمد، جوارِ مدینہ

مرا دامنِ آرزو بھر رہا ہے
ثمربار ہے شاخسارِ مدینہ

برستے ہیں جلوے نگاہوں میں اپنی
کہ سرمہ بنا ہے غبارِ مدینہ

قطاریں کھجوروں کی راہِ اُحد میں
ہے کیا دلربا کوہسارِ مدینہ

سرِ شام گنبد کے نوری کلس پر
ہے جنت سے بڑھ کر بہارِ مدینہ

مجھے حاجتِ رنگ و بو کس لیے ہو
کھٹکتا ہے جب دل میں خارِ مدینہ

◎

مرے لب پہ کس کا یہ نام آرہا ہے
فضاؤں سے پیہم سلام آرہا ہے

مرے کارواں کی اذانِ سحر سے
محبت کا رنگیں پیام آرہا ہے

میں جنت میں ہوں یا کہ کنجِ قفس میں
خیالوں میں بیت الحرام آرہا ہے

اُدھر روئے روشن پہ زلفیں مچلتی
اِدھر صبح میں دورِ شام آرہا ہے

جھکی جارہی ہے ہر اِک شاخِ سدرہ
کہ مرکوب، خیر الانام آرہا ہے

دعا کیجیے شاہِ بطحا خدا سے
دعا کے لیے اِک غلام آرہا ہے

درِ ساقیِ جامِ کوثر پہ اطہرؔ
عطش العطش تشنہ کام آرہا ہے

بسوئے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

بینم بہ ہجرش برہم نظامے
در شام صبحے ، در صبح شامے

در صبح رویش شمسے درخشاں
شمسے چہ شمسے ، شمسے مدامے

در شام زلفش ، ماہِ مبارک
ماہے چہ ماہے ، ماہے تمامے

خطِ جبینش، تقدیر ہستی
لفظِ زبانش[1] ، مبرم پیامے

صدّیقؓ و فاروقؓ، عثمانؓ و حیدرؓ
در بند زلفش ، صید بدامے

اے شاہِ[2] عالم! باسوز فرقت
گوید سلامے ، ادنیٰ غلامے

از سوز[3] سینہ ، سوز د سفینہ
در بحر غربت اللہ اکبر

در گوشِ عزلت آید[4] چہ شورے
شور قیامت اللہ اکبر

طیر[5] محمد، صیدِ نصاریٰ
در دامِ نصرت اللہ اکبر

از تیر شیطاں در قلبِ ایماں
زخم نہایت اللہ اکبر

طوفِ مسلماں گردِ صنمہا
ایں چہ قیامت اللہ اکبر

رسوا زدست[6] مرد مسلماں
ناموس ملت اللہ اکبر

ہر[7] روز جنگے بر نامِ مذہب
نیر نگِ شامت اللہ اکبر

اقبالِ یورپ[8] بیند مسلماں
از چشمِ حسرت، اللہ اکبر

ہر دو صنم گر صوفی و مُلّا
گوریش بررو، گو سر بہ سجدہ

از نام فتویٰ ملت فروشی
و ز نام تقویٰ از غیر پردہ

اُمت پریشاں در راہ طیبہ
رہبر گرفتہ راہ کلیسا

حاضر درت ام یا رحمتِ کُل
با چشمِ تر با آہِ فسردہ[9]

امت[10] پریشاں آقا! دعا کن
بہرِ مسلماں آقا! دعا کن

نالاں[11] حضورت آہِ فسردہ
با چشمِ گریاں آقا! دعا کن

روزے[12] بہ پیشِ ربّ دو عالم
بہر غلاماں آقا! دعا کن

---

۱ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نمبر ترجمان الاسلام بنارس کے صفحہ ۳۷ اور قاضی اطہر نمبر ضیاء الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڑھ کے صفحہ ۱۲۴ پر "نطق بیانش، مبرم پیامے" ہے۔ مگر قاضی صاحب کی تحریر میں ایک پرزے پر "لفظ زبانش، مبرم پیامے" درج ہے۔ (مرتب)

۲ مذکورہ بالا دونوں نمبروں میں "فخر عالم" ہے۔ ۳ مذکورہ بالا نمبروں میں "درسوز سینہ" ہے۔

۴ مذکورہ بالا دونوں نمبروں میں "قید چہ شورے" ہے۔ ۵ مذکورہ بالا دونوں نمبروں میں نہیں ہے۔

۶ مولانا کی تحریر میں "رسوا کند خود مرد مسلماں" ہے۔ ۷ مولانا کی تحریر میں "ایں جنگ خونی مابین انساں" ہے۔

۸ مذکورہ بالا نمبروں میں نہیں ہے۔ ۹ مولانا کی تحریر میں نہیں۔

۱۰ و ۱۱ مذکورہ بالا دونوں نمبروں میں نہیں۔

۱۲ مذکورہ بالا دونوں نمبروں میں ہے: "بہر غلاماں آقا دعا کن"۔ "امت پریشاں آقا دعا کن"۔

غزلیں

◎

خلوتِ بے نیاز کو سلطنتِ شہی سمجھ[1]
بے خودیِ خودی میں ڈوب سِرِّ قلندری سمجھ

آہِ سحر کی قیمتیں دے نہ سکیں گے دو جہاں
سازِ شکستہ پر نہ جا، رازِ شکستگی سمجھ

ساحلِ اضطراب کیا، موجِ سکوں میں ڈوب جا
عشق کو برملا نہ کر، عظمتِ عاشقی سمجھ

عشق ہے بے خبر نہ ہو، نخلِ سکوں کی چھاؤں میں
بے خودیِ حواس کو، فرصتِ آگہی سمجھ

سودوزیاں کی کاوشیں، موت ہیں اہلِ عشق کی
کوششِ نامراد کو، حاصلِ زندگی سمجھ

عشق کا سانس سانس ہے، شرحِ ادائے بندگی
اپنی ہر اک شکست کو، حسن کی برتری سمجھ

---

[1] قاضی صاحب کی یہ پہلی غزل ہے۔ جو "اسرار" کے عنوان سے سہ روزہ "زمزم" لاہور کے شمارہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ (مرتب)

قلبِ وجگر کو چاک کر، خواہشِ التفات میں
پھر بھی اگر اثر نہ ہو، اپنے ہی میں کمی سمجھ

حسنِ نظر سے کام لے، غیر کا اعتبار کیا
حسنِ ایاز پر نہ جا، دیدۂ غزنوی سمجھ

یوں تو حیات نام ہے، سلسلۂ دراز کا
عشق میں پر لگتی ہے جو ، اُسی کو زندگی سمجھ

◎

دَرد سے آہ تک، آہوں سے فغاں تک پہنچے
خیر سے اب تو یہ مجبور یہاں تک پہنچے

اُن کے معصوم و حسیں، ابروؤ مژگاں کی قسم
خود ہمیں دل کو لیے، تیغ وسناں تک پہنچے

دل جو جلتا ہے تو، آنسو بھی امنڈ آتے ہیں
عشق کی آگ نہ کیوں، آبِ رواں تک پہنچے

صبح صحرا کو چلے تھے جو تلاشِ دل میں
شام کو مرحلۂ سود وزیاں تک پہنچے

اپنی منزل سے گئے، تھک کے جو ہمت ہارے
اور جو چلتے رہے، کون ومکاں تک پہنچے

اُن کا پیغام جو نفرت ہے، نہ پہنچے اُن تک
''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے''

موسمِ گل میں حسیں، لوٹ کی زد سے بچ کر
سخت مشکل ہے کوئی پھول خزاں تک پہنچے

◎

شرار بن کے آیئے، بہار بن کے آیئے
مگر چمن کے واسطے، نکھار بن کے آیئے

ہیں آپ زینتِ چمن، چمن میں آیئے حضور
جو گل نہ بن کے آسکیں، تو خار بن کے آیئے

اگر گلوں کے خون سے، ہو شادکام باغباں
تو پھر گلوں کے بھیس میں، شرار بن کے آیئے

ترازوؤں پہ مصلحت کی تولیے نہ ہوش کو
پکار پر نہ آیئے، پکار بن کے آیئے

غم والم کی فوج سے، مقابلہ ہے بزم میں
مسرتوں کے دوش کے سوار بن کے آیئے

چھٹے چھٹے معاملے بپا ہیں بزمِ عام میں
نگاہِ امتیاز میں غبار بن کے آیئے

شراب وجام و ساقی و خمار سب ہیں منتظر
شراب و جام و ساقی و خمار بن کے آیئے

قسم ہے زلف و خال کی، برائے آہوانِ نجد
شکار کو نہ آیئے، شکار بن کے آیئے

غمِ سکوت کے سبب، مسرتیں ہیں دم بخود
جو چھیڑ دے نوائے دل، وہ تار بن کے آیئے

◎

تمھاری یاد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں
ہم اپنے آپ کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں

ورائے ہوش، اِک عالم بنائے بیٹھے ہیں
تمھاری یاد میں خود کو بھلائے بیٹھے ہیں

ہم آرزو میں کسی موجۂ تجلّی کی
نگاہِ شوق میں طوفاں چھپائے بیٹھے ہیں

خدا نے لذّتِ الفت ہمیں کو کیوں بخشی؟
یہ رازِ درد سے ہم خود چھپائے بیٹھے ہیں

دل ونگاہ کو رہ رہ کے پھونکنے والے
ہم آج محفلِ ہستی سجائے بیٹھے ہیں

نسیم جاکے خبر کر، اُس آستانے کو
کہ آج شام سے سجدے جگائے بیٹھے ہیں

کہاں نظر ہے؟ کدھر دل ہے؟ کیا خبر؟ اطہرؔ
قبائے ہوش کے پُرزے اُڑائے بیٹھے ہیں

۵

محبت جس کو راس آئی، مبارک ہو مبارک ہو
اُدھر تو اب بھی سرگرمِ جفا معلوم ہوتی ہے

مسرت ان کے آنے کی ہے، دل بیٹھا سا جاتا ہے
خوشی دیباچۂ رنج وبلا معلوم ہوتی ہے

گلستاں میں بہار آئی کہ اِک دورِ نفاق آیا
گلِ اخلاص میں، بوئے ریا معلوم ہوتی ہے

تعالی اللہ عالم میں ہمہ گیری محبت کی
کوئی کہہ دے نہ الفت ہی خدا معلوم ہوتی ہے

کبھی جب غرق ہوجاتا ہوں، اطہرؔ اپنے شعروں میں
بہت ہی دور رس طبعِ رسا معلوم ہوتی ہے

◎
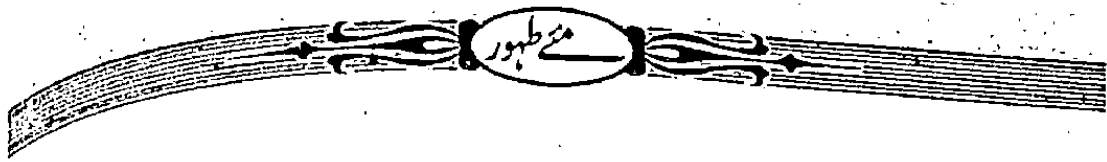
جن کے سائے میں نیند آتی ہے
وہ ستارے نظر نہیں آتے

آنے والے تو روز جاتے ہیں
جانے والے نظر نہیں آتے

جن کو یادِ وطن بھی ٹھکرادے
بھول کر بھی وہ گھر نہیں آتے

جن کو دانہ قفس کا راس آیا
راس انھیں بال وپر نہیں آتے

اے جنوں کون سی یہ منزل ہے
ساتھ کیوں ہم سفر نہیں آتے

زباں خاموش، نغمہ چپ، ہنسی سہمی، نظر سونی
جو دِل ویراں ہوا، تو ہوگئی ساری ڈگر سونی

سبو پر، جام پر، مے پر، نشہ پر خواب چھایا ہے
نہ میخانے میں گزری تھی کبھی ایسی سحر سونی

نہ نغمے تھے، نہ نالے تھے، نہ زنجیروں کی جھنکاریں
ادا کرتے تھے دیوانے ترے رسمِ سفر سونی

جو ہم آئے تو نغماتِ حسیں سے بھر گیا صحرا
وگرنہ حشر تک رہتی یوں ہی یہ رہ گزر سونی

نہ اس میں شورشِ جلوہ، نہ اس میں دید کی گرمی
نہیں معلوم نظّارہ ہے سونا، یا نظر سونی

نہ ساحل ہی کے نغمے ہیں، نہ طوفانوں کے ہنگامے
پڑی ہے مدّتوں سے، یوں ہی موجِ چشمِ تر سونی

میں نغمہ چھیڑ سکتا ہوں، مگر انجام کیا ہوگا
مرے نغموں کے ہوتے بھی ، رہی محفل اگر سونی

سکوتِ مصلحت آمیز، کب تک اے جنوں کارو!
مبادا ہو نہ جائے محفلِ روح ونظر سونی

طیورِ گلستاں نے پیچ کھایا نغمہ ولے کو
وگرنہ یوں نہ ہوجاتی فضائے بال وپر سونی

حدیثِ حسن برپا تھی، جہاں آٹھوں پہر اطہرؔ
وہی محفل رہا کرتی ہے اب آٹھوں پہر سونی

◎

وہ رنگیں جام دے جو ہوش کو بیکار کر جائے
بعنوانِ دگر، احساس کو بیدار کر جائے

بہارِ بوئے کہنہ سے ہے شرمندہ گلِ تازہ
نئے سر سے کوئی، پھر بندشِ گلزار کر جائے

مرے ذوقِ طلب کو راس ہے تلخیِ محرومی
وہ لطفِ جام کیا، جو خوگرِ آزار کر جائے

اُفق سے سرخیاں اٹھتی ہیں، تارے مسکراتے ہیں
ارے اِن سونے والوں کو، کوئی بیدار کر جائے

نہ گل اپنا، نہ خار اپنا، تو پھر اطہر گوارا ہے
کوئی آ کر گلستاں پر مرے یلغار کر جائے
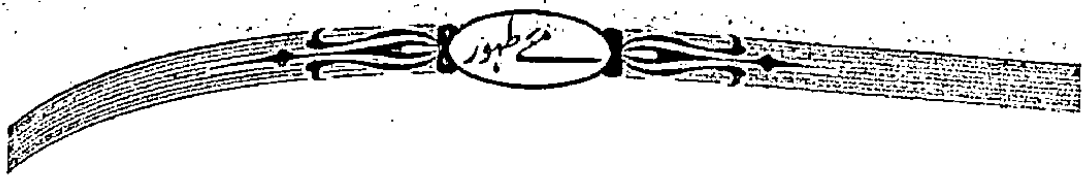
مجھ کو رنگیں خیال نے مارا
آرزوئے وصال نے مارا

آہ دامن بچا کے مقتل میں
اُس قیامت کی چال نے مارا

تلخیِ موت ہم تو سہہ لیتے
ایک شیریں مقال نے مارا

جامِ جم نے جہاں کو مارا ہے
مجھ کو جامِ سفال نے مارا

دِل نہ تڑپا ذرا مثالِ صید
ناوکِ بے مثال نے مارا

تیغِ ابرو کا نام ہے ورنہ
سازشِ خدّ وخال نے مارا

اہلِ کشتی کو بیچ دھارے میں
ناخدا کے خیال نے مارا

کس قدر پرجلال ہیں وہ لوگ
جن کو ان کے جمال نے مارا

اس کے مرنے کا بھی جواب نہیں
جس کو دستِ سوال نے مارا

جاں بلب تشنگانِ الفت کو
مژدۂ برشگال نے مارا

آہ میری حسیں امیدوں کو
میرے انور[1] جمال نے مارا

[1] صاحبزادہ مولانا قاضی اطہر۔

◎

اِک نشانی کوئی چھوڑ جاؤ
شمع ہو ، روشنی چھوڑ جاؤ

اپنی سوغات ہی چھوڑ جاؤ
چاند ہو چاندنی چھوڑجاؤ

میری قسمت نہ ہو بے سہارا
زلف کی تیرگی چھوڑ جاؤ

بزمِ فرقت کی رونق رہے گی
کچھ ذرا سادگی چھوڑ جاؤ

دل یہ بستی تمھاری ہے اس کو
یوں نہ اجڑی ہوئی چھوڑ جاؤ

میری روتی ہوئی بزمِ جاں میں
کچھ تو اپنی ہنسی چھوڑ جاؤ

ناتوانی وہ بارِ حیاء کی
چشمِ بیمار کی چھوڑ جاؤ

چین کردوں خوشی سے حوالے
تم اگر بے کلی چھوڑ جاؤ

اِک نظر دیکھ لو جاتے جاتے
اِک شگفتہ کلی چھوڑ جاؤ

◎

اسلام اسے زیبا ہی نہیں ، فرعون کو جو شرما نہ سکے
جو وار کے نازک لمحے میں، توحید کا نغمہ گا نہ سکے

اے شمعِ ہدیٰ کے پروانو! گیسوئے نبی کے دیوانو!
دعوائے محبت وہ بھی کیا، جو ہونٹ سے آگے جا نہ سکے

قرآن کی دولت جا بھی چکی، ایمان کا سودا ہو بھی چکا
ہم دست نگر دنیا کے بنے، اللہ کا سودا پا نہ سکے

وہ عہدِ کہن، وہ دورِ چمن، یاد آئے بھی تو اب یاد نہ کر
اس وقت پہ رونا لاحاصل، جو وقت کبھی بھی آ نہ سکے

کلیوں سے کہو ہرگز نہ کھلیں، پھولوں سے کہو اب نہ مہکیں
کیا ایسے گلستاں سے حاصل، جب ہم ہی ترانہ گا نہ سکے

اس دور کی جدّت کیا کہنا، یہ بزم نئی یہ جام نیا
اس دور کی رنگیں پیالی میں، پہلی سی وہ لذّت پا نہ سکے

وہ صبحِ مسرت جاگ اٹھی، گلشن میں پیامِ نو آیا
پربت پہ اٹھی ہے ایسی گھٹا، توبہ بھی جہاں راس آ نہ سکے

◎

وہی یہ سرزمیں ساقی، وہی یہ آسماں ساقی
تو پھر بدلا ہوا ہے کس لیے، یہ دَرمیاں ساقی

شکستہ جام، گُل شمعیں، ہیں محوِ خواب بادہ کش
بہت پُر درد ہے یہ آخری شب کا سماں ساقی

ترے میکش کبھی تھے، میکدہ بردوش دنیا میں
مگر ہیں آج کل تشنہ لبی سے نیم جاں ساقی

وہ کوئی دور تھا، جب موجبِ عزت تھا سِیْمَاھُم
مگر اب باعثِ ذِلّت ہے سجدوں کا نشاں ساقی

ترے بادہ کشوں کے خون سے ہیں محفلیں رنگیں
تری بے اعتنائی کا ہے، منظر خون فشاں ساقی

اسیرِ حلقۂ قوم ووطن ہے دیدۂ مومن
بپا ہے میکدے میں، امتیازِ این وآں ساقی

جبینوں کی یہ محرومی نہیں، تو اور کیا شے ہے؟
کہ تیرے ایک کعبے میں بنے دو آستاں ساقی

مرے دل کی بھری محفل لٹی، اکھڑی، پھنکی، بکھری
یہی ہے حاصلِ آزادیِ ہندوستاں ساقی

زمانہ گو نہ سمجھے، پر تری رحمت سمجھتی ہے
کہ کیا ہے؟ مدّعائے بندگانِ بے زباں ساقی

اثر ہے مضمحل جس کی جدائی میں زمانہ سے
عنایت ہو مجھے ایسا، کوئی رنگِ فغاں ساقی

مجھے پہنچا دیا اپنوں نے غم کی ایسی محفل میں
جہاں رہتا نہیں، ''در دِل حسابِ دوستاں'' ساقی

◎

ہمیں اس بات کا دعویٰ نہیں کہ ہم نہیں پیتے
مگر اتنا تو کرتے ہیں کہ بے موسم نہیں پیتے

ہمیں پینے سے کب انکار ہے، ہر دم نہیں پیتے
مگر جب بیٹھ جاتے ہیں، کسی سے کم نہیں پیتے

طبیعت آگئی تو پھر کسی موسم کی کیا حاجت
طبیعت جب نہیں آتی، کئی موسم نہیں پیتے

درِ کعبہ پہ ہم نے پی لیا تو کیا قباحت ہے
وہیں پر آپ کیا در پردۂ زمزم نہیں پیتے

نہ پیتے ہوں سرِ میخانہ لیکن کیوں کہے اطہر
یہ ذِمّہ کون لے کہ قبلۂ عالم نہیں پیتے

◎

مسرت کی کہانی یا الم کی داستاں کہیے
یہاں جو کچھ بھی کہنا ہے بہ اندازِ فغاں کہیے

کشش کھینچے لیے جاتی ہے، ان کی جانبِ منزل
انھیں روندے ہوئے ذرّوں کو میرِ کارواں کہیے

گزرتی ہے گراں اتنی بھی سبکی طبعِ غیرت پر
سرِ ساحل نہ ہم طوفانیوں کی داستاں کہیے

حدودِ خامشی میں آگیا، راہی تکلّم کا
نگاہِ واپسیں سے الوداعِ دوستاں کہیے

خود اپنی بزم پیدا کیجیے اور داستاں اپنی
یہ بزمِ غیر میں کب تک حدیثِ دیگراں کہیے

مقیدِ زندگی، احساسِ گم اور بند بینائی
قفس والوں سے کیا حالِ فراقِ آشیاں کہیے

ابھی تو ابتداء ہے داستانِ درد کی اطہؔر
نہ گھبرا کر ابھی سے الحفیظ والاماں کہیے

◎

صبر ہو اس سے آگے کہاں تک
ہو گئی دِل سے باغی زباں تک[1]

ہائے رے ان کی نازک خرامی
فرش ہونے لگا آسماں تک

دل کے ٹکڑے تو دامن تک آئے
بات دل کی نہ آئی زباں تک

لے گئی اِک جھلک سرخوشی کی
تیرگیِ غمِ جاوداں تک

ذکر مژگاں نہ چھیڑو وگرنہ
بات پہنچے گی تیغ وسناں تک

ہائے نکلا تھا جب روٹھ کر میں
تم نے آواز دی تھی کہاں تک

---

[1] یہ غزل ''مئے طہور'' کے زیرِ عنوان ۲۸ رفروری ۱۹۵۴ء کو روزنامہ انقلاب بمبئی میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں مطلع یوں تھا: ہوگئی دل سے باغی زباں تک صبر ہو اس سے آگے کہاں تک (مرتب)

موت کے ایک لمحہ سے ڈر کر
کون پچھتائے عمرِ رواں تک

پہلی منزل پہ چھوڑا خرد نے
ساتھ دے گا جنوں بھی کہاں تک

عام حسنِ فریبِ نظر ہے
دیکھتا ہوں جہاں سے جہاں تک

اُن جبینوں پہ سجدے ہیں قرباں
جن کے سجدے گئے آستاں تک

اپنی کاوش کو ہر ایک پہنچا
کوئی پہنچا نہ رازِ نہاں تک

کیوں نہ چومے قدم ان کے منزل
خضرِ منزل ہیں جن کے نشاں تک

کون پھر آئے سننے سنانے
ہے یہ محفل مری داستاں تک

یہ جبیں کی رسائی عبث ہے
گر نہ سجدے گئے آستاں تک

سہہ لیا میں نے وہ بارِ الفت
جس سے تھرّائے کون ومکاں تک

گل تو ہنس دے مگر کس کا ذِمّہ
بات پہنچی اگر باغباں تک

چار تنکوں کی ہمت تو دیکھو
اُڑ گئے خود ہی برقِ تپاں تک

سر کی بازی نہیں ختم سر پر
ہارنی پڑتی ہے اس میں جاں تک

راز کہتا ہے وہ جرمِ سنگیں
جس پہ کٹتی ہے اطہر زباں تک

◎

نہ ضبط باعثِ تسکیں، نہ چین ماتم سے
گزر رہا ہوں نہ جانے، یہ کس رہِ غم سے

چمن کو چھوڑ کے کانٹوں کو گلستاں کرنا
معاہدہ ہے محبت کا ابنِ آدم سے

ہو بزمِ شام وسحر یا جہانِ شمس وقمر
نظامِ جذب وکشش سب میں ہے مرے دَم سے

نہ اس جہاں کی محبت، نہ اس جہاں کی طلب
مرا مقام تو آگے ہے دونوں عالم سے

خرد کی بات یہاں کون سن سکے اطہر
گزر رہا ہے یہ عالم جنوں کے عالم سے

◎

کہتی ہے ہر اک جنبشِ زنجیرِ محبت
پابندیِ تسلیم و رضا میرے لیے ہے

کیا کم ہے مرے فخر کو ان کا یہ تخاطب
وہ جو بھی کہیں آج بجا میرے لیے ہے

جز پیرویِ رسمِ محبت نہیں چارہ
آوازِ کہن بانگ درا میرے لیے ہے

حتمی ہے پہنچنا یوں ہی منزل پہ بھٹکتے
جب جادۂ منزل کی بناء میرے لیے ہے

گر ان کے لیے ہوں میں کونین کی دولت
سب میرے لیے ہے بخدا میرے لیے ہے

گھبرا نہیں سکتا ہوں مصیبت سے، بلا ہے
جب دِل ہے تو سوز و بلا میرے لیے ہے

میرے ہی سبب روشنیِ شمعِ ازل ہے
فانوسِ محبت میں جلا میرے لیے ہے

صد فخر ہے، صد ناز ہے مجھ کو سرِ محشر
گر میرا خدا مجھ سے خفا میرے لیے ہے

رحمت نے پکارا مجھے بے مایہ سمجھ کر
یہ میرے گناہوں کا صلہ میرے لیے ہے

لمحاتِ سکوں موت ہیں میرے لیے اطہرؔ
طوفانِ حوادث میں بقا میرے لیے ہے

◎

اسلام کے چاہنے والوں نے اسلام کو کیا برباد کیا
اللہ و محمد کو چھوڑا، اصنام سے دل آباد کیا

صدیق پہ میں قرباں جاؤں، فاروق کے صدقے دل میرا
یوں نام تو ان کا لیتے ہو، پر دل سے کبھی بھی یاد کیا؟

ملّا کی نگاہیں دولت پر، زاہد کی عبادت بہرِ زر
مسٹر کو جو موقع ہاتھ آیا، اک دین نیا ایجاد کیا

اسلام کی جنسِ الفت کو آپس کے تعصب نے لوٹا
مسلم نے نگاہِ رحمت کو، شمشیرِ کفِ جلّاد کیا

اِس قوم سے بجھتی ہیں پیاسیں، شمشیرِ غلامی کی اطہرؔ
قانونِ خدا سے اپنے کو، جس قوم نے بھی آزاد کیا

◎

نسیمِ صبح میں خوابِ گراں معلوم ہوتا ہے
بوقتِ صبح انجامِ فغاں معلوم ہوتا ہے

لگا دی آگ سی گلشن میں اِک فصلِ بہاری نے
رگِ گل میں نہاں دورِ خزاں معلوم ہوتا ہے

یہ میرا ذوقِ بینش ہے، کہ لطفِ برق پیہم ہے
ہر اِک شعلہ میں عکسِ آشیاں معلوم ہوتا ہے

مچلتی ہیں جبینِ نور پر گمراہیاں جس کی
وہی ذرّہ دلیلِ کارواں معلوم ہوتا ہے

معطل ہے نظامِ حسنِ خودسر آستانوں میں
جبینِ عجز پر خوابِ گراں معلوم ہوتا ہے

جلایا جارہا ہے کیا فلک پر خون بھی اطہرؔ
شفق کی سرخیوں میں کچھ دھواں معلوم ہوتا ہے

◎

ہزاروں راہ مجھ پر کھل گئیں مجبوریِ دِل سے
کہیں آگے نکل جاؤں نہ اے دِل حدِّ منزل سے

کچھ ایسی پھر رہی ہے آنکھ میں تصویر رنگیں سی
ابھی گویا نکل کر آرہا ہوں ان کی محفل سے

سفینہ گِھر کے نکلا ہے ابھی موجِ حوادث میں
یہ کیوں گھبرارہا ہے نا خدا آثارِ ساحل سے

بڑی شے ہے جہاں میں ہم نشینو! دل کی خودداری
ہزاروں ذلّتیں بہتر ہیں اک رسوائیِ دل سے

یہ صحرا کی جبیں پر شام کی بیتاب رنگینی
کسی نے مسکرایا ہے شفق کے سرخ محمل سے

ضرورت ہے ابھی مضرابِ تیغ دست قاتل کی
ابھی تسلیم کی لے آرہی ہے سازِ بسمل سے

لبِ زخمِ جگر پر کچھ تبسّم تھرتھراتا ہے
ابھی گزرا ہے کوئی مسکراتا کوچہٗ دِل سے

خدا سالم رکھے اطہر گراں بارِیِ طوفاں کو
میں ٹکرانے نہیں جاتا سبکسارِیِ ساحل سے

◎

سماں آئی ہے دِل سے شدّتِ نالہ نگاہوں میں
سکوتِ شام آجائے نہ ہنستی صبح گاہوں میں

قفس میں کررہاہوں تذکرہ انجامِ گلشن پر
اتر آئی ہے جب سے کائناتِ گل نگاہوں میں

مجھے ڈر ہے نہ لٹ جائے سحر کو کاروانِ شب
ستاروں کی قطاریں ہیں ابھی تاریک راہوں میں

ابھر آتی ہیں نبضیں آرزو کی شدّتِ غم سے
نگاہِ یاس کھو جاتی ہے جب منزل کی راہوں میں

عذابِ دردناک آیا گنہگاروں کی بستی پر
یہ ہلچل سی مچی ہے کس لیے ان بے گناہوں میں

ہوا جاتا ہے اندیشہ یقینِ شورِ میخانہ
کہیں سنسانیاں گونجیں نہ ویراں خانقاہوں میں

یہ عقدہ حل ہوا جاتا ہے لو اٹھتا ہوں محفل سے
اندھیرا چھا گیا اک بارگی کیوں جلوہ گاہوں میں

مرا قاتل ہی کچھ سمجھے گا ہمدم فلسفہ اس کا
دھواں کیوں اٹھ رہا ہے آج میری سرد آہوں میں

جو لطفِ زندگی پایا ہے میں نے فقر وفاقہ میں
تصور اس کا ہو سکتا نہیں ہے کج کلاہوں میں

جہاں والے اماں دیتے نہیں جب اہلِ غیرت کو
پناہیں ڈھونڈ لیتے ہیں وہ جا کر بے پناہوں میں

مری ہستی نگاہِ غیر میں ہو خوار ناممکن
ہوا جاتا ہوں گم اطہر میں خود اپنی نگاہوں میں

◎

حدیثِ لبِ آرزو سن رہا ہوں
بڑے کام کی گفتگو سن رہا ہوں

وہی کیف کے دن وہی مست راتیں
وہی تذکرے چار سو سن رہا ہوں

ترانے محبت کے صحنِ چمن میں
پسِ پردۂ رنگ و بو سن رہا ہوں

مجھے زہد و تقویٰ سے انکار کب ہے
ذرا وعظِ جام و سبو سن رہا ہوں

وہ کہتے ہیں اطہرؔ مجھے بھول جاؤ
خدایا یہ کیا گفتگو سن رہا ہوں

◎

جو آزاد سا ہے غمِ عاشقی سے
بہت دور ہے مرکزِ زندگی سے

وہ غم جس سے تھرّا گئی بزمِ الفت
کیا میں نے منظور اس کو خوشی سے

خرد سے کوئی کہہ دے اے خضرِ منزل
یہ منزل ہے آگے حدِ آگہی سے

شریکِ زمانہ ہوں شکوے میں لیکن
ہے اوروں کو ان سے، مجھے اپنے جی سے

کسی رشکِ مہ کی معیت میں شب کو
مین کھیلا ہوں برسوں اسی چاندنی سے

ہے کہنے کو اپنی مگر اپنی ہستی
ہے کچھ اور آگے حدِ بے بسی سے

◎

دلِ پُرسوز کو جنت بداماں کرتا جاتا ہوں
قفس میں آج پھر ذکرِ گلستاں جاتا ہوں

فضائے غم پہ چھائی ہیں گھٹائیں دیدۂ تر کی
بطرزِ نو بہارو! ابر وباراں کرتا جاتا ہوں

مجھے فطرت شناسی دی نظر کے دینے والے نے
برنگِ خود ہر اِک قطرہ کو طوفاں کرتا جاتا ہوں

یہ میرا ظرفِ عالی اور یہ کم ہمتی میری
میں شرماتا ہوا شرحِ بیاباں کرتا جاتا ہوں

خدا کا شکر اطہرؔ باوجود اس بے نوائی کے
مذاقِ شاعری کو اور تاباں کرتا جاتا ہوں

◎

مرے دل میں حسیں سی بے کلی معلوم ہوتی ہے
ابھی دو چار چنگاری دبی معلوم ہوتی ہے

یوں ہی لحظہ بہ لحظہ تو قتیلِ ناز کرتا جا
مجھے ہر وار میں اِک زندگی معلوم ہوتی ہے

خدا جانے وفورِ درد کو سمجھا ہے کیا میں نے
مجھے ہر گریۂ غم میں ہنسی معلوم ہوتی ہے

وفورِ گرمیِ الفت کو مدّت ہوگئی لیکن
ابھی تک آگ سی دل میں لگی معلوم ہوتی ہے

جو چمکی تھی گلستاں میں شرارِ برق کی صورت
قفس میں بھی وہی تو روشنی معلوم ہوتی ہے

جب آدھی رات کو بیتاب ہو جاتا ہے دل اطہرؔ
شریکِ درد میری شاعری معلوم ہوتی ہے

کشتی سے کھیلتے نہ کناروں سے کھیلتے
ہم بحرِ بے کنار کے دھاروں سے کھیلتے

جلووں سے کھیلتے، نہ نظاروں سے کھیلتے
ہم کاش گل کو چھوڑ کے خاروں سے کھیلتے

صحنِ چمن میں ہم بھی نشیمن کے سامنے
شعلوں سے کھیل لیتے، شراروں سے کھیلتے

دم گھٹ رہا ہے فطرتِ خود داری کا مری
تیرے چمن میں تیری بہاروں سے کھیلتے

شمشیر کل لرزتی تھی جن کی نگاہ سے
وہ آج ہیں نگاہ کے واروں سے کھیلتے

جن کے دل ونگاہ میں رقصاں تھی زندگی
وہ تھک کے رہ گئے ہیں مزاروں سے کھیلتے

ذرّوں کی روشنی پہ مریضانِ ذوقِ خام
ہوتے نہ مطمئن تو ستاروں سے کھیلتے

اطہرؔ ہجومِ جلوۂ رنگیں کے باوجود
بیتی ہے اپنی رات ستاروں سے کھیلتے

◎

مری زندگی لو لگانے میں گزری
مری زندگی اِک فسانے میں گزری

نہیں جس کا آغاز وانجام کچھ بھی
مری زندگی اس فسانے میں گزری

زبان وقف ذکروجبیں وقف سجدہ
مری زندگی آستانے میں گزری

جوانی کی راتیں محبت کا عالم
مری زندگی کس زمانے میں گزری

کبھی سوئے زنداں، کبھی سوئے صحرا
مری زندگی آنے جانے میں گزری

نہ جانے خوشی کی جھلک کو بھی اطہرؔ
مری زندگی کیوں رُلانے میں گزری

◎

رنگ و بو، غنچے، شگوفے، چاند، تارے ہنس دیے
تم چمن میں کیا ہنسے، سارے نظارے ہنس دیے

آج اس انداز سے ظالم نے دیکھا ہے مجھے
میں تو کیا جینے کے تھے جتنے سہارے ہنس دیے

ہوچکی اپنی سحر، پھر سو چکے ہم آج رات
دیکھ کر بے خواب نظروں کو، ستارے ہنس دیے

رونے والوں کو کہاں فرصت ہنسی کی تھی مگر
آپ کے نازک تبسّم کے سہارے ہنس دیے

دور ہی سے یوں نظر ڈالی کہ سانسیں رُک گئیں
یوں قدم رنجہ ہوئے کہ دِل کے پارے ہنس دیے

سرد آہیں، گرم آنسو، چاک داماں، تنگ جاں
اس بساطِ زیست پر ہم غم کے مارے ہنس دیے

حال کی محفل میں بھی سمجھے نہ وہ نظروں کی بات
ان کی ناسمجھی پہ ماضی کے اشارے ہنس دیے

جا پڑے تھے جانے کس عالم میں اطؔہر بھول کر
روتے روتے جانے کیوں ہم غم کے مارے ہنس دیے

◎

میں دنیا بھر کی آزادی کا ارماں لے کے آیا ہوں
مسلماں ہوں میں اوسانِ مسلماں لے کے آیاہوں

بسر کرتا ہوں اپنی زندگی اپنے سہارے پر
میں اپنے بازوؤں میں زورِ ایماں لے کے آیاہوں

مجھے غرہ نہیں ہے ساحلِ محراب ومنبر پر
جبینِ عجز میں سجدوں کا طوفاں لے کے آیا ہوں

مجھے وحشت سی ہوتی ہے اندھیری خانقاہوں سے
میں اپنی بزم میں تنویرِ ایقاں لے کے آیا ہوں

جہاں میں بے نیازِ رنگ و بو ہے طائرِ بطحا
میں اپنے آشیانے میں گلستاں لے کے آیا ہوں

مری محفل کو دلچسپی نہیں فرسودہ قصوں سے
احادیثِ نبی، آیاتِ قرآں لے کے آیا ہوں

درِ ظلمت کدہ پر ٹھوکریں کھاتا نہیں اطہرؔ
میں پیشانی میں اپنی ماہِ تاباں لے کے آیا ہوں

یہ میرا ظرف ہے زنداں میں لایا ہوں بیاباں کو
بیاباں میں بھی اے اطہر میں زنداں لے کے آیا ہوں

۵

ساغر، رنگ، بو، جام، مے، چاند، تارے
کمی ہے تمھاری ہیں سارے نظارے

جو بے وجہ تیری گلی میں گزارے
بڑے کام کے تھے وہی دن ہمارے

سفینہ ہوا نا خدا اور کنارے
یہ سارے سہارے ہیں تیرے سہارے

تم آؤ تو ڈوبیں تم آؤ تو ابھریں
فلک کے نظارے، سحر کے ستارے

بہرحال جینا تھا رو کر کہ ہنس کر
بہرحال جینے کے دن تو گزارے

کھلی ہے زباں اور مقفل ہیں نغمے
قفس کے زمانے چمن میں گزارے

کنارے بنائے ہیں طوفاں میں ہم نے
کنارے بھی کرنے لگے جب کنارے

رہے خانۂ غم کی دنیا سلامت
اگائے ہیں ہم نے کئی چاند تارے

وہ آنکھوں کے بیمار، ہم دل کے اطہر
وہ اپنے سے ہارے، ہم اپنے سے ہارے

◎

خودی نے بخشا ہے عشق میں وہ مقام دل کو نظر سے پہلے
کہ آہ تک ناروا ہے ہم کو، کسی کے غم میں اثر سے پہلے

اسی کی تعمیر بے نیازِ حدود ہے عشق کی زمیں پر
گرائی بنیادِ ہوش جس نے یہاں شعور ونظر سے پہلے

فلک کے تارو! ذرا بتاؤ، زمیں کے پھولو! یہ راز کھولو
کسی نے جھیلی بھی ضربِ الفت، خوشی سے قلبِ بشر سے پہلے

یہ مست آنکھوں کا ہے کرشمہ، کہ عشق بیباک کا تقاضا؟
جگر نے نشتر طلب کیا ہے، اساسِ دردِ جگر سے پہلے

غم والم کی سیاہ راتوں میں، داغہائے جگر کی ضو سے
سحر کے ہنگام کا ہے عالم، نمودِ نورِ سحر سے پہلے

ہے سجدۂ بے ریا کا جذبہ، متاعِ کون ومکاں سے بڑھ کر
کہ وجد میں آکے جھوم اٹھا، کسی کا در میرے سر سے پہلے

گواہ تابانیِ ابد ہے، ازل کے دیباچۂ نمو میں
تجلیاں منتشر تھیں لاکھوں، نمودِ شمس وقمر سے پہلے

قفس میں جی لگ رہا ہے لیکن، قفس کی میعاد کچھ نہیں ہے
تسلیاں دے رہا ہے کوئی، مجھے غمِ بال وپر سے پہلے

خدا نے تیرے مریضِ الفت کی آخری وقت لاج رکھ لی
کہ روح روحوں میں جا ملی ہے، کشاکشِ چارہ گر سے پہلے

سزا وفا کی جو پا رہا ہے، تو شکوہ کس واسطے ہے اطہر
کہ ارتکابِ گناہِ دل ہے ترا گناہِ نظر سے پہلے

◎

کس نے کہا ہے آپ کو ظلم و ستم روا نہیں؟
جو بھی کریں، ہے سب رَوا، شکوہ مجھے ذرا نہیں

دعوائے عشق اور پھر آپ سے میں خفا رہوں؟
آپ خفا رہا کریں میں تو کبھی خفا نہیں

ان کی وفا بھی دیکھ لی آہِ رسا بھی دیکھ لی
یہ بھی میری دوا نہیں وہ بھی میری دوا نہیں

ہوش کو خیر باد کر، کوششِ نا مراد کر
عشق میں فکرِ ماسوٰی ،حاصلِ ماسوٰی نہیں

سمٹی ہے دل میں کائنات ، چھایا ہوں کائنات پر
بے خودیِ حواس میں، کچھ بھی مجھے پتا نہیں

کیوں نہ ہو اضطرابِ غم، عالمِ ہوش پر گراں
نالۂ دل فگار ہے، نغمۂ دلربا نہیں

سجدے اگر بہک گئے، کیفیت نماز میں
میری جبین شوق کو، دعوائے اتقا نہیں

عیش و نشاطِ دہر کیا، دونوں جہاں بھی اے خدا!
میری نظر میں ہیچ ہیں، تو ہی اگر مرا نہیں

صبح نمودِ حسن میں، شام فراقِ عشق ہے
عالمِ حسن و عشق میں صبح نہیں مسا نہیں

جذبۂ احترام نے، دی نہ مجال گفتگو
اس نے بھی کچھ کہا نہیں، میں نے بھی کچھ کہا نہیں

نالۂ اطہرِ حزیں، کس کے لیے ہے بے قرار
عشق کے درد مند کا، دنیا میں کیا خدا نہیں

◎

وہ وقت بھی تھا کہ دونوں ہلاکِ تیغِ ستم رہے ہیں
مگر اب اپنی وفا پہ قائم نہ وہ رہے ہیں، نہ ہم رہے ہیں

بجا کہ اب دور ہو چکے ہیں، کشاکشِ زندگی سے لیکن
وہ میری آغوشِ آرزو میں، بہت خدا کی قسم رہے ہیں

دلِ طلب کیش میں بمشکل حقیقتوں کو جگہ ملے گی
کہ میرے اس کعبۂ وفا میں، بہت دنوں تک صنم رہے ہیں

تری محبت کے دعویداروں میں گو ہزاروں تھے آگے آگے
مگر کبھی امتحاں ہوا ہے تو ہم ہی ثابت قدم رہے ہیں

سر و رو غم کی جدا ہیں راہیں، کہ ایک نغمہ ہے ایک نالہ
مگر محبت کی تلخیوں میں ندیم دونوں بہم رہے ہیں

وہاں شکنجہ میں زندگی تھی، یہاں ہے حلقوم زیرِ خنجر
کہ ہو کے آزاد ہم قفس سے، اسیرِ دامِ کرم رہے ہیں

شعور و احساس پھوٹ نکلا، ہے توڑ کر بندشِ زمانہ
قفس میں محسوس کر رہا ہوں، کہ بال و پر میرے جم رہے ہیں

ہزاروں دنیا نے رنگ بدلے مگر نہ اپنا مقام بدلا
نشاط کی انجمن میں رہ کر بھی ہم اسیرِ الم رہے ہیں

وفا کے دل پر ہزار چرکے دیئے جفا نے طرح طرح کے
مگر رہِ جستجو میں آگے ترے شکستہ قدم رہے ہیں

گزر گیا وہ حسیں زمانہ کہ جب جوابِ وفا وفا تھی
اب آ گیا ہے وہ دَور جس میں وفا کے امکان کم رہے ہیں

ادھر تو گزری ہے عمر اطہرؔ، خودی کی آزاد خلوتوں میں
وہ اور ہوں گے جو انجمن میں اسیرِ جاہ و حشم رہے ہیں

◎

تمنا مسکرائی زندگانی کو ہنسی آئی
نگاہیں فرشِ رہ ہونے لگیں کس کی گلی آئی

ہماری بزم سے دامن کشاں وہ چاند ہے لیکن
ہماری شامِ غم میں خود مچل کر چاندنی آئی

وہ گویا یوں ہوئے کہ سارا گلشن ہو گیا نغمہ
ہوئے خاموش یوں کہ وجد میں ہر ہر کلی آئی

نگاہیں روح کو بھی دعوتِ پرواز دیتی ہیں
دمِ آخر مری آنکھوں میں کیسی روشنی آئی

خیالِ روئے تاباں میں بہت کی چاک دامانی
مگر جوشِ جنوں کو راس آخر خامشی آئی

نظر ڈالی جو اطہرؔ آج میں نے جیب وداماں پر
مجھے خود حال پر اپنے نہ جانے کیوں ہنسی آئی

◎

وہ رنگیں ملاقات یاد آ رہی ہے
برستی ہوئی رات یاد آ رہی ہے

وہ کالی سی زلفیں، وہ بکھرے سے افشاں
ستاروں بھری رات یاد آ رہی ہے

فراموش کرنے لگا ہوں میں خود کو
پرانی کوئی بات یاد آ رہی ہے

وہی رنگ و بو اور وہی کیف و مستی
وہی چاندنی رات یاد آ رہی ہے

نہ چھیڑے میرے آنسوؤں کو سحر بھی
لگاتار برسات یاد آ رہی ہے

بتائے کوئی جب بھلاتا ہوں اُن کو
تو کیوں اُن کی ہر بات یاد آ رہی ہے

وہ اطہرؔ سحر کے حسیں جھٹپٹے میں
کسی کی ملاقات یاد آ رہی ہے

◎

بالآخر یک بیک خود جل اُٹھی بزمِ شباب اپنی
یہ کس شعلے پہ ٹھہری ہے نگاہِ انتخاب اپنی

وفورِ تشنگی نے رکھ لیا تیرا بھرم ساقی
ترے ساغر میں پی لی میں نے لہرا کر شراب اپنی

لپکتا ہی رہا ساحل، مچلتی ہی رہیں موجیں
مگر ٹھہری تو ٹھہری جا کے کشتی زیرِ آب اپنی

نظر ہے در کی جانب اور دم اٹکا ہے آنکھوں میں
کوئی اے کاش ایسے میں اُلٹ دیتا نقاب اپنی

جوانی وقف کردی میں نے اطہرؔ جن کے تیور پر
انہیں آنکھوں پہ ہے قربان بقیہ آب و تاب اپنی

وجہِ تزئیں جو ہے حُسن تیرا
باعثِ فخر ہے عشق میرا

اُس اجالے سے بہتر اندھیرا
ظلمتوں کا ہو جس میں بسیرا

ڈال رکھا ہے زلفوں نے رخ پر
نور کے گرد ظِلمت کا ڈیرا

دیدۂ نیم وا کے یہ مارے
رات میں ڈھونڈتے ہیں سویرا

ہیں مژہ پر جو آنسو کے قطرے
موتیوں نے صدف کو ہے گھیرا

چاندنی میں جو یاد ان کی آئی
چھا گیا بزمِ جاں پر اندھیرا

زندگی کیا اندھیرے میں کھوئی
ہو گیا زندگی میں اندھیرا

خود بلا لیتی ہے اس کو منزل
جس مسافر کا لٹ جائے ڈیرا

ہے جنون و خرد میں یہ نسبت
ایک ہی رات ، اِک ہے سویرا

چار دن کی جوانی ہے سب کچھ
زندگی کا اجالا اندھیرا

بن گیا میرے دامن کا ٹکڑا
رزمگاہ جنوں کا پھریرا

تجھ کو برسات کی چاندنی میں
دے نہ دھوکا اجالا اندھیرا

ہے مسرت سے خالی وہ بستی
جس میں ہوتا نہیں غم کا پھیرا

لوٹ لیتی ہیں خود ہی وہ راہیں
جن کے رہرو میں ہے میرا تیرا

◎

پہلے ہر آرزو دل سے دھونا
بعد میں ہم سخن ان سے ہونا

آنکھوں آنکھوں میں اِک بات کر کے
وہ بھی شرمندہ ہوں تم بھی ہونا

عظمتِ دیدارِ چشمِ حیراں!
گیسوؤں میں الجھ کر نہ کھونا

جاگتی ہے ابھی لو دِیے کی
چاند تارو! ابھی تم نہ سونا

کر نہ توہین عزمِ سفر کی
جا کے منزل پہ منزل میں کھونا

خود ہی منزل چلی جستجو کو
کھونے والو! مبارک ہو کھونا

حاصلِ رہروی ہے اے رہرو!
گردِ دامن نہ اشکوں سے دھونا

مرگِ پروانہ کو کیا یہ کم ہے؟
رات بھر شمع کا اُس پہ رونا

بڑھنے پائے نہ پلکوں سے طوفاں
نام الفت کا یوں نہ ڈبونا

بار طوفاں نہ ہو بارِ احساں
لاکے ساحل پہ کشتی ڈبونا

ذوقِ بادہ نہ لغزش میں آئے
عظمتِ بے خودی یوں نہ کھونا

غم کے ماروں نے غم کی طلب میں
چھان مارا ہے ایک ایک کونا

کالی کملی ہے اطہرؔ !سہارا
پاس اپنے نہ چاندی نہ سونا

◎

بتائیں اہلِ دل شغلِ محبت میں مزہ کیا ہے
نگاہِ ناز! تیری شوخیوں کا مدّعا کیا ہے

مریضِ عشق! دامانِ مسیحا کی ہوا کیا ہے
مسیحا! تیرے بیماروں کی دنیا میں دوا کیا ہے

بتائیں سوئے محمل بے تحاشا دوڑنے والے
جرس کیسا، ہے منزل کون، صحرا کی ہوا کیا ہے؟

زمانہ بھر کے پر ہنگام شوروشر کے دیوانو!
سنو بھی کان رکھ کر ''وقت'' کے دل کی صدا کیا ہے

نظر آتے ہیں دوشِ زندگی پر موت کے گیسو
نگاہِ امن میں یہ جلوۂ جور و جفا کیا ہے

نگاہِ انقلاب اکثر لرزتی ہے جہاں آکر
اس ہنگامِ تباہی میں سکوں کا آسرا کیا ہے

فراقِ گل میں برپا شام سے تھا گریۂ شبنم
سحر ہوتے ہی یہ پامالی، اے بادِ صبا! کیا ہے

بتائیں لاشۂ تہذیب نو کے مورثِ اعلیٰ
ابھی ہنسنے کا موقعہ ہے تو پھر رونے کی جا کیا ہے

◎

گرفتارِ فریبِ رنگ و بو ہیں گلستاں والے
مِرے نزدیک ہیں آزاد بالکل ہی خزاں والے

شبِ گلشن جو گزرے خیریت سے تو مرا ذِمّہ
سکوں سے سو نہیں سکتے خصوصاً آشیاں والے

ابھی تو ہنسنے والے کہہ رہے ہیں داستانِ غم
ابھی تو محوِ خوابِ غم ہیں روتی داستاں والے

خدا نے لذّتیں دی ہیں کچھ ایسی رونے والوں کو
ہنسا کرتے ہیں اپنے بخت پر آہ و فغاں والے

جنوں میں یہ بہت آگے نکل آئے تھے منزل سے
ابھی کچھ اور بھی پیچھے ہٹیں گے کارواں والے

گراں بارِ سجودِ آستاں پیشانیاں کل تھیں
مگر پیشانیاں اب ڈھونڈتے ہیں آستاں والے

سبکساریِ ساحل، نذرِ طوفاں ہونے والی ہے
نگاہِ تشنہ لب دجلہ بداماں ہونے والی ہے

وہ اندازِ تبسّم مٹ چکا پھولوں کا گلشن سے
زبانِ خار رودادِ گلستاں ہونے والی ہے

پرانے قیدیوں سے پوچھ لو، اے نو گرفتارو!
اسی زنداں میں تعمیرِ گلستاں ہونے والی ہے

فراقِ گوہرِ مقصود میں روئی ہے کھل کھل کر
نگاہِ پیر کنعاں یوسفستاں ہونے والی ہے

مرے آئینۂ امروز میں تصویرِ فردا ہے
اسی زنداں میں کل سیرِ بیاباں ہونے والی ہے

یہ پروانے فدائے روشنیِ لم یزل ہوتے؟
ابھی بے نور، یہ شمعِ شبستاں ہونے والی ہے

مری مایوسیوں کو آسرا ہے درد کا اطہر
اسی نشتر سے تسکینِ رگِ جاں ہونے والی ہے

◎

چاند، تاروں کی یاد آتی ہے
حسن پاروں کی یاد آتی ہے

کھِل رہی ہے کلی کلی دل کی
گلعذاروں کی یاد آتی ہے

خرمنِ ہوش زد پہ آیا ہے
برق پاروں کی یاد آتی ہے

آتشِ دل خموش ہے کچھ کچھ
کن شراروں کی یاد آتی ہے

جن سے مانوس تھی شبِ ہجراں
اُن ستاروں کی یاد آتی ہے

ذکرِ گل جب کوئی سناتا ہے
مجھ کو خاروں کی یاد آتی ہے

جن کے باعث قفس نصیب ہوا
ان بہاروں کی یاد آتی ہے

وجد میں آکے جھوم اُٹھیں پلکیں
اشک باروں کی یاد آتی ہے

اے سہارو! ہٹو، بچو، دیکھو
بے سہاروں کی یاد آتی ہے

شان سے ہر خوشی کو ٹھکراتی
غم کے ماروں کی یاد آتی ہے

خیر ہو دامنوں کی زنداں میں
آج خاروں کی یاد آتی ہے

چاندنی کے حسیں لباسوں میں
ماہ پاروں کی یاد آتی ہے

اور بھی ڈگمگاتی ہے کشتی
جب کناروں کی یاد آتی ہے

ناز کرتی ہے جن پہ ناکامی
ان سہاروں کی یاد آتی ہے

◎

یادِ جاناں کو محبوب جانا
تو نے اے دل بہت خوب جانا

وہ نہ سمجھا حجاباتِ رخ کو
جس نے نظروں کو محجوب جانا

آئے ہنستے، چلے مسکراتے
خوب آنا ہے اور خوب جانا

کی جو اپنے پہ تنقید میں نے
اپنے ہر فن کو معیوب جانا

ساتھ ہی نبضِ طوفاں بھی ڈوبے
ڈوبنے والے یوں ڈوب جانا

◎

رنگِ دنیا ہے بزمِ دنیا تک
موجِ دریا ہے سطحِ دریا تک

کتنی صبحیں ہیں کتنی شامیں ہیں
صبحِ دنیا سے شامِ دنیا تک

کون ہوتا ہے کس کا دُنیا میں
دور رہتا ہے اپنا سایہ تک

زندگی بھی فریب ہے اے دوست
زندگی کی حسیں تمنا تک

موت وہ ہے حیات سے بہتر
جس پہ قرباں ہو خود مسیحا تک

کیا مقدّس سفر ہے اے اطہرؔ!
درِ کعبہ سے ربّ کعبہ تک

◎

کام کی بات تھی وہ نہ آئے
چاندنی رات تھی وہ نہ آئے

کیف میں تھی شرابور مستی
خوب برسات تھی وہ نہ آئے

غرق تھی ظلمتوں میں خموشی
کیا حسیں رات تھی وہ نہ آئے

باوجود ے کہ وہ بھی تھے مضطر
جانے کیا بات تھی وہ نہ آئے

شام سے منتظر عاشقوں کی
بزمِ ظلمات تھی وہ نہ آئے

دیدنی ان کے بیمارِ غم کی
آخری رات تھی وہ نہ آئے

مضطرب میرے تار نفس میں
روحِ نغمات تھی وہ نہ آئے

◎

صبحِ چمن ہے شامِ غریباں ترے بغیر
شعلوں سے کھیلتا ہے گلستاں ترے بغیر

ابر و بہار بادۂ و مینا کے باوجود
سونی پڑی ہے محفلِ رنداں ترے بغیر

سبزہ بھی، چاندنی بھی، ہوا بھی، بہار بھی
بے کیف سی ہے بزمِ شبستاں ترے بغیر

طے کر رہا ہوں منزلیں ہر سانس میں مگر
کٹتی نہیں ہے راہِ بیاباں ترے بغیر

آجا کہ ختم ہوں یہ کششہائے بے شعور
الجھا ہوا ہے درد سے درماں ترے بغیر

◎

اٹھا دی درد سے پابندیِ آہ و فغاں ہم نے
بنالی زندگانی مستقل ایک داستاں ہم نے

فسانہ کہہ رہی تھی اپنا رو رو کر سرِ محفل
انہیں آتے جو دیکھا روک لی ہنس کر زباں ہم نے

ترے سجدوں کی لذّت نے کچھ ایسی بے خودی بخشی
جبیں میں کر لیے پیدا نقوشِ آستاں ہم نے

جہاں اب بھی نہیں ہے اذن سجدہ ہم کو اے اطہرؔ!
مٹایا ہے اُسی در کے لیے اپنا نشاں ہم نے

◎

میں اکثر دیکھتا ہوں شام کی رنگیں بہاروں میں
کہ وحشت رقص کرتی ہے چمن کے لالہ زاروں میں

چمن کی چاندنی راتیں نظر میں ظلمت افشاں ہیں
نہ پوچھو میں نے کیا دیکھا ہے ان رنگیں بہاروں میں

جو کالی رات کی محشر فروشی کا یہ عالم ہے
تو پھر کس طرح ہو سکتی ہے میرے راز داروں میں

نہ جانے کون سا جرعہ دیا ہے مرے ساقی نے
مری اُٹھتی جوانی مل رہی ہے خاک پاروں میں

یہ کیا معلوم تو نے آتشِ سیّال رکھی تھی
ابھی تک جل رہا ہوں جامِ رنگیں کے شراروں میں

ابھی تو صور محشر پھونکنے والا بھی سویا ہے
ابھی سے کس لیے بے چین ہیں مردے مزاروں میں

مجھے تفصیل کی فرصت کہاں اے پوچھنے والو!
میں کہہ دیتا ہوں گر کہتا ہوں کچھ یوں ہی اشاروں میں

یقیناً پھونک دیتی حدّتِ یاس والم اطہرؔ
اگر شامل نہ ہو جاتا میں اپنے اشکباروں میں

◎
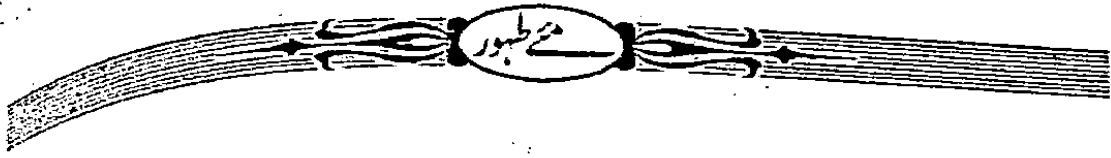
مکمل کوچ سے پہلے ہی سامانِ سفر کرلیں
مناسب ہے ابھی روشن چراغِ رہ گزر کرلیں

ترستا ہے قفس میں عمر بھر صیاد گلشن کو
چمن پر آخری چلتے چلاتے اِک نظر کرلیں

خلش ہوتی تو ہے لیکن ابھی ہے آرزو تشنہ
عنایت ہو اگر تیز اور نوکِ نیشتر کرلیں

قفس کی تیلیاں ٹوٹیں گی، بدلے گا یہ دور اطہرؔ
گرفتاروں سے کہہ دو اہتمامِ بال و پر کرلیں

◎

حوروں کے لیے اور نہ کوثر کے لیے ہے
سجدہ تو مرا خاص ترے در کے لیے ہے

دارا کے لیے ہے نہ سکندر کے لیے ہے
یہ رونقِ بازار تو دم بھر کے لیے ہے

ہے میرے لیے نیزہ و شمشیر برہنہ
تسبیح و عصا واعظِ منبر کے لیے ہے

سجدوں کے تقاضے سے میں تنہا نہیں مضطر
بیتاب ترا در بھی مرے سر کے لیے ہے

اے کاش کوئی پوچھتا اربابِ چمن سے
کیوں خارِ چمن دامنِ اطہر کے لیے ہے

◎

نہ ساقی اور نہ مینا چاہتا ہوں
مگر میں پھر بھی پینا چاہتا ہوں

یہ ساغر رکھ دے ساقی! سامنے آ
تری آنکھوں سے پینا چاہتا ہوں

سرِ ساحل جو لے جا کر ڈبو دے
کوئی ایسا سفینہ چاہتا ہوں

جہاں دے موت پہرہ زندگی پر
اسی عالم میں جینا چاہتا ہوں

دُہائی ہے مرے صحرا کے خارو!
میں دامن آج سینا چاہتا ہوں

سرِ درِ زندگانی چرخ لے لے
غمِ شاہ مدینہ چاہتا ہوں

ہے جس پر ناز فقر حیدری کو
وہی نانِ شبینہ چاہتا ہوں

اگر ان کو گراں گزرے نہ اطہرؔ
تو کچھ دن اور جینا چاہتا ہوں

◎

سرور و کیف سے آہ و فغاں تک بات جا پہنچی
پہنچنی تھی کہاں لیکن کہاں تک بات جا پہنچی

جبیں سے میری ان کے آستاں تک بات جا پہنچی
زمیں سے اٹھ کے یعنی آسماں تک بات جا پہنچی

تھے غنچے مہر بر لب منتظر ادنیٰ اشارے کے
ذرا وہ مسکرائے گلستاں تک بات جا پہنچی

دعا دیتا ہوں غمازِ چمن! تیری تگ و دَو کو
جوں ہی تنکے چُنے برقِ تپاں تک بات جا پہنچی

معاذ اللہ! بحثِ حسن و الفت کتنی خونیں ہے
چلی مژگاں سے اور تیغ و سناں تک بات جا پہنچی

نہ چھیڑ واے خس و خاشاک! اشکوں کو بُرا ہوگا
اگر قطرے سے بحرِ بے کراں تک بات جا پہنچی

سکوت اطہر! کیا تم نے بہت آغاز الفت میں
مگر انجام میں شرح و بیاں تک بات جا پہنچی

◎

پھانس احساس کی پڑ جاتی ہے گاہے گاہے
گر چہ الفت سے اس آفت کو ٹلے دیر ہوتی

دیکھ دیوانہ کو کھویا ہے کہاں راہوں میں
اس کو زنداں سے بیاباں کو چلے دیر ہوتی

شدتِ شوق میں تاخیر کی شدت کو نہ پوچھ
سر کو رکھے ہوئے خنجر کے تلے دیر ہوتی

◎

جب سے ان کی یاد حرزِ جسم و جاں ہونے لگی
زندگی بیگانۂ سودوزیاں ہونے لگی

ہم صفیرو! کون سی یہ دھن تراشی تم نے آج
مضمحل نغموں سے روحِ گلستاں ہونے لگی

میں نے برسوں یوں گزارے ہیں چمن میں رات دن
برق جب چمکی ہے فکرِ آشیاں ہونے لگی

کچھ دنوں میں اور بدلے گی یوں ہی رسمِ قفس
کچھ نہ کچھ آزادیِ آہ و فغاں ہونے لگی

دل کے آئینے پہ عکسِ یاس کیا پڑنے لگا
صبح کے ماتھے پہ شامِ نوجواں ہونے لگی

ان کی محفل میں بھی میرا تذکرہ ہونے لگا
اب تو میری داستاں بھی داستاں ہونے لگی

صبح ہم صحرا سدھارے، اور چمن میں شام تک
جستجوئے نقشِ پائے کارواں ہونے لگی

اب متاعِ رنگ و بو محفوظ ہو تو کس طرح
جب کہ رہزن خود نگاہِ باغباں ہونے لگی

ہائے وہ بیمار آنکھیں جن کا اطہرؔ ہے مریض
ان کی اک شہ پر میری دنیا جواں ہونے لگی

◎

خودداریِ حیات کو رسوا نہ کر سکے
ہم انتظار وعدۂ فردا نہ کر سکے

اچھا ہوا وہ پہلی نظر کام کر گئی
اچھا ہوا ہم اور تمنا نہ کر سکے

وہ رہ روانِ دشت ہیں ناکام و نامراد
لیلیٰ کو بھی جو رہ روِ صحرا نہ کر سکے

ایسے جیے کہ گلشنِ وہم و خیال میں
تنکے بھی چند شوق سے یکجا نہ کر سکے

تف ایسی زندگی پہ ہے، جیتے رہے مگر
ہم زندگی کا فرض بھی پورا نہ کر سکے

◎

کچھ اس انداز سے پہلے پہر فریاد کی ہم نے
اڑھادی ماہ و انجم کو رِدائے تیرگی ہم نے

تمھارے در پہ سر رکھا بانداز خودی ہم نے
ستاروں کی جبیں سے چھین لی تابندگی ہم نے

اک ایسا کشمکش کا دور بھی گزرا ہے الفت میں
کہ خود اپنی تمنا کی اڑائی ہے ہنسی ہم نے

بنابت خانہ گاہے، گاہ دیوارِ حرم اٹھی
مقامِ آب و گل کو رونقِ نو بخش دی ہم نے

قصور اس میں کیا ساحل کا؟ اور دریا کی خطا کیا ہے؟
اگر موجوں میں گھر کر خود ہی کشتی توڑ دی ہم نے

سفینہ ہے نفس کا مرگ و ہستی کے دو دھارے پر
کہاں سلجھائے آکر عقدہائے زندگی ہم نے

ہلا سکتی نہیں ہے دولتِ کونین بھی اطہر
زمینِ فقر پر رکھی ہے بنیادِ خودی ہم نے

◎

وطن کا خون کرنا اپنی خاطر
غلامی ہے یہ آزادی نہیں ہے

پرانے لیڈرو! رنگیں جوانو!
یہ بربادی ہے آبادی نہیں ہے

ضعیفوں بیکسوں پر مشقِ خونیں
طریقِ عزمِ فولادی نہیں ہے

مسلماں ہو کہ ہندو ہو کہ سکھ ہو
یہاں پر کوئی فریادی نہیں ہے

مگر باوصف اس کے کوئی اطہرؔ
عدوئے جورو بیدادی نہیں ہے

◎

نہ بدلی ہے زمیں ساقی! نہ بدلا آسماں ساقی
تو کیوں بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے جہاں ساقی

جو میکش تھے کبھی ساماں طرازِ رونقِ محفل
میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہیں تو آخر ہیں کہاں ساقی

نظامِ میکدہ ابتر، کہاں بادہ، کہاں ساغر
نہ کوئی سینہ سوزاں ہے نہ کوئی خوں تپاں ساقی

ستارے چومتے ہیں بام ودر کی جھک کے پیشانی
تری محفل میں ہے وقتِ سحر شب کا سماں ساقی

اسیرِ حلقۂ قوم و وطن ہے دیدۂ مومن
بپا ہے میکدے میں امتیازِ این و آں ساقی

جبینوں کی یہ محرومی نہیں تو اور کیا شے ہے
کہ تیرے ایک کعبہ میں بنے دو آستاں ساقی

مرے دل کی بھری محفل لٹی، اکھڑی، پھنکی، بکھری
یہی ہے حاصلِ آزادیِ ہندوستاں ساقی

زمانہ گو نہ سمجھے پر تری رحمت سمجھتی ہے
کہ کیا ہے مدعائے بندگانِ بے زباں ساقی

مجھے پہنچا دیا اپنوں نے غم کی ایسی منزل میں
جہاں رہتا نہیں ''در دل حسابِ دوستاں'' ساقی

ذرّے کو آفتاب کیے جا رہا ہوں میں
ہستی کو بے نقاب کیے جا رہا ہوں میں

جلووں کو کامیاب کیے جا رہا ہوں میں
اپنے ہی کو حجاب کیے جا رہا ہوں میں

معلوم ہے حقیقتِ گلہائے رنگ و بو
ذوقِ نظر خراب کیے جا رہا ہوں میں

امواجِ زندگی کا تلاطم ہی ہے سکوں
ہر موج کو سراب کیے جا رہا ہوں میں

اک دور تھا کہ حسن ہی خواب و خیال تھا
اب عشق ہی کو خواب کیے جا رہا ہوں

خود ہی نہیں ہوں عشق و محبت میں لا جواب
ان کو بھی لا جواب کیے جا رہا ہوں میں

یا مہر و ماہ ابر میں خود ہی ہیں مضطرب
یا وقفِ اضطراب کیے جا رہا ہوں میں

گر ہے عتابِ جرم ہی ان کی نگاہِ خاص
تو جرمِ بے حساب کیے جا رہا ہوں میں

سر گرمِ ارتقائے محبت ہوں اس قدر
کونین سے حجاب کیے جا رہا ہوں میں

اک رند اور رمزِ محبت کی یہ شناس
واعظ کو آب آب کیے جا رہا ہوں میں

اطہر جنوں کی حد بھی ہے کچھ دیکھ تو سہی
کس در سے اجتناب کیے جا رہا ہوں میں

◎

آسان اپنی راہ کیے جا رہا ہوں میں
ان کی طرف نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

وسعت نگاہِ شوق کی محدود کیوں کروں؟
جلوؤں کو بے پناہ کیے جا رہا ہوں میں

پہلے تو ان کے وعدوں پہ تھا اب یہ حال ہے
ان پر بھی اشتباہ کیے جا رہا ہوں میں

واعظ کے دل پہ داغ رہوں نقشِ کالحجر
ایسا بھی اک گناہ کیے جا رہا ہوں میں

دل سے فریب عشق سے آنکھوں سے اشک سے
دونوں سے یوں نباہ کیے جا رہا ہوں میں

رنگینیِ لہو میری صد رشکِ طور ہے
مقتل کو جلوہ گاہ کیے جا رہا ہوں میں

فرشِ زمیں ہے عرشِ محبت کی راہ میں
ذرّوں کو مہر و ماہ کیے جا رہا ہوں میں

تسلیم لاکھ بار، سراسر شکست ہوں
ضدان سے خواہ مخواہ کیے جا رہا ہوں میں

زاہد! مرے کریم کی رحمت کا ہے طفیل
تقدیر کو سیاہ کیے جا رہا ہوں میں

اطہرؔ مآلِ عشق ہے اتنا ہی اب تلک
اپنے کو خود تباہ کیے جا رہا ہوں میں

دمِ عیش و مسرت سوختہ جانوں پہ کیا گزری؟
جلی جب شمع محفل میں تو پروانوں پہ کیا گزری؟

وہ کہتے تھے نہیں معلوم فرزانوں پہ کیا گزرے؟
نہیں معلوم ان غمخوار دیوانوں پہ کیا گزری؟

درِ دیوار لرزاں ہیں مسلسل چیخ اٹھتی ہے
خدا یا خیر ہو زنداں میں دیوانوں پہ کیا گزری؟

فضا سکتے میں، ذرّے سوگوار اور دم بخود ہر شے
جو ویرانوں سے ہم گزرے تو ویرانوں پہ کیا گزری؟

درندے گنگ، چیتے سرنگوں اور شیر شرمندہ
تو انساں کیا بتا سکتا ہے انسانوں پہ کیا گزری؟

بھرا کرتی تھی جن کی ہر نظر بجلی دل وجاں میں
نہیں معلوم خود ان شعلہ سامانوں پہ کیا گزری؟

فرشتوں کے بھی پر جلتے تھے جن کی بارگاہوں میں
نہیں معلوم آج ان کے ہی کاشانوں پہ کیا گزری؟

رہا کرتی تھیں کل تک جن پہ رقصاں عنبریں زلفیں
نہیں معلوم آج ان مرمریں شانوں پہ کیا گزری؟

نگاہیں طوف لا حاصل پہ جن کے جان دیتی تھیں
نہیں معلوم ان دلکش پرستانوں پہ کیا گزری؟

بڑی حسرت سے مرغانِ قفس یہ ذکر کرتے تھے
نہ جانے اب کے موسم میں گلستانوں پہ کیا گزری؟

بتوں پر خاک اُڑتی ہے، برہمن دل گرفتہ ہیں
جو بت خانوں سے ہم نکلے تو بت خانوں پہ کیا گزری؟

بظاہر چار تنکے آ گئے تھے زد میں بجلی کی
حقیقت میں نہیں معلوم گل خانوں پہ کیا گزری؟

نہ کوئی چھیڑنے والا، نہ کوئی سننے ہی والا
یہ حسن و عشق کے جاوید افسانوں پہ کیا گزری؟

گزرنی تھی جو گزری مے کشوں پر دیکھنا یہ ہے
ہزاروں سال سے آباد میخانوں پہ کیا گزری؟

قسم ہے تم کو اپنی بے نیازی کی ذرا سوچو
تمھارے روٹھنے سے میرے ارمانوں پہ کیا گزری؟

تباہی کا مری ماتم ہے اطہرؔ آج اپنوں میں
مگر دیکھے گی کل دنیا کہ بے گانوں پہ کیا گزری؟

◎

درِ رحمت سے ٹکراتی رہی برسوں دعا میری
ابھی تک سسکیاں لیتی ہے آہِ نارسا میری

بہت مجبور ہے یا رب! یہ روتی سی نوا میری
میں قرباں تیری رحمت کے کبھی سن لے خدا میری

خدا جانے کبھی کچھ رحم فرمائیں گے یا یوں ہی
یہ ہستی ہی مٹا ڈالیں گے اربابِ وفا میری

خدا جانے میں کیا بھرتا زمانہ کی فضاؤں میں
اگر مجبور نہ ہوتی یہ رنگیں سی نوا میری

میرے سینے سے جو اشعار بن بن کر نکلتے ہیں
حقیقت میں ہے یہ ناکام سی روتی صدا میری

جوانی کی اُمنگیں کس لیے بیتاب ہیں دل میں
کبھی ناکام ہو سکتی نہیں طبعِ رسا میری

نہیں معلوم کیوں اطہرؔ! قتیلِ جور رہتا ہوں
کسی کو بھا گئی شاید تڑپنے کی ادا میری

◎

بہت پُر درد ہے اے سننے والو! داستاں میری
کہوں کیا؟ جل رہی ہے حدّتِ غم سے زباں میری

خودی گم ہو گئی اللہ رے! آ کر کہاں میری
نشاں اپنا بھی خود پاتی نہیں ہستی جہاں میری

نشانِ راہ تک گم کر چکے تھے کارواں والے
صدائے راہ بن کر دفعۃً گونجی فغاں میری

بہت آگے نکل آیا ہوں میں صحرا کی وسعت سے
ابھی تک جستجو ہے کارواں در کارواں میری

مری ہر گام لغزش پر تری رحمت کا کیا کہنا
نوازی جا چکی ہیں بارہا مجبوریاں میری

ابھی فرصت نہیں مجھ کو الم پر در نظاروں سے
مرتب ہو رہی ہے آج ساری داستاں میری

◎

اگر قسمت سے ہو اک بلبلِ شیریں زباں پیدا
تو ہو سکتی ہے گلشن میں بہارِ نوجواں پیدا

گوارا کر نہیں سکتی یہ ذلت غیرتِ سجدہ
کروں گا میں جبینِ عجز میں خود آستاں پیدا

پرانی داستاں کے سننے والو! بزم کہنہ میں
کروں گا تلخ نغمہ سے نئی اک داستاں پیدا

تو پھر اِک پھول بھی کیوں بچ رہے صیاد کے ہاتھوں
چمن کے لوٹنے والے ہوئے ہیں پاسباں پیدا

بدل دیں جو نظامِ زندگی کی شاہ راہوں کو
وطن میں میرے یا رب ہوں کچھ ایسے نوجواں پیدا

رہِ آزادیِ ملت میں کھونا عین منزل ہے
ہوئے ہیں بے پتہ ہو کر ہزاروں کارواں پیدا

صدا دیتے ہیں ذرّے کارزارِ زندگانی کے
یہاں مٹنے سے ہوتی ہے حیاتِ جاوداں پیدا

پرانے قہقہوں پر مُردنی چھائی ہے اے اطہرؔ
مجھے آہوں سے کرنا ہے نیا ہندوستاں پیدا

◎

نسیمِ سرد میں خوابِ گراں معلوم ہوتا ہے
بوقتِ صبح انجامِ فغاں معلوم ہوتا ہے

لگادی آگ سی گلشن میں پھر فصلِ بہاراں نے
رگِ گل میں نہاں دورِ خزاں معلوم ہوتا ہے

یہ میرا ذوقِ بینش ہے کہ لطفِ برقِ پیہم ہے
ہر اک شعلہ میں عکسِ آشیاں معلوم ہوتا ہے

بنائے آشیاں رکھ دی ہے میں نے کس کے گلشن میں
یہاں کا پھول بھی برقِ تپاں معلوم ہوتا ہے

معطل ہے نظامِ حسن خود سر آستانوں میں؟
جبینِ عجز پر خوابِ گراں معلوم ہوتا ہے

جلایا جا رہا ہے کیا فلک پر خون بھی اطہرؔ!
شفق کی سرخیوں میں کچھ دھواں معلوم ہوتا ہے

⑥

بقدرِ شوقِ منزل، گرمیِ رفتار ہوجائے
تو ذمہ ہے کہ بیڑا کارواں کا پار ہوجائے

چمن والو بڑھاؤ شانِ استغنا کی اس درجہ
کہ گلشن کا ہر اک غنچہ نظر میں خار ہوجائے

تقاضا وقت کا ہے رزم گاہِ دورِ حاضر میں
ثریا سے یہ ذرہ ، برسرِ پیکار ہوجائے

عمل کا وقت ہے جائز نہیں ہے فرصتِ کاوش
کہیں ایسا نہ ہو یہ وقت بھی بے کار ہوجائے

وفورِ جذبۂ آزادی کا حل ہے اے ساقی
پلا دے جام جس سے بزم سے سرشار ہوجائے

نظمیں

نالۂ اطہر

(یہ نظم قاضی صاحب کی احیاء العلوم کے زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہے اور اسی طالب علمانہ دور میں پہلی بار ماہنامہ "الفرقان" بریلی کے جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ کے شمارہ میں صفحہ ۳۲ پر "مسلم کی دعا" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ دوبارہ یہی نظم "نالۂ اطہر" کے زیرِ عنوان دسمبر ۱۹۳۹ء/ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ کے رسالہ "قائد" مرادآباد میں صفحہ ۳۱ پر اس وقت چھپی جب قاضی صاحب مدرسہ شاہی مرادآباد میں دورۂ حدیث شریف کے طالب علم تھے۔)

الٰہی پھر وہی ساقی وہی پیمانہ ہوجائے
حجازی وادیوں میں شورشِ مستانہ ہوجائے

شبستانِ جہاں پھر محفلِ رندانہ ہوجائے
ہر اک فردِ بشر اسلام کا پروانہ ہوجائے

الٰہی! پھر پتنگوں میں اُمنگ و سوز پیدا کر
الٰہی! پھر رُخِ اسلام پر دینا کو شیدا کر

خدایا! پھر زمانہ کی ہوااک دم پلٹ جائے
خدایا! تختۂ باطل جہاں سے پھر اُلٹ جائے

حجابِ خوابِ غفلت پھر مسلمانوں سے ہٹ جائے
بلا کا رشتۂ باطل دلِ مسلم سے کٹ جائے

الٰہی! قطرۂ نیساں صدف میں پھر دمک اٹھے
الٰہی! گوہرِ ایماں سے دنیا پھر چمک اٹھے

دلِ مسلم کو پھر تو جوشِ ایمانی سے تڑپادے
حرارت وہ عطا کر جو پہاڑوں کو بھی پگھلا دے

ذرا اِک بار پھر اسلام کے شیروں کو بھڑادے
ذرا آواز گلّہ بان کی پھر گلّوں میں پہنچادے

الٰہی! پھر رہِ اسلام میں قربان ہوجائیں
فداکارِ بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ ہو جائیں

خدایا! پھر کوئی بوبکرؓ سا انسان پیدا کر
جلالِ حضرت فاروقؓ کی سی آن پیدا کر

مسلمانوں میں پھر تو باحیا عثمانؓ پیدا کر
جنابِ حیدرِ کرارؓ سا ذیشان پیدا کر

الٰہی! قرنِ اوّل دورِ حاضر کو بنا دے پھر
الٰہی! خیر وبرکت کا زمانہ تو دکھا دے پھر

الٰہا! غازیِ اسلام خالدؓ کو اٹھا دے پھر
جنابِ سعدؓ گہری نیند سوتے ہیں جگادے پھر

عمرؓ و سالار کو تو بھیج کر ہم میں ملا دے پھر
کہاں ہیں بو عبیدہؓ اے خدا ان کو دکھادے پھر

ہمیں اب تختۂ فرعونیت کو پھر الٹنا ہے
ہمیں اطہر! بتوں کی سلطنت کو پھر پلٹنا ہے

صبحِ آزادی

بہارِ کامرانی لے کے آئی صبحِ آزادی
چمن کے گوشے گوشے میں سمائی صبحِ آزادی

گئیں تاریکیاں جب سر چھپا کے جانبِ مغرب
تو مشرق کی شفق سے مسکرائی صبحِ آزادی

سکونِ قلب و جاں بن کر، متاعِ زندگی بن کر
ہر اِک شاخِ چمن پہ جگمگائی صبحِ آزادی

زمیں کے چپے چپے میں خوشی سے رقصِ عشرت ہے
فلک پر چاند تاروں نے منائی صبحِ آزادی

تمنائے دلِ شیخ آرزوئے گلشنِ طفلاں
مجاہد سرفروشوں کی کمائی صبحِ آزادی

لیے عزمِ جواں مردی، لٹا کے اپنا تن من دھن
ہمارے جاں نثاروں نے سجائی صبحِ آزادی

کیا آباد زنداں کو، کبھی دارورسن چوما
لگائی جان کی بازی تو آئی صبحِ آزادی

کبھی پربت سے ٹکرائے، کبھی طوفاں سے ٹکرائے
بہت کچھ ہم نے کی زور آزمائی صبحِ آزادی

نشاں باقی ہیں اب تک گولیوں کے سینوں پر اطہر
بہا کر خون اپنا ہم نے پائی صبحِ آزادی

اعلانِ آزادی

کھنچا آتا ہے خود میری طرف دامانِ آزادی
قفس میں کر رہا ہوں بیٹھ کر سامانِ آزادی

نظر آتے ہیں مجھ کو ہر طرف آزاد نظّارے
بہ اندازِ جلا آنکھوں میں ہیں ارمانِ آزادی

یہ کیا ہے زندگی، ہر ہر نفس وقفِ غلامی ہے
کوئی پوچھے شہیدانِ وطن سے شانِ آزادی

کوئی صیّاد کے حلقہ نشینوں کو خبر کر دے
قفس کی تیلیوں میں ہو گیا اعلانِ آزادی

جو تخریبِ غلامی میں نظر آتی ہیں تعمیریں
سجایا جانے والا ہے، یہیں ایوانِ آزادی

مزہ جب ہے مرتب ہو کے اس ماحول میں آئے
مرے دیوان کا عنوان ہو، عنوانِ آزادی

جمعیۃ علمائے ہند

نکل آئیں نیاموں سے تڑپ کر گرم تلواریں
رگ باطل سے پھوٹیں بے محابا خون کی دھاریں

چلو اٹھو، بڑھو حملہ کرو باطل سے ٹکراؤ
اگیں کشت وفا میں غازیانِ دیں کی للکاریں

جب آجاتی ہے دستِ حق پرستی میں ید اللٰہی
لرز جاتی ہیں قصرِ کفر کی مضبوط دیواریں

خیالِ دوریِ منزل سے رک جاتی ہیں جب راہیں
کہ میرِ کارواں کی دم بخود ہوتی ہیں گفتاریں

سمجھ جاتے ہیں اہلِ کارواں جب اس کی گمراہی
تو کام آتی ہیں قائد کی نہ گفتاریں نہ رفتاریں

قیادت کا گلا گھٹتا ہے جب اندوہِ کثرت سے
تو کام آتی ہیں پھر مردانِ وحدت کی ہی للکاریں

عبادِ خانقاہی ہوں کہ رہبانِ کلیسائی
اُچھالی ہیں انھیں دونوں نے اہل حق کی دستاریں

بدل سکتی نہیں رخ غازیوں کا جادۂ حق سے
نہ مکاروں کی مکاری، نہ سفاکوں کی یلغاریں

جو گمراہِ ازل ہیں راہِ حق پر آنہیں سکتے
ہم ان کو لاکھ سمجھائیں، ہم ان سے لاکھ سر ماریں

حسین احمد امیرِ کارواں ہیں اہلِ ہمت کے
جو دشواری سے گھبرائیں نہ کچھ دوری سے جی ہاریں

ہزاروں مرحلے باقی ہیں مردانِ محمد کے
پسِ دیوار مستقبل ہیں جانے کتنی یلغاریں

ہے اطہرؔ روحِ مذہب اصل میں "جمعیۃ علماء"
ہیں جس کے دم سے قائم ہند میں ملت کی دیواریں

۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء

ترانۂ مجاہد

ہم مردِ مجاہد دنیا میں دو روز کی راحت کیا جانیں
تکلیف و مصیبت کے خوگر آرام کی عادت کیا جانیں

ہم ایک خدا کے قائل ہیں، ہم اپنی نبی کے تابع ہیں
ہم غیر کا سجدہ کیا جانیں، ہم اور کی طاعت کیا جانیں

کچھ لوگ عدو کی گھاتوں میں، کچھ لوگ خدا کی باتوں میں
غزوات کی خونیں راتوں میں، ہم نیند کی لذت کیا جانیں

آغوشِ وفا میں سوتے ہیں شمشیر کے ٹھنڈے سائے میں
لیلائے شہادت کے شیدا، سلمٰی کی محبت کیا جانیں

شب ختم ہوئی کہساروں میں، دن بیت گئے میدانوں میں
ہم چاند کی ٹھنڈک کیا جانیں، سورج کی حرارت کیا جانیں

گرمی ہے ہمارے سینوں میں، شعلے ہیں نہاں تکبیروں میں
رکھتے ہیں قیامت آنکھوں میں، ہم خوفِ قیامت کیا جانیں

ہم ناؤ خدا کی کھیتے ہیں، ہم سجدہ میں سر بھی دیتے ہیں
ہم موت سے ٹکر لیتے ہیں، ہم گوشۂ عزلت کیا جانیں

غازی

چھا جاتا ہے ماحول پہ جب رنگِ تباہی
آنکھوں میں جب آجاتی ہے افسردہ نگاہی

کام آئیں نہ جس وقت اوامر نہ نواہی
حق دیتا ہے جب بھول کے باطل کی گواہی

چھپ جاتا ہے جب نور اندھیروں کی ردا میں
انوار پہ یورش کو جب اٹھتی ہے سیاہی

جس وقت بھلا دیتا ہے منزل کا تصور
آزادیِ احساس کی شہراہ کا راہی

گھس جاتا ہے جب دیکھ کے ہنگامۂ باطل
روباہ صفت خانقہِ غم میں سپاہی

سجادۂ ناپاک پہ جب بے اثری سے
دم توڑتی ہے یاس میں ہر آہِ پگاہی

تسکین ہو جب گوشہ نشینانِ حرم کو
ہتھیائیں گدا دہر کے اسلام کی شاہی

جب عقل بھٹک جائے سیہ خانۂ سر میں
پلکوں کے شکنجوں میں کسے دُور نگاہی

اس وقت بپھر تا ہے کوئی غازیِ میداں
باہمت وبا ہیبت و باژرف نگاہی

اس شان سے چلتا ہے شہنشاہِ صداقت
خورشید پہ ہنستی ہے درخشندہ کلاہی

اس طرح پلٹ دیتا ہے تقدیر کا پانسہ
مٹ جاتی ہے تدبیر کے چہرے سے سیاہی

وہ امن بھی یلغار سے بچتا نہیں اطہرؔ
جس امن کا ہر رخ ہو تباہی ہی تباہی

۲۲؍نومبر ۱۹۴۷ء

اشارات

زمانہ کے تغیر سے ہوئی یوں عام بربادی
کہ ویرانہ ہے ویرانہ، نہ آبادی ہے آبادی

نظر اُٹھتی ہے جس جانب، ہے بربادی ہی بربادی
سلیقے کی اسیری ہے، قرینے کی نہ صیادی

نہ پوچھو ہمدمو! ہم بے کسوں کی وجہِ بربادی
کہ آکر اس جگہ خاموش ہوجاتے ہیں فریادی

ہماری بے زبانی رحم کے قابل ہے اے یارو
انھیں سے پوچھ لیتا کاش کوئی وجہِ بربادی

بسا اوقات مرغانِ قفس کی گرم آہوں سے
وبالِ جان بن جاتی ہے صیادوں کی صیادی

بہر حال آرزو اپنی ترے قدموں کے نیچے ہے
محبت میں یہی اک چیز ہے لے دے کے بنیادی

زمانے بھر کی ٹھوکر کھا کے تیرے در پہ آئی ہے
کدھر جائے گی دل کی آہ گر تو نے بھی ٹھکرادی

فسانہ بن رہی ہے اب تو محفل میں فدا کاری
وفا کی سرد پڑتی جارہی ہے گرم بازاری

ہے باقی وصل کی خواہش، نہ فرقت کی جنوں کاری
جنوں کاروں کی الفت سے ہوئی جاتی ہے بے زاری

نہ جانے کیا دلِ وحشی نے اپنا رنگ بدلا ہے
کہ صحرا چھوڑ کر پھرتی ہے در در اس کی خودداری

زمانے نے اُڑادیں دھجیاں دامانِ ہستی کی
بدن پر مردنی سی، روح پر افسردگی طاری

پڑا ہے زندگی کا کارواں ششدر دو راہے پر
نہ جینے ہی کا ساماں ہے، نہ مرنے ہی کی تیاری

شکایت ہائے رنگیں کہہ تو دوں لیکن ہے ڈر اطہر
کہ ہوجائے نہ ان کی طبعِ نازک پر گراں باری

۲۰/مارچ ۱۹۴۸ء

رموزِ امروز

سکونِ قلب کو آماجگاہِ درد کرتا ہوں
سراپا گرمیِ احساس کو میں سرد کرتا ہوں
متاعِ کارواں اپنی سپردِ گرد کرتا ہوں
بجھا دیتا ہوں لو! شمعِ حریمِ عقلِ انسانی

ہے رنگِ گل، نہ بوئے گل عیاں دامانِ گل چیں سے
سیہ بختی ٹپکتی ہے چمن کی شاخِ رنگیں سے
لرزتی ہے قضا ہر دم نگاہِ برق آگیں سے
رگِ گل، برگِ گل اور جانِ گل، سب سوختہ دل ہیں

ہے صبحِ زندگی اک شامِ ظلمت پوش کا عالم
شعاعِ مہر پر ہے ظلمتِ خاموش کا عالم
سکونِ سرنگوں کے دل میں ہے اک جوش کا عالم
کشاکش ہائے عہدِ نو کا پھر انجام کیا ہوگا

شبِ طولانیِ غم کی سحر لائی نہیں جاتی
نگاہِ کاروانِ شوق ٹھہرائی نہیں جاتی
حریمِ ابتدا میں انتہا پائی نہیں جاتی
مسلسل کوششِ ناکام، عینِ کامیابی ہے

محبت زندگی کو درد کا عنوان کرتی ہے
محبت درد کی تسکین کا سامان کرتی ہے
محبت اہلِ دل کی بزم میں اعلان کرتی ہے
رباب درد سے نغمے بکھرتے ہیں محبت کے

چھپا لیتے ہیں دنیا کو جب آدھی رات کے پردے
بساطِ روزِ روشن کو شبِ ظلمات کے پردے
حریمِ رنگ و بو کو شبنمی برسات کے پردے
تو کھل جاتی ہے میرے دیدۂ دل کی درخشانی

ماہنامہ "البلاغ" بمبئی اکتوبر ۱۹۵۵ء

آوازِ خلیل

دہر میں کعبہ ہے آدم کے لیے جائے پناہ
اس کی دیواروں کے سائے بہرِ عالم امن گاہ
ہیں اسی کے دم سے زندہ کشتگانِ لا اِلٰہ
آج بھی ہے اِذنِ بیداری اذانِ جبرئیل
الرّحیل اے رہ روانِ راہِ کعبہ الرّحیل

فتح کا مژدہ سنادو مشرقی اقوام کو
زندگی ملنے لگی ہے عالمِ اسلام کو
کردے جو سیراب اس دنیائے تشنہ کام کو
آج بھی جاری ہے زمزم کی وہ نہرِ سلسبیل
الرّحیل اے رہر وانِ راہِ کعبہ الرّحیل

ایک ملّت، ایک اُمّت، ایک ہی فکر و نظر
سر زمینِ اندلس سے تابخاکِ کا شغر
ہوں گے انساں بھائی بھائی، ہوگی دنیا ایک گھر
آج پھر ہوگی یہ اُمت بے مثال و بے عدیل
الرّحیل اے رہر وانِ راہِ کعبہ الرّحیل

قالبِ ابلیس میں ہے روحِ آدم کا ظہور
کھیلتا ہے امن کی آغوش میں جنگی غرور
کس قدر ہے آدمیت سے یہ آدم دور دور
آج تم دہراؤ پھر دنیا میں آوازِ خلیل
الرّحیل اے رہر وانِ راہِ کعبہ الرّحیل

کس لیے ہیں یوں پریشاں پاسبانانِ حرم
طیر کے بدلے ہے طیاروں کی ارزانی بہم
ابرِ ہیت پر گرے جاتے ہیں خود اس کے ہی بم
آج یوں ہے بر ملا ہنگامۂ اصحابِ فیل
الرّحیل اے رہر وانِ راہِ کعبہ الرّحیل

ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی جولائی ۱۹۵۶ء

ساقی نامہ

اسی اک بات میں گر زندگی مستور ہے ساقی
تو پھر یہ جامِ زہر آلود بھی منظور ہے ساقی

ہے رُوحِ تشنہ، آمادہ ابھی ہر تلخ جُرعہ پر
ابھی کیا دورِ جامِ ارغوانی دور ہے ساقی؟

تری محفل میں آتے ہی نگاہیں غرقِ ظلمت ہیں
یہاں کا ذرّہ ذرّہ تو چراغِ طور ہے ساقی

کوئی جامِ نشاط آور عنایت ہو گزر جاؤں
قریب اندوہِ طوفاں ہے، کنارا دُور ہے ساقی

اسی پر ہے نظر جو بے نیاز نشّہ و مے ہے
تری بزمِ کہن کا کیا یہی دستور ہے ساقی؟

وفورِ یاس سے کیوں جاں بلب ہیں تشنہ لب تیرے
تری چشمِ کرم بھی کیا یہاں مجبور ہے ساقی؟

مری محرومیِ قسمت اگر منظور ہے تجھ کو
تو اطہر اپنی محرومی پہ بھی مسرور ہے ساقی

وقت کی پُکار

ہے مرا ہندوستاں کے پاسبانوں سے خطاب
شمعِ آزادی کے پروانے جوانوں سے خطاب

جن کی ہر برقِ نظر میں سَو جلائے طور ہے
جن کا سینہ گرمیِ احساس سے معمور ہے

جن مسلماں نوجوانوں کی جوانی کامیاب
جن کی شریانوں میں رقصاں موتِ احمر کا شباب

جن کی ہر ہر سانس میں ہے نفخِ آزادی کا صُور
جن کی پیشانی پہ خنداں قوم و ملت کا غرور

جو بجھا دیتے ہیں جلوے شبنمی اوہام کے
جو چھڑا دیتے ہیں چھکے گردشِ ایام کے

جن کے بازو روکتے ہیں گردشِ افلاک کو
سرخ رو ہوکر دکھاتے ہیں جو منہ اسلاف کو

جن کا قصدِ اوّلیں ہی جنگ کی رنگیں حیات
جن کا دردِ نوجوانی ہے سکونِ کائنات

جو دیا کرتے ہیں ہنس ہنس کر جوابِ انقلاب
جن کو کہہ دیتی ہے دنیا کامیابِ انقلاب

آج بھی اے نوجوانو! دو جوابِ خوش مآل
اٹھ رہا ہے آج کے ماحول سے وقتی سوال

اب بھی کچھ موقع ہے کیا بیکار تاویلات کا
دھوپ پر کیا اب بھی دھوکا ہے برستی رات کا

اب بھی کیا محفوظ ہے ہر سمت سے ہندوستاں
کیا ابھی جلتے مکانوں سے نہیں اٹھتا دُھواں

کیا ابھی تک موت کی چکی نہیں گھومی اِدھر
کیا ابھی اُڑتے ہوئے شیطاں نہیں آتے نظر

کیا ابھی کھویا نہیں ہے آدمیت کا وقار؟
کیا ابھی ہوتا نہیں انسان، انساں کا شکار؟

کیا ابھی آیا نہیں رنگِ بہاری کا شباب؟
آگ کے گلشن میں کیا کھلتا نہیں خونی گلاب؟

رات ہے خونی سمندر، دن ہے دُوزخ کا عتاب
خوں بداماں چاند ہے دوزخ بداماں آفتاب

نغمۂ شیریں سکھا دو نالۂ شب گیر کو
زیورِ زرّیں بنادو آہنی زنجیر کو

گوہرِ نایاب ہیں گنجینۂ امروز میں
سیکڑوں فردا چھپے ہیں سینۂ اِمروز میں

صدائے بیداری

ہوشیار اے مرد مومن! اب خدارا ہوشیار
ہے عروسِ زندگی کے دوش پر گیسوئے موت
گلشنِ انسانیت سے آرہی ہے بوئے موت
جارہی ہے خود بخود دنیا جنوں میں سوئے موت
رحم کی طالب ہے تجھ سے روحِ آدم کی پکار
ہوشیار اے مردِ مومن! اب خدارا ہوشیار

چار سو ہے شیطنت، انسانیت کی گھات میں
گم ہے تنویرِ محبت، معصیت کی رات میں
دے اذانِ صبح اُٹھ کر گنبدِ ظلمات میں
قہقہوں سے جاگ اٹھے یہ فضائے سوگوار
ہوشیار اے مردِ مومن! اب خدارا ہوشیار

مدرسے بے روح کر ڈالے جنونی بیر نے
خانقاہوں پر بٹھا یا اپنا پہرہ دَیر نے
توڑدی ہمت عمل کی کالجوں کی سیر نے
ہے نظامِ زندگی پر حکمراں اِک انتشار
ہوشیار اے مردِ مومن! اب خدارا ہوشیار

کامرانی مردِ مومن کی ہے مرہونِ جہاد
مردِ مومن ہے مجسم ایک مضمونِ جہاد
ہم کنارِ حریت ہوتا ہے مجنونِ جہاد
طالبِ دیدارِ محمل ہے گرفتارِ غبار
ہوشیار اے مردِ مومن! اب خدارا ہوشیار

وہ کرن پھوٹی، سماں بدلا، بجیں شہنائیاں
زندگانی لے رہی ہے ہر طرف انگڑائیاں
مسکرا اٹھیں شفق پر صبح کی رعنائیاں
جاگنے کا وقت ہے اے خوابِ غفلت کے شکار
ہوشیار اے مردِ مومن! اب خدارا ہوشیار

کوکن کی ایک چاندنی رات

جاڑے کا زمانہ تھا نومبر کا مہینہ
سیّال فضاؤں میں تھا خنکی کا سفینہ

تنویر کے دربار میں تھی رات کی رانی
تھی چاند پہ چھائی ہوئی بھرپور جوانی

رنگین فضاؤں میں مچلتے تھے ترانے
تھے شوخیِ ماحول میں معصوم زمانے

یہ وقت اور اک ساحلِ کوکن کا نظارا
یہ سلسلۂ کوہ، یہ دریا کا کنارا

قابو نہ نظر پر، نہ جگر پر، نہ دہن پر
اِک سان سی پڑنے لگی جذبات کہن پر

چلنے لگے تسکین پر احساس کے آرے
جذبات میں ڈھلنے لگے پُر کیف نظارے

ہونے لگی قربان حقیقت جو فسوں پر
آوارگی چھانے لگی نظروں کے جنوں پر

رگ رگ میں سمانے لگی الفت کی کہانی
ڈھلنے لگے الفاظ کے قالب میں معانی

بیدار ترانوں کی ابھرتی ہوئی تانیں
دینے لگیں احساس کے معبد میں اذانیں

تخئیل میں ہونے لگی نغموں کی رَوانی
اشعار پہ چھانے لگی پھُٹتی سی جوانی

اس حال میں دل عہدِ جواں ڈھونڈھ رہا تھا
کھوئی ہوئی الفت کا نشاں ڈھونڈھ رہا تھا

ہمارا ماضی

سینے میں ہم ہیں عشقِ پیمبر لیے ہوئے
کالی گھٹا میں ماہِ منور لیے ہوئے

ہم نے بہا دیا خس و خاشاکِ کفر و شرک
اُٹھے مثالِ موج ، سمندر لیے ہوئے

روشن ہوا ہے ہم سے سیہ خانۂ جہاں
ہر سو پھرا کیے مہ و اختر لیے ہوئے

آئی ہمارے سامنے دنیا کی سلطنت
دامانِ انقیاد میں گوہر لیے ہوئے

صوتِ رحیل آتی ہے صحرائے سندھ سے
اب بھی غبارِ درّۂ خیبر لیے ہوئے

اطہرؔ اٹھیں گے کب یہ خدائی کے پاسباں
مدّت ہوئی ہے ظلم[ا] سے ٹکر لیے ہوئے

(ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی اکتوبر ۱۹۶۰ء)

ا بیاض نمبر ۲ میں ''کفر'' ہے۔

نوجوان مسلمان

خدا کے غیر سے ڈرنا مرے نزدیک لعنت ہے
کسی باطل کا دم بھرنا مرے نزدیک لعنت ہے
غلامی میں بسر کرنا مرے نزدیک لعنت ہے
خیالِ موت سے مرنا مرے نزدیک لعنت ہے
نگاہِ موت سے مرد مسلماں ڈر نہیں سکتا
بظاہر موت آسکتی ہے لیکن مر نہیں سکتا

جفاؤ جور سے بیزار ہونا میری فطرت ہے
ستم سے برسرِ پیکار ہونا میری فطرت ہے
بوقتِ جاں دہی تیار ہونا میری فطرت ہے
شرابِ موت سے سرشار ہونا میری فطرت ہے
صلائے عام دنیا کے لیے اسلام ہے میرا
جہاں بھر کے پیاموں سے جدا پیغام ہے میرا

میں اپنی نوجوانی کی الگ پہچان رکھتا ہوں
میں اپنے گرم سینے میں جُدا ارمان رکھتا ہوں
میں اپنی زندگی کا دوسرا عنوان رکھتا ہوں
جہاں کی اور قوموں سے نرالی شان رکھتا ہوں
ہوں امن و صلح کا داعی مسلماں نام ہے میرا
مگر باطل کی گردن کاٹ لینا کام ہے میرا

انقلاب عہدِ حاضر

زندہ باد اے انقلابِ عہدِ حاضر! زندہ باد

آج دستِ موت میں ہے زندگانی کی زمام
سوئے دشتِ نیستی ہے رخشِ ہستی تیز گام
صبحِ انسانی کے ہر پردے پہ ہے تصویرِ شام
ہے سحر کے دامنِ معصوم پر جنگی سواد
زندہ باد اے انقلابِ عہدِ حاضر! زندہ باد

پھونک دے اے برقِ غم عشرت کا دامانِ اجل
پھونک دے بوسیدہ ارمانوں میں اک روحِ عمل
پھونک دے اب صُورِ آزادی، غلامی سے نکل
زیر دستی ہو جہاں میں کامیاب و بامراد
زندہ باد اے انقلابِ عہدِ حاضر! زندہ باد

ختم کردو ایک اک کر کے جہاں سے خلفشار
عزتِ فرعونیت ہو، یا ہو نمرودی وقار
اے جوانانِ وطن بدلو فضائے روزگار
ہو نئے انداز سے ہنگامۂ بست وکشاد
زندہ باد اے انقلابِ عہدِ حاضر! زندہ باد

ہے معطل بزمِ ہستی میں نظامِ جسم و جاں
موت کے صحرا میں گم ہے زندگی کا کارواں
دعوتِ منزل مگر دیتا ہے، اب بھی اِک نشاں
وہ نظر آتی ہے، دیکھو منزلِ راہِ جہاد
زندہ باد اے انقلابِ عہدِ حاضر! زندہ باد

کیا جانے

جو ساز بھرا ہونا لوں سے نغمات سنانا کیا جانے
جس بزم میں دورِ درد رہے وہ جام پلانا کیا جانے

جس قوم کی نیا ڈوب گئی گردابِ غلامی میں پھنس کر
وہ قوم جہاں میں ساحل کا آزاد زمانہ کیا جانے

وہ پھول جو زخمی رہتا ہو، ہر بادِ خزاں کے نشتر سے
وہ پھول گلستاں میں ہنس کر اوروں کو ہنسانا کیا جانے

جو ذوقِ غلامی میں پڑ کر، محروم ہو ذوقِ ہستی سے
وہ حسن و محبت کیا جانے وہ دل کا لگانا کیا جانے

جو بندۂ سیم و زر ہو کر، اللہ سے باغی بن بیٹھا
اسلام سے اس کو کیا مطلب ایماں کی سنانا کیا جانے

ہو جس کی جبیں سے سجدۂ زر، ہو جس کی زباں پر وردِ ہوس
محراب کا سجدہ کیا جانے تسبیح کا دانا کیا جانے

دنیا میں گراں باری اطہرؔ! دولت کی سمجھ ناجائز ہے
ہو جس کی زباں پر قفلِ زر، آزاد ترانہ کیا جانے

جنگی ساز

وقت کروٹ لے رہا ہے اک نئے انداز سے
نغمۂ امن و سکوں سنتا ہوں جنگی ساز سے

دیکھ انساں! ظلم کا آج آخری انجام دیکھ
اپنے ہی گردن پر اپنی تیغِ خون آشام دیکھ

پارہی ہے دادِ مظلومی غلاموں کی زباں
اٹھ رہا ہے کاسۂ سر سے خلاؤں کے دُھواں

آج مظلوموں کی آہیں ہورہی ہیں مستجاب
اُٹھ رہا ہے ظلم کے چہرے سے مجبوراً نقاب

آگ کے طوفاں ہیں دریاؤں پہ سرگرم سفر
بحرِ خوں میں ہچکیاں لیتے ہیں معصوموں کے سر

اُڑ رہے تھے کل جو طائر آسماں کی ٹوہ میں
آج خود ہی چھپ رہے ہیں وہ زمیں کی کوہ میں

پیکرِ نازوادا پہ کیا مصیبت آگئی
اُف برہنہ تن نئی تہذیب کی آوارگی

جل گیا بھک سے رخِ تہذیب کا رنگیں نقاب
کس قدر مکروہ و بد صورت ہے یورپ کا شباب

وقت کہتا ہے یہ قومیں اب فنا ہو جائیں گی
قبرِ ذِلّت میں ابد تک کے لیے سو جائیں گی

وقت کی لائی قضا اِک لمحہ ٹل سکتی نہیں
وقت کے آگے کوئی تدبیر چل سکتی نہیں

فراموشی

ہم خوگرِ رسمِ غیر ہوئے اور اپنی حقیقت بھول گئے
افرنگ کی تلخی سہہ سہہ کر بطحا کی حلاوت بھول گئے

اس دور کے رنگیں جرعہ پر اس طرح طبیعت لہرائی
اب جنگ کے خونی میداں میں ہم جامِ شہادت بھول گئے

وہ نور میں ڈوبی موجِ نظر، وہ جلوۂ فطرت شام و سحر
وہ عہدِ کہن، وہ بزمِ حسیں، وہ عشق کی لذّت بھول گئے

وہ کیف میں ڈوبا عالمِ دل، وہ وجد میں رقصاں روحِ طرب
وہ وقتِ سحر، وہ صحنِ حرم، وہ شانِ تلاوت بھول گئے

اسلام کی عزت پر اطہرؔ ناموسِ محمد کی خاطر
جاں ہم کو چرانا یاد رہا، جان دینے کی عادت بھول گئے

گراں خوابی

ہنگامہ کُن ہے، جس کے لیے وہ مردِ مسلماں سوتا ہے
بیدار ہے جس سے بزم جہاں وہ نورِ چراغاں سوتا ہے

دنیا کی اندھیری وادی کو فردوس بنایا تھا جس نے[1]
اب صبح کے رنگیں دامن میں وہ نازِ گلستاں سوتا ہے

دنیا کی فضاؤں میں جس نے تنویر کا پرچم لہرایا
صد حیف ہے، وہ آئینۂ عکسِ جلوۂ فاراں سوتا ہے

پروانۂ شمع دینِ ہدیٰ، بیدار تھی جس سے بزمِ عمل
غفلت کی اندھیری وادی[2] میں انوار بداماں سوتا ہے

شمشیرِ اماں کے سائے میں دنیا کو سلایا تھا جس نے
اب ہند کے زخمی پہلو میں وہ غازیِ میداں سوتا ہے

گم قافلۂ ملّت ہے شب ادبار کی پیچاں راہوں میں
اور موجِ صبا کی مستی میں ملّت کا حُدی خواں سوتا ہے

صد حشر بداماں ہے منظر یہ گردشِ چرخِ کہنہ کا
بیدار ہے کافر کا ارماں اور عزمِ مسلماں سوتا ہے

جو شیرِ نیستانِ بطحا، مغرب میں گرجتا تھا کل تک
مشرق کے گھنیرے جنگل میں وہ شیرِ نیستاں سوتا ہے

ہنگامِ سحر جس کی تھی تلاوت نغمۂ لحنِ داؤدی
اب چھاؤں سے مسجد کی ہٹ کر وہ قاریِ قرآں سوتا ہے

دجلہ کے کناروں پر جس نے توحید کا نغمہ گایا تھا
گنگا کے سنہرے گھاٹوں پر وہ بندۂ یزداں سوتا ہے

پھر کون جگائے گا یارب انسان کی سوئی بستی کو
سالارِ عرب، سردارِ عجم، جب سر بہ گریباں سوتا ہے[۳]

سوئے ہیں نظارے فطرت کے، خوابیدہ ہیں آنکھیں اُلفت کی
اب نیل کی رنگیں راتوں میں خود یوسفِ کنعاں سوتا ہے

کیا صوفی و ملّا کیا واعظ، کیا مفتی و عالم کیا زاہد
جب وقت پڑا ہے اے اطہر، ہر صاحبِ ایماں سوتا ہے

---

۱ بیاض نمبر۲ میں ''لیکن'' ہے۔
۲ بیاض نمبر۲ میں ''محفل'' ہے۔
۳ بیاض نمبر۲ میں یہ شعر نہیں۔

حیاتِ اَبدی

چرخِ صدیقؓ کے روشن مہ و اختر کی قسم
ہیبتِ حضرتِ فاروقؓ دِلاور کی قسم

گریۂ دیدۂ عثمانؓ کے گوہر کی قسم
زندگی شیرِ خدا، فاتحِ خیبرؓ کی قسم

اسوۂ احمد مرسلؐ ہے نجاتِ ابدی
پیرویِ رہِ ملّت ہے، حیاتِ ابدی

گردشِ چرخِ ستم گر سے زمانہ بدلے
سازِ اقوامِ صنم گر کا ترانہ بدلے

دفترِ قصۂ فانی کا فسانہ بدلے
زلفِ ادبارِ سیہ بخت کا، شانہ بدلے

پر بدل جائے یہ قانونِ خدا، ناممکن
نسخِ آیات ز الواحِ صفا، ناممکن

اک بلالِ حبشیؓ سا کوئی لائے تو سہی
کوئی اس رنگ کی تصویر دکھائے تو سہی

ایک سلمانؓ سا اوروں میں دکھائے تو سہی
بوذرؓ و یاسرؓ و عمارؓ بنائے تو سہی

اور مذہب میں یہ تقدیر غلاموں میں نہیں
میرے اسلام کی یہ چیز ہے، اوروں میں نہیں

وارثِ تختِ شہنشاہیِ عالم ہو کر
باعثِ سجدۂ تعظیمیِ آدم ہو کر

مہبطِ سرِّ خدا، رحمتِ پیہم ہوکر
قابلِ فخرِ جہاں، سب سے مکرم ہو کر

پھر مسلمان ہے، رسواکنِ ملت توبہ!
قابلِ عزو شرف، حاملِ ذِلت توبہ!

بانگِ جرس

اے حجازی شمع کے خود دار پروانو اٹھو
اے مکینِ محملِ یثرب کے دیوانو! اُٹھو
اے مئے اسلام کے مخمور مستانو! اٹھو
کاروانِ دینِ احمد کے حدی خوانو! اٹھو
پھونک دو تم ظلم کے خرمن کو اُٹھ کر پھونک دو
کفر و باطل کو جہنم میں اٹھا کر جھونک دو

کفر کو کافور کردو، دین کی تنویر سے
ذبح کر دو ظلم کو اسلام کی شمشیر سے
وید و آزادیٔ جہاں کو بندشِ زنجیر سے
چیر دو گیتی کا سینہ نعرۂ تکبیر سے
نبضِ ہستی بند ہے، پھر مضطرب کردو اسے
سازِ عالم پر سکوں ہے، سوز سے بھر دو اسے

تم مجاہد ہو، اشدّاء علی الکفّار ہو
گر دنِ باطل پہ تم اسلام کی تلوار ہو
تم سراپا زندگی، غیور اور خود دار ہو
اپنی تلواریں نکالو اور شعلہ بار ہو
ہاتھ میں تلوار ہے تو در بغل قرآن ہو
قوت بازو بھی ہے گر قوتِ ایمان ہو

موت پر لبیک کہنا زندگی کا نام ہے
کاسۂ سر خوں سے بھرنا زندگی کا نام
مضطرب ہو کر بکھرنا زندگی کا نام ہے
اپنی آزادی پہ مرنا زندگی کا نام ہے
موت کی وادی میں ملتا ہے نشاں زندگی
موت سے پہلے نہیں ملتی ہے شانِ زندگی

مردِ مسلم کو ہے الفت جنگ کے میدان سے
کھیلتا ہے بے خطر ہر دم وہ اپنی جان سے
ڈر نہیں سکتا کبھی وہ فارس و ایران سے
ہے تعلق اس کو سعدؓ و خالدؓ و سلمانؓ سے
اے مجاہد اُٹھ کہ اب دنیا میں تیرا کام ہے
ہر مسلماں سے مرا اطہر یہی پیغام ہے

جوش وخروش

ابھی سینوں میں حُبِّ سیّد ابرار ﷺ رکھتے ہیں
ابھی بازو میں زورِ حیدر کرّارؓ رکھتے ہیں
ابھی دنیا میں شان خالدِ جرارؓ رکھتے ہیں
ابھی ہاتھوں میں ہم اسلام کی تلوار رکھتے ہیں
ابھی لشکر ہمارا برسرِ پیکار باقی ہے
ابھی ہاتھوں میں اپنے تیغِ جوہر دار باقی ہے

ہمارے کارنامے گردشِ افلاک سے پوچھو!
ہماری زد عدو کی دیدۂ نمناک سے پوچھو!
ہماری داستانیں کربلا کی خاک سے پوچھو!
ہماری شان تم طیبہ کی خاکِ پاک سے پوچھو!
حکایت ہے ہماری بر زباں اب تک زمانے کو
جہاں کے ذرّے ذرّے سے سنو رنگیں فسانے کو

کبھی باطل کے خرمن کے لیے برقِ تپاں آئے
کبھی اسپین میں ہم صورت طارقؒ عیاں آئے
چراغِ بزم بن کر ظلمتوں میں ضوفشاں آئے
محمد ابن قاسمؒ بن کے ہم ہندوستاں آئے
غرض ہر جا نظر آئے، ہواؤں میں، فضاؤں میں
کبھی دریا کی موجوں میں، کبھی کالی گھٹاؤں میں

مجاہد مسلموں کے جوشِ عالمگیر کا صدقہ
الٰہی! دے شہیدِ کربلا شبیرؒ کا صدقہ
ترے خاصانِ در کی آہِ پُر تاثیر کا صدقہ
جنیدؒ و شبلیؒ و رومیؒ وغیرہ پیر کا صدقہ
دعا اطہر کی ہے یا رب کہ ہم آزاد ہو جائیں
ترے یہ خانما برباد پھر آباد ہو جائیں

تقاضا

وہ غازی جن کے تلوے چومتیں تاروں کی تنویریں
نقوشِ پا سے جن کے بن گئیں غیروں کی تقدیریں

وہ غازی جن کے قدموں سے تھا لرزاں سینۂ گیتی
جبینِ دہر پر جن کے عیاں سطوت کی تحریریں

وہ غازی جن کے چہروں پر تھا رُعبِ فقر و استغنا
گرادیں جن کی تیور نے شہنشاہی کی تعمیریں

وہ غازی جن کے جھرمٹ میں اماں نے دم لیا آکر
تھے جن کے کارنامے آیتِ رحمت کی تفسیریں

وہ غازی جن کی تلواروں کی زد نے چھانٹ دی ظلمت
چمک اٹھیں شعاعِ مہر بن کر جن کی شمشیریں

زمانہ مضطرب ان کے لیے بیمارصورت ہے
زمانہ کو انھی قُدسیوں کی پھر ضرورت ہے

ضرورت ہے نظر آئیں تماشے پاکبازی کے
ضرورت ہے بِپھر جائیں عزائم مردِ غازی کے

ضرورت ہے خدا کے نیک بندے تیز گام آئیں
حرم سے سوئے بت خانہ بڑھیں لشکر نمازی کے

ضرورت ہے حنین و بدر کے فاتح مجاہد کی
بڑھو آواز دو حملوں کو مردانِ حجازی کے

ضرورت ہے غرض مندی کی وہ آئیں قضا بن کر
جبینِ صدق پر جن کی تھے جلوے بے نیازی کے

ضرورت ہے، فغانِ خلق کے فریادرس ہو کر
سوار آئیں وغا میں مسکراتے اسپِ تازی کے

جہانِ نو پئے افرادِ کہنہ، دردشد اطہرؔ
بیاباں بہر استقبالِ لیلیٰ گروشد اطہرؔ

تم اور ہم

تم ہو جدّ حریت اور ہم ہیں ابنائے غلام
تم ہو شمشیر برہنہ، اور ہم خالی نیام

تم سے دریاؤں میں ہلچل، آسمانوں میں خلل
ہم ہیں فرشِ فارغ البالی پہ محرومِ اجل

تم فضا میں اڑ رہے ہو، بن کے شاہین و عقاب
ہم ہیں اپنے آشیاں میں موردِ برق و عذاب

تم سزاوارِ امامت، ہم سزاوارِ سجود
تم سے اظہارِ مسرت، ہم سے حسرت کی نمود

تم متاعِ کارواں، ہم راستہ کے گرد ہیں
تم سراپا ناز ہو اور ہم غریقِ درد ہیں

تم صدائے جنگ ہو، ہم پیکر امن و اماں
تم ستم ایجاد ہو، ہم خوگرِ آہ و فغاں

پاس آسکتے نہیں ہم، تم ہو آقا ہم غلام
کر رہے ہیں دور سے ہم تم کو مجبوراً سلام

امیری اور مفلسی

اک طرف لیتے ہیں سیم و زرخزانوں میں ڈکار
اک طرف پھرتی ہے آوارہ غریبی کی پکار

اک طرف محوِ تبسّم مال و زر کی دیویاں
اک طرف مصروف گریہ بے گناہوں کی زباں

اک طرف عشرت کے نغمے تمکنت کے ساز سے
اک طرف ہے شورِ ماتم، دکھ بھری آواز سے

اک طرف معصومیت ہے اک طرف طغیان ہے
اک طرف ہے روح آدم، اک طرف شیطان ہے

اک طرف آسودگی ہے، اک طرف فاقات ہیں
اک طرف ہے چاندنی اور اک طرف ظلمات ہیں

اک طرف مسرور آنکھیں، اک طرف روتی نگاہ
اک طرف عصمت دری اور اک طرف خوفِ گناہ

یا خدا افلاس کو تو وجہ بربادی نہ کر
یہ تری نعمت ہے اس کو وقفِ ناشادی نہ کر

بہار

بہار آئے گی گلستاں میں ، خزاں کا اب اختتام ہوگا
مٹے گی ترتیب کہنگی کی، گلوں کا تازہ نظام ہوگا

نئی ہوائیں، نئے شگوفے، نئے ترانے، نئے زمانے
نئی نئی انجمن بنے گی، نیا نیا انتظام ہوگا

کہیں پہ نغمے مسرتوں کے، کہیں پہ جلوے صباحتوں کے
کہیں پہ چشمے حلاوتوں کے، یہی سماں صبح وشام ہوگا

گلوں سے مستی چھلک اُٹھے گی، ہوائے گلشن مہک اٹھے گی
خموش بلبل چہک اٹھے گی، بہار کا فیضِ عام ہوگا

گلوں سے بلبل گلے ملے گی، نگاہ نرگس کی ہنس پڑے گی
کسی سے دل کا نہ خون ہوگا، نہ جذبۂ انتقام ہوگا

رگِ فسردہ میں گلستاں کی بھرے گی روحِ حیات رنگیں
نسیم کا خوش گوار جھونکا، سموم کا قتلِ عام ہوگا

شرابِ کہنہ کی تلخ مستی سے بند ہے نبض مے پرستی
نئی شرابیں، نئے شرابی، نیا نیا دورِ جام ہوگا

بہار کے خوش گوار پربت پہ جھوم اٹھے گا ابرِ باراں
برس پڑے گی نگاہ ساقی، کہیں کوئی تشنہ کام ہوگا

عزمِ تعمیر

اگر قسمت سے ہو اک بلبلِ شیریں زباں پیدا
تو ہو سکتی ہے گلشن میں بہارِ جاوداں پیدا

گوارا کر نہیں سکتی یہ ذِلّت، غیرتِ سجدہ
کروں گا خود ہی ہر سجدے سے لاکھوں آستاں پیدا

پرانی داستانیں سننے والے غور فرمائیں
کروں گا تلخ نغموں سے نئی اک داستاں پیدا

تو پھر اک پھول بھی کیوں بچ رہے صیاد کے ہاتھوں
چمن کے لوٹنے والے ہوئے جب پاسباں پیدا

بدل دیں جو نظامِ زندگی کی شاہراہوں کو
وطن میں میرے یا رب! ہوں کچھ ایسے نوجواں پیدا

سرِ منزل پہنچنا ہے رہِ منزل میں گم ہوگا
کرے مشکل کوئی کیوں کارواں دَر کارواں پیدا

صدا دیتے ہیں ذرّے کار زارِ زندگانی کے
یہاں مٹنے سے ہوتی ہے، حیاتِ جاوداں پیدا

پرانے قہقہوں سے مُردنی چھائی ہے اے اطہرؔ
مجھے آہوں سے کرنا ہے نیا ہندوستاں پیدا

ترانۂ جہاد

جانباز و سر فروش وغا میں بڑھے چلو

جانباز و سخت کوش بہادر سپاہیو!
ملت کے سر فروش بہادر سپاہیو!
تیغ و کفن بدوش بہادر سپاہیو!
جانباز و سر فروش وغا میں بڑھے چلو

ہمت شکن جفاؤں پہ ہنستے چلے چلو
صبر آزما بلاؤں پہ ہنستے چلے چلو
اعدا کی کج اداؤں پہ ہنستے چلے چلو
جانباز و سر فروش وغا میں بڑھے چلو

تم کو تمہاری اٹھتی جوانی کی ہے قسم
شمشیر تیز روکی روانی کی ہے قسم
مظلوم کربلا کی کہانی کی ہے قسم
جانباز و سر فروش وغا میں بڑھے چلو

ہے خوں سے لالہ زار مجاہد کی زندگی
ہے تیغ آبدار مجاہد کی زندگی
ہے جنگ کی پکار مجاہد کی زندگی
جانباز و سر فروش وغا میں بڑھے چلو

دنیا کو ہے قدومِ مجاہد کا انتظار
ڈوبی ہوئی ہے درد میں احساس کی پکار
ہنگامِ گیرودار میں سستی ہے ناگوار
جانباز و سر فروش وغا میں بڑھے چلو

عزمِ مومن

سایۂ شمشیر میں یہ کار کر سکتا ہوں میں
جذبۂ آزادی کا اظہار کر سکتا ہوں میں

جس میں آزادی سے ہو نہ سانس لینا بھی نصیب
لعنت ایسی زیست پر سو بار کر سکتا ہوں میں

آج بھی پابندیِ رسمِ خلیل اللہ سے
آتشِ نمرود کو گلزار کر سکتا ہوں میں

اسوۂ یوسف ہے زنداں میں شریکِ زندگی
حلقۂ زنجیر سے بھی پیار کر سکتا ہوں میں

ہم نشیں! طائف کے ان خوں پوش لمحوں کی قسم
زندگی کو خو گرِ آزار کر سکتا ہوں میں

یاد ہے مجھ کو ابھی رسمِ خُبیبِ پاکباز
ہنس کے پوری آرزوئے وار کر سکتا ہوں میں

میں مجاہد ہوں، بحقِ غازیانِ صف شکن
آج بھی نیزوں کو شعلہ بار کر سکتا ہوں میں

چھیڑ کر اطہر! سرِ بزمِ وغا سازِ جہاد
اپنے ہر اِک شعر کو تلوار کر سکتا ہوں میں

شخصی مرثیے
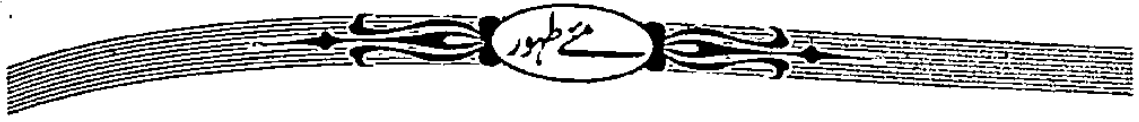
مولانا شکر اللہ

یہ نظم اس وقت کہی گئی جب کہ جدید جامع مسجد مبارک پور (اعظم گڈھ) کے بانی استاد محترم حضرت مولانا شکر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ انتقال فرما چکے تھے اور مسجد مذکور ادھوری پڑی ہوئی تھی۔ (اطہر)

فدائے قوم و مذہب، ملّتِ بیضا کا دیوانہ
مہِ چرخِ ہدایت یعنی شکر اللہ مولانا

بنائے مدرسہ کو جس نے پہنچایا ثریا تک
اسی ساقی نے بخشا ہم کو علمِ دیں کا پیمانہ

گیا بھی کاروانِ گم شدہ کی رہبری کر کے
مگر اس مردِ خود آگاہ کو ہم نے نہ پہچانا

بنایا جامعِ مسجد کو جس نے مقصدِ ہستی
رہا فکرِ حسیں میں لذّتِ دنیا سے بے گانہ

پھڑک جاتا ہے گلشن میں ابھی خلد آشیاں طائر
حریمِ قدس میں آتی ہے جب یادِ خدا خانہ

نئی راہیں کھلیں جن کی نگاہوں کے اشارے سے
ہوئیں وہ بند آنکھیں اور ہم کو دور ہے جانا

جہاں شمعیں جلائی ہیں، وہ گلیاں اب بھی روشن ہیں
مسلماں اب بھی رہتے ہیں وہاں پر مثلِ پروانہ

وہ اندازِ نظر، وہ طرزِ بینش ہم کہاں پائیں
مگر ہر ایک ہم میں ہے اسی محفل کا پروانہ

نظر خونبار ہے، مرحوم کی پھر یاد آتی ہے
کہے جاتی ہیں آنکھیں اپنی ناکامی کا افسانہ

مسلمانو! یہ تکمیل بنائے جامعِ مسجد
انھیں کی آرزوئے زندگانی کا ہے بَرلانا

ہمیں اور آپ کو، اللہ کا یہ کام کرنا ہے
نہ خود وہ ہیں، نہ ان کا جوش ہے، نہ ان کا فرمانا

خیالِ حضرتِ استاد دل سے جا نہیں سکتا
مجھے اطہر بہت کچھ دے گئے ہیں میرے مولانا

تصویرِ درد

(والدۂ مرحومہ کی یاد)

یہ ناتمام "تصویرِ درد" مولانا مرحوم کے کاغذات میں ملی ہے کہیں کہیں ایک ایک، دو دو شعر کی جگہ خالی چھوڑی گئی ہے جو بعد میں مناسب اور برمحل اشعار سے پُر کرنے کے لیے ہی چھوڑی گئی ہے۔ مگر مولانا کے تحقیقی و علمی مشاغل نے انھیں اس کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا"۔ (مرتب)

درد تھا، رنج و اَلم تھا، غم تھا اور اک رات تھی
رات کیا تھی؟ بہرِ دل افسانۂ آفات تھی

ذرّے ذرّے پر تھا چھایا نیند کا بوجھل خمار
خواب کی شہزادیاں دوشِ فضا پر تھیں سوار

پڑ رہا تھا ہر طرف پہرا اندھیری رات کا
وادیِ ظلمات میں تھا، کارواں ظلمات کا

موج زن خاموشیاں تھیں کاہ سے تا کہکشاں
معبدِ احساس میں جذبات دیتے تھے اذاں

روح میری یک بیک دنیا سے گھبرانے لگی
جانے کیوں ایسے میں یادِ والدہ آنے لگی

عہدِ ماضی کا نگاہوں میں سماں پھرنے لگا
لاشۂ طفلی پہ خونِ نوجواں گرنے لگا

مرتعش ہونے لگے جذبات دل کے داغ میں
لے کے پہنچا غم مرا، مجھ کو اندھیرے باغ میں

اس کے اک گوشے میں جانِ زندگانی دفن ہے
میرا بچپن دفن ہے، میری جوانی دفن ہے

میری زندہ آرزوؤں کا یہیں مدفن بنا
.... [1]

ہو رہا تھا تمکنت کا ذرّہ ذرّہ سے ظہور
سارے گورستاں پہ چھایا تھا خموشی کا غرور

انقلاب ان بستیوں کو آنکھ دکھلاتا نہیں
جنگ کا دورِ تباہی بھی کبھی آتا نہیں

اس جگہ فانی مظاہر کا نہیں ہرگز گزر
ایک ہی حالت میں رہتی ہیں یہاں شام و سحر

آدمی کو آدمی اس ملک میں کھاتا نہیں
یاں امیری اور غریبی کا سماں بھاتا نہیں

---

[1] دوسرا مصرع مولانا نے کسی اور وقت کہنے کے لیے جگہ چھوڑی تھی۔

یاں کے انساں رہتے ہیں انساں کی سفا کی سے دور
فحش گوئی، بد نہادی، بیر، ناچاقی سے دور

اس گلستاں پر خزاں کا بس نہیں چلتا ذرا
یاں بہاریں بھی دبا کر پاؤں چلتی ہیں سدا

زندگی ہی زندگی ہے اس سکوں آباد میں
موت کا خطرہ نہیں اس خطۂ آزاد میں

کھو چکے تھے میرے نالے غم زدہ ہیجان میں
کاروانِ اشک تھا رخسار کے میدان میں

بہرِ تربت یوں فراغت تھی گلوں کے ہار سے
دل کے ٹکڑے بہہ رہے تھے دیدۂ خونبار سے

یک بیک جذباتِ غم، گفتار میں ڈھلنے لگے
تیر سینے کے زباں کی راہ سے چلنے لگے

بول اٹھی انبارِ غم سے ہو کے بے قابو زباں
آپ کا لختِ جگر ہے سامنے اے میری ماں

اب کوئی نغمات زیرِ لب سنا سکتا نہیں
اب کوئی جذباتِ فطری کو جگا سکتا نہیں

اب گھٹائیں لاکھ برسیں لطف مل سکتا نہیں
گلشنِ پا مال اپنا آہ کھل سکتا نہیں

کس طرح ہم نے سلایا جا گتی امید کو
کس طرح ہم نے بنایا ہے محرّم عید کو

چاندنی راتوں نے گرمی میں ستایا کس طرح
لمبی لمبی سرد راتوں نے جگایا کس طرح

کس طرح سے ہم جیے ہیں آپ کے مرنے کے بعد
آپ تو گھر کو نہیں لوٹیں سفر کرنے کے بعد
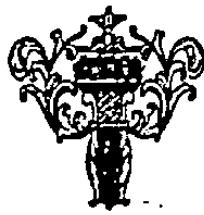
ممتاز احمد[1]

ابن مولوی عبدالحی آثر قاسمی مئوناتھ بھنجن کی وفات پر

آہ کہ ممتاز احمد چل بسا
دیدہ و دل کا سہارا ہائے ہائے

غرقِ طوفانِ حوادث ہوگیا
بحرِ مقصد کا کنارا ہائے ہائے

چھپ گیا دے کر جھلک اک نور کی
صبحِ طفلی کا وہ تارا ہائے ہائے

گلشنِ طفلی میں تھا صرفِ نوا
دفعتاً کس نے پکارا ہائے ہائے

یاد جب آتا ہے وہ تسکینِ دل
ہوتا ہے دل پارہ پارہ ہائے ہائے

اس کی فرقت گو مجھے تھی ناگوار
کر لیا خود ہی گوارا ہائے ہائے

یا خدا میرے آثر کو صبر دے تسکین دے
ہے تری مرضی پہ راضی وہ بے چارہ ہائے ہائے

---

[1] ممتاز احمد کی وفات ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ / ۷ مئی ۱۹۴۲ء کو ہوئی تھی۔

مرثیة العلامة السید سلیمان الندویؒ

و توفی رحمه الله فی کراشی بُعید صلوة المغرب لیلة یوم الاحد
ربیع الاوّل ۱۳۷۳ھ نوفمبر ۱۹۵۳ء

فقداً یا عینُ جودی بالدموع السّواکب
علی نعی مَن لیس الینا بآئب

امامٍ، جلیلٍ، سیدٍ عالم الوریٰ
سلیمان ملك العلم، للفضل جالب

تقیٍ، نجیبٍ عبقریٍ، سمیدعٍ
تملّك کنزاً مخفیاً من مواهبٍ

خطیبٍ، علیمٍ، منشئٍ و مورخٍ
تضلع من جمّ العلوم العجائب

فجعنا بفقدان الامامین قبله
ومن زهرة الدنیا دفعنا بجانب

یالهفی بشبیرؒ الفقیه المحدث
واسفی علی المفتی کفایةؒ غائب

ویا ضیعة للعلم والفضل والتقیٰ
بموت سلیمان الفقید المجانب

وقد درب شبلی شبله فی عرینه
بحیث هو فازباعلی المناصب

واصدره شبلی بحلقة علمه
لیحیٰ مع الترحیب بین الاقارب

ولٰکن "باعظم کنز" توفیٰ وشبله
توفی بباکستان بین الاجانب

وهذا ، قضاء الله ماله دافع
ولیس علی ماشاء احدٌ بغالب

اذانِ کعبہ
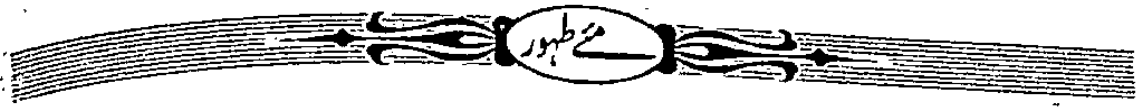
تقدیم

(علامہ انور صابری)

قاضی اطہر مبارک پوری ہندوستان کے ان ممتاز ارباب علم میں شمار ہوتے ہیں، جن کے لفظوں میں معانی کے ہزاروں بیش قیمت خزانے پنہاں ہوں۔

میں انھیں تقریباً دس پندرہ سال سے جانتا ہوں۔ ان کی صورت مولوی کی ہے، نگاہ عاشق کی، دل درویش کا اور دماغ فلسفی کا ہے۔ ان عناصرِ حیات کے مجموعہ کا نام ہے "اطہر قاضی"۔

زیرنظر مجموعہ کو میں نے بغور پڑھا وہ ایک خالص خشک موضوع سے متعلق ہے۔ مگر قاضی صاحب کی رنگیں طبیعت اور حسین مزاج نے اس کے لیے بھی رنگیں الفاظ اور حسین اندازِ بیان تلاش کر ہی لیا۔ بعض مقامات پر کچھ ایسی لغزشیں بھی ہوگئی ہیں، جو نہ ہوتیں تو عصمتِ نظم مجروح ہو جاتی۔

مذہبی نظم میں غزل کا مزاج شامل کرنا غلطی بھی ہے اور بہترین خوبی بھی، اب یہ فیصلہ میں آپ کے ذوقِ نظر پر چھوڑتا ہوں کہ اس قسم کی لغزش کا صحیح مقام نظم میں معلوم کریں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ اسے لغزش سمجھتے ہیں یا خوبی؟

میرا ذمہ ہے کہ جن جن مذہبی حلقوں میں یہ نظم پہنچے گی، وہاں خدمتِ مومن کے جذبات یقیناً بیدار ہوں گے اور تعمیرِ مساجد سے گزر کر شعورِ بندگی کی حقیقی تعمیر کا تصور بھی عمل آشنا ہو سکے گا۔

(علامہ) انور صابری

بمبئی ۱۷ر مارچ ۱۹۵۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

اس مجموعہ میں وہ تمام اشعار جمع کر دیے گئے ہیں، جو حضرت الاستاذ المرحوم مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری کے زیرِ سایہ کہے گئے اور جن کی وجہ سے مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کی جدید جامع مسجد اور عیدگاہ کے لیے لاکھوں روپے وصول ہوئے۔

مولانا مرحوم فقیرانہ بھیس میں اپنے ہمراہیوں کا مجمع لے کر جھنڈے کے ساتھ مسلمانوں کے دروازوں پر صدا لگاتے تھے اور ان شعار کو پڑھواتے تھے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس دور میں خدا نے مجھے کون سی طاقت عطا فرمائی تھی کہ برجستہ، برمحل اور بروقت یہ اشعار خود بخود نکلتے تھے۔ ایک ایک دن میں کئی کئی نظمیں ہو جاتی تھیں۔ پھر مولانا مرحوم کے وصال کے بعد ان کے تعمیری کاموں کی تکمیل کے لیے ہم نے ان ہی کی راہ اختیار کی۔

یہ نظمیں چاہے فنّی اعتبار سے کیسی ہوں مگر اخلاص و ایثار اور دیانت و روحانیت کے لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ ایک ایک نظم پر مسلمانوں نے پانچ پانچ ہزار اور دس دس ہزار کی رقم مسجد کے لیے عطا کی ہے۔ اور یہ چیز ان نظموں کی قبولیت کی کھلی دلیل ہے۔

یہ نظمیں ضلع اور دوسرے مقامات پر مسجدوں کی تعمیر کے موقع پر اکثر و بیشتر کام آئی ہیں اور ان کی نقل متعدد جگہوں پر جا چکی ہے۔ یہ نیز بھی ان کی قبولیت کی کھلی دلیل ہے۔ چوں کہ اس سلسلہ کے مجرب اور آزمودہ نسخے پہلے سے میرے پاس محفوظ تھے، اس لیے میں نے ان ہی جانے پہچانے اور کامیاب اشعار کو یکجا نقل کر دیا ہے اور اس میں ان تمام نظموں کو لکھ دیا ہے جو مسجدوں کی تعمیر میں خاص طور سے مفید ثابت ہوئی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے فائدہ پہنچائے اور مساجد کے بانیوں کی طرح ان اشعار کے کہنے والے کو بھی "مُعَمِّرِ ین مساجد اللّٰہ" کی صف میں جگہ دے۔ آمین

۲۶؍رجب ۱۳۷۱ھ	قاضی اطہر مبارک پوری
۲۲؍اپریل ۱۹۵۲ء سہ شنبہ	اسسٹنٹ اڈیٹر روزنامہ "انقلاب" بمبئی

اذانِ کعبہ

وہ شکراللہ جو گرتے ہوئے کو تھام لیتا تھا
وہ شکراللہ عزمِ خاص سے جو کام لیتا تھا
وہ شکراللہ نامِ حق جو صبح و شام لیتا تھا
وہ شکراللہ جو مسجد کا ہنس کر نام لیتا تھا
مسلمانو! اُسی مردِ خدا کا کام کرنا ہے
بنائے مسجد جامع کا اب اتمام کرنا ہے[1]

ضرورت ہے کہ دینِ مصطفیٰ کا نام روشن ہو
ضرورت ہے کتابِ رہنما کا نام روشن ہو
ضرورت ہے عتیقِ با صفا کا نام روشن ہو
ضرورت ہے شہیدِ کربلا کا نام روشن ہو
خدا کی راہ میں مردِ مسلماں کام آجائے
تمنا ہو کہ پہلی صف میں اپنا نام آجائے

[1] مولانا کی بیاض جوانھیں کے قلم سے ''اذانِ کعبہ'' کے نام سے مرتب ہوئی ہے اس میں یہ بند شامل نہیں ہے، مگر قاری انوار الحق مبارک پوری مرحوم متوفی ۷/جنوری ۲۰۰۱ء کی بیاض میں یہ بند موجود ہے۔ قاضی صاحب نے بعد میں نقل تیار کرتے وقت اس بند کو وقتی چیز سمجھ کر قلم انداز کر دیا ہوگا، مولانا شکراللہ مبارک پوری کے نام کی وجہ سے اس بند کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے۔ اس لیے قاضی صاحب کی شعری یادگار کے طور پر اس کو شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

خدا کا گھر بنائے بندۂ نادار قسمت ہے
خدا کا کام ہم سے ہو تو پُر انوار قسمت ہے
مسلماں جاگ اب تو بھی، تری بیدار قسمت ہے
جہانِ سرد میں یہ گرمیِ بازار قسمت ہے
مسلماں ایسے نادر وقت میں دل کھول دیتا ہے
خدا پیسوں کے بدلے آج جنت مول دیتا ہے

ہمیں درکار ہیں پھر ساقیِ کوثر کے دیوانے
سنیں جو کان رکھ کر محفلِ ملت کے افسانے
ہمیں درکار ہیں شمعِ شہ بطحا کے پروانے
جنھیں اپنا بنایا ہے جہاں میں شاہ بطحا نے
دلوں سے کام لو بہرِ خدا اے با صفا لوگو!
وہ دیکھو سامنے خلدِ بریں کا راستا لوگو!

◎

فرشتوں میں جو گائے جارہے ہیں
وہی نغمے سنائے جارہے ہیں

گھٹا چھائی محبت کی دلوں پر
کھلا میخانۂ یثربؔ کا ہے در
ہے گردش میں مئے عرفاں کا ساغر
پیے جاؤ مسلمانو! برابر
مرے ساقی پلائے جا رہے ہیں

ہے مسجد دیکھ اسے دیدہ وری سے
خدا ملتا ہے اس جا بے خودی سے
سن اے مسلم! چراغِ عاشقی سے
سجودِ بندگی کی روشنی سے
یہاں جلوے بنائے جا رہے ہیں

ستاروں کی یہ پھیکی روشنی پر
مہ کامل کی ہلکی چاندنی پر
شعاعِ مہر کی جلوہ گری پر
فلک کی بے حقیقت برتری پر
منارے مسکرائے جارہے

گلستاں بن گیا جو "بن" رہا ہے
بنا فردوس جو گلشن رہا ہے
درِ کعبہ کا نقشہ بن رہا ہے
کوئی خیمہ زمیں پر تن رہا ہے
ستوں جنت سے لائے جارہے ہیں

تری نیت میں ہو اخلاص کاری
خدا جانے پھر آئے کب یہ باری
کیے جا اس چمن کی آبیاری
کرم کا سلسلہ رہنے دے جاری
ابھی جذبے تو پائے جارہے ہیں

ہم اس کو اُخروی دولت سمجھ کر
خلیل اللہ کی سنت سمجھ کر
ہم اطہر دین کی شوکت سمجھ کر
جہاں میں قلعۂ ملت سمجھ کر
خدا کا گھر بنائے جارہے ہیں

نظر جب جب اٹھائی جا رہی ہے
جھلک کعبہ کی پائی جا رہی ہے

نظر میں نور پیدا ہو رہا ہے
یہ دل شادِ تمنا ہو رہا ہے
زمیں پر عام چرچا ہو رہا ہے
فلک پر شور برپا ہو رہا ہے
کوئی مسجد بنائی جا رہی ہے

بناؤ مسجد و منبر بناؤ
کماؤ دولتِ عقبیٰ کماؤ
بڑھاؤ دین کی شوکت بڑھاؤ
بلاؤ روحِ حاتم کو بلاؤ
یہاں ہمت دکھائی جارہی ہے

مسلماں حُبِّ دنیا کی نہ لت لا
خیالِ خام ہرگز دل میں مت لا
یہ مسجد ہے، جبیں کو اس جہت لا
مسلماں تو خدارا مجھ کو بتلا
یہ دولت کیوں کمائی جارہی ہے

مسلماں سن ذرا گوشِ صفا سے
مسلماں کام لے جود و سخا سے
مسلماں جوڑ رشتہ مصطفٰے سے
مسلماں تیری مذہب سے خدا سے
محبت آزمائی جا رہی ہے

تعالی اللہ یہ پُر نور مسجد
حقیقت میں ہے رشکِ حور مسجد
ہے چشمِ خاص کی منظور مسجد
سدا اطہر رہے معمور مسجد
بہت بہتر بنائی جا رہی ہے

◎

ہزاروں چیز ہیں دنیا میں لیکن ایک بہتر ہے
فلک بولا کہ میں رُتبہ میں کل دنیا سے اعلیٰ ہوں
زمیں بولی کہ میں جلوہ گری میں تجھ سے بالا ہوں
کہا سورج نے میں تنویر میں سب سے نرالا ہوں
تو بولا چاند کہ میں حُسن کے گلشن میں لالہ ہوں
ندا آئی کہ یہ بالکل غلط ، مسجد منوّر ہے

کہا زہرہ نے ہے میرا ترانہ دارِ منصوری
ثریا نے کہا میری جبیں ہے محفلِ نوری
تو بولی کہکشاں میرے سوا سب کو ہے مجبوری
کہا پھر مشتری نے میں فلک پر شمعِ کافوری
ندا آئی مسجد کا قطب تم سب سے بہتر ہے

بیاباں نے کہا وسعت ہے مری دامنِ لیلیٰ
تو گلشن نے کہا ہے صحن میرا حسن میں یکتا
کہا دریا نے ہے دامن مرا موتی کا گہوارہ
پہاڑوں نے کہا دنیا میں ہم ہیں برتر وبالا
ندا آئی نہیں جس خاک پر اللہ کا گھر ہے

ترانے کہہ رہے تھے زینتِ بزمِ سخن ہم ہیں
چمن والوں میں چرچا تھا کہ شمعِ انجمن ہم ہیں
ستاروں کا یہ دعویٰ تھا کہ نورانی چمن ہم ہیں
فلک پر شور برپا تھا کہ بس جلوہ فگن ہم ہیں
ندا آئی کہ ناداں روشنی محراب و منبر ہے

گلستاں میں کیا بلبل نے دعویٰ اپنی الفت کا
جہانِ حسن نے جلوہ دکھایا اپنی زینت کا
خیال آیا زرو اموال کو بھی اپنی قیمت کا
کیا دعویٰ شہنشاہوں کے درباروں میں شوکت کا
ندا آئی کہ مسجد کے سوا ہر چیز کمتر ہے

کبھی گھبرا نہیں سکتا مسلماں بارِ مسجد سے
سکوں ملتا ہے اس کے آبلہ کو خارِ مسجد سے
بکھرتے ہیں ترانے مغفرت کے تارِ مسجد سے
سنا ہے محفلِ عشاق نے دربارِ مسجد سے
ندا آئی کہ پُرنغماتِ دیں سے سازِ اطہر ہے

◎

چھڑ گئی مسجد تو پھر پوری کرانی چاہیے
آبِ زر سے پیاس مسجد کی بجھانی چاہیے

چند پیسے کی حقیقت کیا ہے اے مردِ سخی
وقت آجائے تو گردن بھی کٹانی چاہیے

بعد مرنے کے جو دنیا میں سدا قائم رہے
اے مسلماں وہ حیاتِ جاودانی چاہیے

پرورش پاتا رہا آغوش میں تعمیر کی
اب خدا کے گھر کو لیکن نوجوانی چاہیے

کھول دریائے سخاوت اپنے دِل کا کھول دے
آج اصحاب نبی کی یاد آنی چاہیے

بچے، بوڑھے، نوجواں، یا مرد وعورت جو بھی ہوں
آج ہر مسلم کی ہمت کو روانی چاہیے

نقشۂ مسجد میں ہم کو رنگ بھرنا ہے ابھی
محفلِ اخلاص میں رنگیں کہانی چاہیے

◎

چھائی ہوئی دلوں پہ اک کیفیتِ بہار ہے
اللہ کے حضور میں مسلم تو چل پکار ہے

سب کو ملی ہے روشنی، اس سے جو ہے مرا نبی
صدفِ جہاں میں ایک ہی گوہرِ آبدار ہے

مسجد کا دل سے نام لے، ہوش و خرد سے کام لے
دامانِ دیں کو تھام لے ، رستہ یہ استوار ہے

طوفاں میں گو خروش ہے، لہروں میں گرچہ جوش ہے
لیکن جو تجھ کو ہوش ہے، بیڑا یہ دیں کا پار ہے

منبر و در، ستوں، مینار، اِن میں ہر اک ہے پائیدار
مری نظر میں شے یہ چار مظہرِ چاریار ہے

اللہ کے گھر کو دیکھیے محراب و در کو دیکھیے
رنگیں ہنر کو دیکھیے کیسا حسیں منار ہے

مسجد کی چوم لے جبیں، نیکی یہ کر لے تو یہیں
آج اگر ہے کل نہیں، دولت یہ مستعار ہے

کتنے ہیں اونچے کنگرے کیسے بنے ہرے بھرے
حیرت سے دیکھتے رہے کتنا حسیں نگار ہے

اطہرؔ یہی کہا کرو لوگوں سے التجا کرو
پوری مری بنا کرو، مسجد کی یہ پکار ہے

(۱۱)

میکدے کا در کھلا اب شور نوشا نوش ہے
حلقۂ میخوار میں ساغر بھی خود مدہوش ہے

لٹ رہا ہے آج کل جامِ مئے حُبِّ نبی
کچھ نہ پوچھو آج کل ساقی کو کتنا جوش ہے

گلشنِ ملت میں برپا ہوگئی رنگیں بہار
صحنِ گلشن دولتِ ایماں سے لالہ پوش ہے

بھر دو دامن جامع مسجد کا کہ جنت شوق سے
تم کو لینے کے لیے کھولے ہوئے آغوش ہے

ہے سوا نیزہ پہ سورج تو نہیں کچھ غم ہمیں
کالی کملی شاہِ دیں کی حشر میں سرپوش ہے

ہم کو رحمت آزماتی ہے، نئے انداز سے
دیکھنا ہے آج اطہر کس میں کتنا جوش ہے

◎

شبابوں پہ ہے اب گلستانِ جنت
مسلمان ہوتے ہیں مہمانِ جنت

شہ دو جہاں کی شفاعت کے صدقے
ہمارے سروں پہ ہے دامانِ جنت

جو کرنی ہے نیکی تو کرلے مسلماں
کہ پورا یوں ہی ہوگا ارمانِ جنت

جو مسجد کی یارو! پکار آج سن لیں
تو کل خود پکارے گا رضوانِ جنت

دیے چار پیسے جو مسجد کو تم نے
بنے جارہے ہیں وہ سامانِ جنت

خدایا ترے پاک بندوں کے صدقے
ہو اطہر کو بھی اذن و فرمانِ جنت

◎

حور و غلماں کی زباں پر مرحبا کا ساز ہے
جنت الفردوس کس کے واسطے اب باز ہے

کان رکھ کر جو سنا ہم نے دلِ مسلم کے پاس
اس کی ہر دھڑکن میں مسجد کی حسیں آواز ہے

کیا کہا اللہ نے، معراج میں سرکار سے
کچھ نہ پوچھو دوستو! یہ خاص ان کا راز ہے

جیب سے پیسہ نکلواتی ہے جنت کے لیے
دوستو! اللہ کی رحمت کا یہ بھی ناز ہے

چھڑ گئی تعمیر مسجد ایسے نازک دور میں
خالق کونین کا اس میں بھی کوئی راز ہے

تھیں خطائیں لاکھ، لیکن ہم کو جنت مل گئی
رحمتِ باری تعالیٰ کا جدا انداز ہے

اک اشارے میں ہوئے جاتے ہیں ٹکڑے چاند کے
ایک انگلی میں شہِ خوباں کی یہ اعجاز ہے

کیا وہ دیں گے، سامنے خود آہی جائے گا ابھی
اطہر ناداں! ترا بالکل غلط انداز ہے

◎

محفلِ میخوار کا گردش میں پیمانہ رہے
دل ہمارا ساقیا! پھر کیوں نہ مستانہ رہے

مے گسارانِ حرم، سیراب ہوتے ہی نہیں
دور میں ساقی ترا ہر وقت پیمانہ رہے

لطف جب آئے کہ ہو ابرِ سخا چھایا ہوا
اور دیں کے میکدے میں شورِ مستانہ رہے

پھر بلالی شان سے ہو اپنی مسجد میں اذاں
نغمۂ ناقوس بھی وحدت کا دیوانہ رہے

چند پیسے دے اگر تعمیرِ مسجد کے لیے
کل ترا فردوس میں لاریب کا شانہ رہے

مر گئے دارا سکندر کیا رہا؟ کچھ بھی نہیں
تو اگر دے، تا قیامت یہ خدا خانہ رہے

بال سے باریک رستے کا ہمیں خطرہ نہیں
امتی کافی، نبی کا لب سے فرمانا رہے

گرمیِ روزِ جزا کی جب بڑھے اطہرؔ تپش
ابرِ رحمت بن کے سر پر یہ خدا خانہ رہے

پھر سخاوت کی زباں پر ہے ترانہ جو د کا
سر پہ لہراتا ہے جھنڈا، اُخروی بہبود کا

اے مسلماں! یاد کر اسلاف کی تو داستاں
امتحاں ہوگا ابھی تجھ سے، ترے معبود کا

جانے کیسے عطر سے مالی نے سینچا تھا اسے
فیض ہے اب تک چمن میں بوئے لا محدود کا

تو عطا کر اپنی اس مسجد کو اتنا مال و زر
بول اٹھے، بھر گیا دامن مرے مقصود کا

ایک مسجد کے عوض توفیق جنت کی ملی
شکریہ لازم ہے سب پر خالقِ مسجود کا

ساقیِ جو دو سخا یوں عام مے کا جام کر
ذوقِ میخواری ہو پورا مجمعِ موجود کا

آج نورالعین اور اطہر نے مل کر ساتھ ساتھ
دس منٹ میں کام پورا کر دیا بہبود کا

◎

باغِ جنت کی ہوائے مشک بار آنے لگی
گلشنِ اسلام میں تازہ بہار آنے لگی

آرہا ہے آج دریائے سخاوت جوش پر
موج بن کر رحمتِ پروردگار آنے لگی

"من بنیٰ" مسجد ہے فرمانِ رسولِ دو جہاں
قصرِ جنت کی جھلک اب آشکار آنے لگی

چار دیواریں ہیں یا قصرِ خلافت کی بنا
ہر منارہ سے صدائے چار یار آنے لگی

اطہرِ نالاں، یوں ہی معمور رہ فریاد سے
شکرِ رب، تیری صدا بر روئے کار آنے لگی

◎
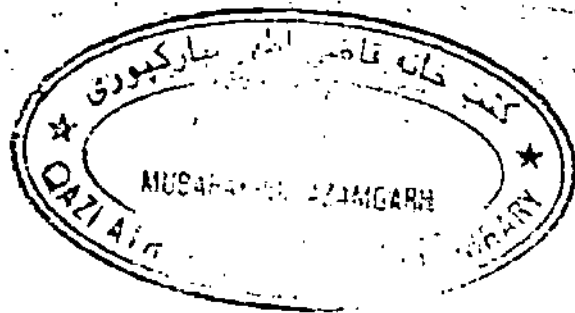
ہر در پہ لگاتا ہوں میں نعرۂ مستانہ
ملت کا فدائی ہوں، صورت ہے فقیرانہ

بھر دے مرے دامن کو ایثار کے پھولوں سے
میں مانگنے آیا ہوں، اسلام کا نذرانہ

ہے شانِ غنا ظاہر، دریوزہ گری سے بھی
اک ہاتھ میں جھنڈا ہے، اک ہاتھ میں پیمانہ

اسلام کی الفت میں جَل بھُن کے تو روشن ہو
تو شمعۂ ملت کا لاریب ہے پروانہ

انگشت بد نداں ہو دنیا کی ہر اک طاقت
دکھلا دے ذرا بڑھ کر تو ہمتِ مردانہ

اطہر کی دعاؤں میں یا رب تو اثر دیدے
ہر آن دعا گو ہے، بن جائے خدا خانہ

◎

میں سائل ہوں در پر ترے، تو غنی ہے
میں مسکین و محتاج ہوں تو دھنی ہے

چلو حشر میں تم سوئے ظِلِ رحماں
کہ محشر میں رحمت کی چادر تنی ہے

نہ گھبراؤ محشر کی گرمی سے ہرگز
وہ دیکھو کہ رحمت کی چھاؤں گھنی ہے

ملے خلد میں ہم کو انعام، چادر
وہ جو نور کے ریشموں کی بنی ہے

اگر نامِ احمد پہ جاں اپنی دیدے
تو اطہر کی عقبیٰ و دنیا بنی ہے

◎

فضا میں واہ لہراتا ہے کیسی شان کا جھنڈا
مسلمانوں کے دین و ملت و ایمان کا جھنڈا

عمرؓ کی آن کا جھنڈا، علیؓ کی بان کا جھنڈا
رسول اللہ کی ناموسِ عالی شان کا جھنڈا

جہاں میں پرچمِ اسلام اڑا ہے جس کی قوت سے
ہے بوبکرؓ و عمرؓ اور حیدرؓ و عثمانؓ کا جھنڈا

اسی جھنڈے کے سائے میں مسلمانو! سعادت
ہے
سمجھ رکھو یہ ہے فتحِ عظیم الشان کا جھنڈا

مسلمانوں سے اطہرؔ تم کہو پُر زور لفظوں میں
کہ رکھ لو اِس کی عزت، ہے خدا کی شان کا جھنڈا

◎

ملّتِ احمدِ مرسل کے نگہبان بنو
مومنو! عظمتِ اسلام کے سامان بنو

ہر اشارے پہ ہوا للہ کے، گردن حاضر
یعنی اسلام کے سانچے میں مسلمان بنو

خالدی جوش ہو، حیدرؓ کی شجاعت بھی ہو
اور ایثار میں تم بوذرؓ و سلمانؓ بنو

لو سبق نصرتِ اسلام کا صدیقؓ سے تم
خرچ لِلّٰہ کرو معنیٔ عثمانؓ بنو

کردو آباد مساجد کو مسلمانو! تم
صف بہ صف ہو کے کھڑے رب کے ثنا خوان بنو

اجرِ بے حد کے لیے شرط ہے قرضِ حسنہ
باغِ جنت کے لیے عاملِ قرآن بنو

حامیِ دین بنو، دین پہ شیدا ہوکر
عظمتِ دین کی اس دور میں پہچان بنو

کیا حقیقت مال کی ہے خوں بہایا کیجیے
نیک کاموں کے لیے دولت لٹایا کیجیے

کام وہ کیجے کہ جس میں ہو رضائے مصطفیٰ
ہر قدم نقشِ شریعت پر ہی رکھا کیجیے

سرخروئی کے لیے لازم ہے قربانی کریں
دردِ دل کے واسطے کچھ چوٹ کھایا کیجیے

زینتِ مسجد بڑھائیں اور لگا کر چار چاند
قلب کی تاریکیوں میں نور پیدا کیجیے

بعد مردن کام آجائیں گے صدقے آپ کے
امتحاں کے واسطے کچھ یہ بھی سودا کیجیے

عرضِ اطہر ہے یہی کہ بن کے تصویرِ عمل
پھر رخِ اسلام پر دنیا کو شیدا کیجیے

ابھی سینوں میں حبِّ سیّدِ ابرار ﷺ رکھتے ہیں
ابھی بازو میں زورِ حیدرِ کرّارؓ رکھتے ہیں
ابھی دنیا میں شانِ خالدِ جرّارؓ رکھتے ہیں
ابھی ہاتھوں میں ہم اسلام کی تلوار رکھتے ہیں
ابھی لشکر ہمارا بر سرِ پیکار باقی ہے
ابھی در دستِ مسلم تیغِ جوہر دار باقی ہے

ہمارے کارنامے گردشِ افلاک سے پوچھو
ہماری داستانیں کربلا کی خاک سے پوچھو
ہماری زد عدو کی دیدۂ نمناک سے پوچھو
ہماری شان تم طیبہ کی خاکِ پاک سے پوچھو
حکایت ہے ہماری بر زباں اب تک زمانے کو
جہاں کے ذرّے ذرّے سے سنو اپنے فسانے کو

کہیں باطل کے خرمن کے لیے برقِ تپاں آئے
کہیں اسپین میں ہم صورتِ طارق عیاں آئے
چراغِ بزم بن کر ظلمتوں میں ضوفشاں آئے
محمد ابن قاسم بن کے ہم ہندوستاں آئے
غرض ہر جا نظر آئے، ہواؤں میں فضاؤں میں
کبھی دریا کی موجوں میں، کبھی کالی گھٹاؤں میں

ہمیں اہلِ جہاں کو عظمتِ ایماں دکھانی ہے
ہمیں شانِ بلالؓ و بوذرؓ وسلمانؓ دکھانی ہے
ہمیں گم کشتۂ حق کو رہِ قرآں دکھانی ہے
ہمیں لیلٰی کی صورت قیس کو عریاں دکھانی ہے
زمینوں، آسمانوں میں خدا کا نام لینا ہے
ہمیں ہر ڈوبتے بیڑے کو بڑھ کر تھام لینا ہے

روایاتِ سلف کا دہر میں پھر نام کرنا ہے
جہاں پر سایہ افگن پرچمِ اسلام کرنا ہے
ابد تک دہر میں رہنا ہے، رہ کر کام کرنا ہے
بہارِ صبحِ گیتی بن کے ہم کو شام کرنا ہے
خدائے برتر و رحمٰن پر ایمان لائے ہیں
جہاں کی رہبری کے واسطے قرآن لائے ہیں

مجاہد مسلموں کے جوشِ عالم گیر کا صدقہ
الٰہی! دے شہیدِ کربلا شبیر کا صدقہ
ترے خاصانِ در کی آہِ پر تاثیر کا صدقہ
جنیدؒ و شبلیؒ و رومیؒ وغیرہ پیر کا صدقہ
دعا اطہر کی ہے یارب کہ ہم دل شاد ہو جائیں
ترے یہ خانماں برباد پھر آباد ہو جائیں

◎

پھر بادۂ یثرب کا گردش میں ہے پیمانہ
ہر دل نظر آتا ہے اسلام کا دیوانہ

پھر جوشِ کرم دیکھو ساقیِ "سقاھم" کا
میخانہ سے آتا ہے پیمانہ پہ پیمانہ

آنکھوں پہ سماں چھایا پھر مسجدِ نبوی کا
شاید کہ ہے پڑنے کو بنیادِ خدا خانہ

یوں نقش جما دو تم دنیا میں مساجد کا
پھر چشمِ جہاں دیکھے نہ صورتِ بت خانہ

یا رب! یہاں جلوہ ہے یہ کس کی تجلّی کا؟
اس شمع پہ شیدا ہیں سب صورتِ پروانہ

اسلام کی برکت سے، مسلم کی سخاوت سے
تکبیر سے گونج اُٹھے ہر بستی و ویرانہ

کیا ڈر ہمیں دوزخ کا، جب ہم پہ قیامت میں
سرکار دو عالم کی ہے چشمِ رحیمانہ

امید پر آیا ہے اطہر تری چوکھٹ پر
دے دے کوئی پیمانہ اے ساقیِ مے خانہ

ہندوستانی مسجد بھیمڑی

گزر جاتی ہے جو دل پر کبھی تم نے بھی جانی ہے
کلیجہ تھام لو، اک بات تم کو بھی سنانی ہے
بہت پُر درد اے بھیمڑی کے لوگو! یہ کہانی ہے
ضرورت مند اس دم "مسجد ہندوستانی" ہے
نہ کام آؤ گے گر تم تو تامل کار کیا ہوگا
یوں ہی گر رہ گئی مسجد ادھوری تو برا ہوگا

یہ مانا کار خانے بند ہیں، حالات ابتر ہیں
بظاہر بند ہیں روزی کے ہم پر جتنے بھی در ہیں
پہننے اوڑھنے، کھانے کے اندیشے بھی گھر گھر ہیں
مگر پھر بھی بتائیں اہلِ دل جو دیں کے یاور ہیں
صحابہ اور رسول پاک کو کتنی تھی آسانی؟
بہ آسانی میسّر تھا انھیں اک گھونٹ بھی پانی؟

خدا کے کام دشواری میں ہی انجام پاتے ہیں
خدا والے اسی اک کام میں آرام پاتے ہیں
غریب و مفلس و محتاج بھی انعام پاتے ہیں
ستم کش رنج و غم کے میکدے سے جام پاتے ہیں
خدا کے کام میں بازار کا غم اک بہانہ ہے
خدا کا گھر بھی بازاری غموں کا کیوں نشانہ ہے؟

مسلمانو! غلط، پُر پیچ راہوں کو بدل ڈالو
دماغ و دل بدل ڈالو، نگاہوں کو بدل ڈالو
غمِ دنیا کو اور دنیا کی آہوں کو بدل ڈالو
تم اپنی صبح گاہوں، شام گاہوں کو بدل ڈالو
احادیثِ نبی، اللہ کی آیات کو مانو
مری باتوں کو مت مانو، خدا کی بات کو مانو

خلد سجدہ کے لوٹ لیا
ہم نے نزدیک پا کے لوٹ لیا

اپنی مسجد بڑے زور آئی
کامیابی ہمارے گھر آئی
دل کی امید آج بر آئی
خلد چلتے ہوئے نظر آئی
ہاتھ ہم نے بڑھا کے لوٹ لیا

اپنی مسجد ہے بزمِ یزدانی
ہے ہر اک اینٹ غرقِ نورانی
ہے مناروں پہ ماہِ کنعانی
حسن میں وہ ہے یوسفِ ثانی
اس کو سودا بنا کے لوٹ لیا

پہلے درپردہ بیٹھ کر اس نے
اپنا مسکن کیا جگر اس نے
کر دیا دل کو جلوہ گر اس نے
پہلے روپوش تھی مگر اس نے
رخ سے پردہ ہٹا کے لوٹ لیا

چل تو اللہ کا حرم بنوا
کھول دے اپنے شوق کا دریا
تیرا ہر دم بھلا کرے مولا
تو نے دنیا میں دولتِ عقبیٰ
چند پیسے لٹا کے لُوٹ لیا

گلستاں میں بہار آئی ہے
بو ہوا پر سوار آئی ہے
رحمتوں کی قطار آئی ہے
خلد سے یہ پکار آئی ہے
مجھ کو مسجد بنا کے لُوٹ لیا

دردِ عصیاں کی ہے دوا مسجد
میرے دل کا ہے مدّعا مسجد
کیا بنی ہے یہ خوش نما مسجد
تو نے کیا خوب کردیا مسجد
محوِ حیرت بنا کے لُوٹ لیا
دین و ایماں ہیں مسجد و منبر
ہے یہ محبوبِ خالقِ اکبر
جام دیتا ہے ساقیِ کوثر
کوئی مجھ کو کہے نہ اے اطہر
چند نظمیں پڑھا کے لُوٹ لیا

مسلم کی زبانوں پر مسجد کا ترانہ ہے
محفل میں زلیخا کی، یوسف کا فسانہ ہے

دنیا میں مساجد کی تعمیر مسلمانو!
جنت میں مکاں اپنا لاریب بناتا ہے

پھر وقت نہ آئے گا کرنا ہو جو اب کر لے
یہ وقت ہے جنت کا، رحمت کا زمانہ ہے

ہم شمعِ شہِ دیں کے پروانے ہیں پروانے
سینے کی جلن کو اب کچھ اور بڑھانا ہے

کوسوں سے چمک جائے آنکھوں میں مسلماں کی
مسجد کے مناروں کو پُرنور بنانا ہے

جب آپ نے چھیڑا ہے پورا بھی اسے کیجے
مقصد مرے کہنے کا بس یاد دلانا ہے

ہوتا ہے یہیں سودا جنت کے خریدارو!
باہر نہ کہیں جانا ہے اور نہ آنا ہے

اخترؔ مرے نالوں میں اللہ اثر بخشے
امید کے ہونٹوں پر مسجد کا ترانہ ہے

◎

ہر اک شے میں جلوہ گری ایک ہے
کئی راستے ہیں گلی ایک ہے
خلیفہ ہیں چار اور نبی ایک ہے
کئی چاند ہیں چاندنی ایک ہے
ہیں دل تو بہت، پر غنی ایک ہے

زمیں کے حسیں ماہ پارے ہیں فانی
فلک کے یہ سارے نظارے ہیں فانی
یہ شمس و قمر، یہ ستارے ہیں فانی
جہاں میں یہ سارے کے سارے ہیں فانی
بقا کے لیے بس وہی ایک ہے

بہت رہ نما آئے دینِ ہدیٰ کے
بہت پانی برسے خدائی گھٹا کے
ہزاروں چراغ آئے بزمِ صفا کے
خدا جانے کتنے نبی ہیں خدا کے
مگر سب سے اعلیٰ نبی ایک ہے

یہ دنیا ہے تاباں مسلماں کے دم سے
کھلا ہے گلستاں مسلماں کے دم سے
ہرا ہے بیاباں مسلماں کے دم سے
ہے روشن شبستاں مسلماں کے دم سے
ہیں جو ہر بہت جوہری ایک ہے

جہاں میں اماں کوئی پاتا نہیں ہے
جہاں سے جو جاتا ہے آتا نہیں ہے
خدا کو کبھی وہ بھلاتا نہیں ہے
مسلماں یہاں دن گنواتا نہیں ہے
کہ دنیا کی یہ زندگی ایک ہے

چلو یارو اللہ کا گھر بناؤ
پسینہ کے بدلے لہو تم بہاؤ
یہاں آؤ، عقبیٰ کی دولت کماؤ
مسلماں کو اس وقت اطہر بلاؤ
کہ نیکی کی ساعت یہی ایک ہے

تکمیل مسجدِ جامع کی جب تعمیر ہوجائے
مبارک پور تیری کیوں نہ پھر تنویر ہوجائے

جو اونچا نام حق کرنا ہے تعمیرِ مساجد سے
مسلمانو! بلند اک نعرۂ تکبیر ہوجائے

اگر دنیا میں بنوائے کوئی کا شانۂ باری
تو اس کے واسطے جنت میں گھر تعمیر ہوجائے

طلب، آرامِ دنیا کی جہاں دن رات رہتی ہے
وہاں کچھ راحتِ عقبیٰ کی بھی تدبیر ہوجائے

اتارو دل میں یوں نقشہ جمالِ خانۂ حق کا
سراسر خانۂ دل، کعبہ کی تصویر ہوجائے

ذرا دل کھول کر چندہ عطا کر دیجیے جس سے
مکمل خانۂ معبود بے تاخیر ہوجائے

لٹا دے گھر کا گھر جو خانۂ معبود کی خاطر
تو بیشک اس کے حق میں خلد کی جاگیر ہوجائے

مے طہور
کتب خانہ قاسمی
مبارک پور اعظم گڑھ

قطعات

و

متفرقات

قطعات

مکاری

منھ پہ مکار کے گھنی ریشیں
زہد و تقویٰ سے یوں مچلتی ہیں

جیسے کالج کی زشت رو پریاں
منھ پہ پوڈر لگا کے چلتی ہیں

جمع اضداد

جمع اضداد کے معنی کوئی مجھ سے پوچھے
عشق تعمیر ہے، تخریب کا ساماں بھی ہے

جس طرح فقر کی بخشی ہوئی نازک حالت
دیں کی تکمیل ہے، غارت گرِ ایماں بھی ہے

قحط بنگال

دیکھتا ہوں حسن کا اب حال بھی بے حال ہے
سر پہ چڑھ کر بولنے کو جادوئے بنگال ہے

خیر سے ہے دام خالی، مکر کی زنبیل کا
اب تو دانے کا مرے صیاد کے گھر کال ہے

◎

رنگ و بو مل جائے گلشن کے گل پامال کو
بھول جائے ہر چمن والا فضائے حال کو

حور و غلماں خود ہی بن جائیں عروسانِ چمن
خطۂ جنت بنادے یا خدا بنگال کو

◎

بیواؤں کی آہوں سے، یتیموں کی نوا سے
اک زہر برسنے لگا مسموم فضا سے

ڈر ہے مجھے اے میرے شکم سیر جوانو!
مرجاؤ نہ تم بھی کہیں بنگہ کی ہوا سے

یہودی اور فلسطین

شوقِ نگہِ کور کو اب دور کی سوجھی
لنگور کو آغوش کسی حور کی سوجھی

اللہ رے یہ حوصلۂ قوم یہودی
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

ایماں کا سودا

واعظ گئے دیہات، صوفی بھی حرم میں
اب شہر میں مُلا کا کہیں گُل نہیں کھلتا

ہر سمت نظر آتے ہیں اب گاجرو مولی
بازار میں ایمان کا سودا نہیں ملتا

◎

دلِ فسردہ کو بہلا کے چار تنکوں پر
کسی سے حالِ غم جورِ باغباں نہ کہا

تمام بزم تھی سننے پہ گوش برآواز
ہمیں نے قصۂ سوزِ غمِ نہاں نہ کہا

◎

آرزوئے دل بے تاب نکالی میں نے
ساقیا! بات سرِ بزم بنالی میں نے

لب ترے جام پہ تھا اور نظر تیری طرف
آج مستی تری آنکھوں سے چرالی میں نے

◎

یوں پلا آج کہ رضوانِ اِرم جھوم اُٹھے
ترے انداز پہ خود دستِ کرم جھوم اُٹھے

ڈال دے مست نگاہوں کی جھلک صہبا میں
رند تو رند، ذرا شیخِ حرم جھوم اُٹھے

◎
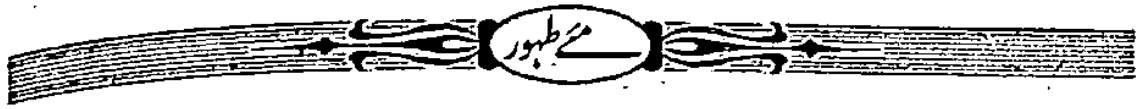
نہ امنگیں، نہ شب ماہ سہانی ساقی
یاد آتی ہے ہر اک بات پرانی ساقی

دیکھ لے پھر اسی اندازِ تغافل سے مجھے
لوٹ آئے مرا وہ عہدِ جوانی ساقی

◎

ہائے وہ عہدِ محبت کی سہانی راتیں
جب جوانی میں تھیں ہم رنگِ جوانی راتیں

نیند کیا، کیسا سکوں، صبح کدھر، شام کہاں؟
یاد آئی ہیں مجھے آج پرانی راتیں

◎

زورِ طوفاں نہ رہا، موج کا دھارا نہ رہا
سچ ہے کشتی پہ بلاؤں کا اجارا نہ رہا

لیکن اے یار! کہوں کس سے حقیقت اس کی
آہ ساحل میں بھی ساحل کا سہارا نہ رہا

◎

مقامِ قدس میں اہلِ تقدس کو پیام آیا
ہزاروں برکتوں کے ساتھ پھر ماہِ صیام آیا

غبارِ کوچۂ جاناں میں جلوہ ڈھونڈھنے والو
وہ دیکھو حسنِ جلوہ ریز پھر بالائے بام آیا

◎

چیر دے سینۂ گردوں کو صدائے دل سے
نالۂ شب کے لیے راہ گزر پیدا کر

منتظر، راہِ بیاباں بھی ہے لیلیٰ بکنار
جذبۂ قیس! ذرا عزمِ سفر پیدا کر

◎

برائے مشاعرہ ماہتابی بزم شباب سخن بمبئی ۱۹ر مارچ ۱۹۵۴ء

تیرتے ہیں نور کے دریا میں نغماتِ حیات
رات کے پچھلے پہر چھیڑا ہے فطرت نے رباب

دے رہی ہے درس رنگ و بو چمن کو چاندنی
نورزادے پڑھ رہے ہیں صف بہ صف سیمیں کتاب

◎

تھم گیا ماحول کی رنگینیوں کا اِرتعاش
اہتمامِ بزم شب کا ہو گیا پورا نصاب

رنگ و بو کی گود میں شبنم کی چادر اوڑھ کر
سو رہی ہے دامن گل پر عروسِ ماہتاب

◎

رنگ و بو، موجِ صبااور غنچہ و گل سب سہی
صحنِ گلشن باوجود اس کے رہا نا فیض یاب

میرے نغماتِ جنوں کی جستجو میں اے ندیم
چاندنی پھرتی رہی آوارہ و خانہ خراب

◎

شدتِ تنویر بھی دیتی ہے ظلمت کو فروغ
اور بھی ہوتی ہے گم ہو کر حقیقت بے نقاب

رہبرِ فکر و نظر دھوکا نہ کھاتا راہ میں
دوپہر کی دھوپ سے بنتا ہے صحرا میں حباب

◎

غم کی پیشانی دمک کر دیتی ہے مخمل کو لو
ڈوب جاتے ہیں خوشی میں ساقی و جام و شراب

سبزہ زاروں، کوہساروں، شاخساروں کی قسم
بوڑھی کرنوں سے بنا ہے شام کا رنگیں شباب

حکومت ہند کی طرف سے جشن شراب بندی کے اصلاحی مشاعرہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۳ء میں پڑھے گئے قطعے۔

رنگ ہوتا ہے کبھی شر کا بانداز خیر
سرخ انگار کی ہے جیسے گلابی پوشاک

دیکھ کر آتشِ خاموش کے ناری کرتب
جھونک دو آتشِ سیال کے منہ پر خاک

عقل کو ، روح کو ، اخلاق کو جو شل کردے
میرے نزدیک وہ تخریب ہے تعمیر نہیں

رقص ہو ، نغمہ ہو ، طاؤس ہو ، یا پھر ہو شراب
کون ان میں دلِ انساں کے لیے تیر نہیں

◎

کچھ اظہار کرنے کو جی چاہتا ہے
تمھیں پیار کرنے کو جی چاہتا ہے

نہیں جس کا آغاز و انجام کچھ بھی
وہی کار کرنے کو جی چاہتا ہے

◎

دل آباد کرنے کو جی چاہتا ہے
تمھیں یاد کرنے کو جی چاہتا ہے

مقیّد رکھا مدّتوں ہم نے غم کو
اب آزاد کرنے کو جی چاہتا ہے

◎

ملاقات کرنے کو جی چاہتا ہے
ذرا بات کرنے کو جی چاہتا ہے

تم آؤ کہ مست و حسیں چاندنی کو
خرابات کرنے کو جی چاہتا ہے

متفرقات

یہ میری زندگی اے کاش! افسانہ ہی بن جاتی
یہ افسانے میں اُن کے تذکرہ میرا کہاں آیا

بدلنا ہی پڑا کچھ دور چل کر راستہ اُن کو
نہ دیوانے کو راس آخر مزاجِ کارواں آیا

◎

بے گانۂ دل مصلحتِ دل سے خفا ہے
پروردۂ طوفاں لبِ ساحل سے خفا ہے

ہے سامنے آئینے کے بدلا ہوا تیور
خود بن کے مقابل وہ مقابل سے خفا ہے

◎

پھانس احساس کی پڑجاتی ہے گاہے گاہے
گر چہ اُلفت سے اس آفت کو ٹلے دیر ہوئی

دیکھ دیوانہ کو کھویا ہے کہاں راہوں میں
اس کو زنداں سے بیاباں کو چلے دیر ہوئی

شدّتِ شوق میں تاخیر کی شدّت مت پوچھ
سر کو رکھے ہوئے خنجر کے تلے دیر ہوئی

◎

لہو سے اپنے لالہ زار ہے اُن کی گلی دیکھو
اب آؤ دیکھنے والو! یہ رنگِ عاشقی دیکھو

ہے جانِ عاشقِ ناشاد اور ٹھوکر زمانے کی
نگاہوں سے گری ہوتی ہے کیسی زندگی دیکھو

نظر کے سامنے وہ ہیں مگر اُٹھتیں نہیں نظریں
لب جو بیٹھنے والوں کی یہ تشنہ لبی دیکھو

◎

شمشیر بکف کود پڑو جنگِ عمل میں
ہے دُرِّ گراں مایہ نہاں بحرِ اجل میں

◎

جو جینا ہے تو جی جاؤ جو مرنا ہے تو مر جاؤ
بہر صورت اب اس دورِ نحوست سے گزر جاؤ

◎

جگا دو بسترِ غفلت پہ دیکھو کون سویا ہے
بساطِ ہند پر اک حشرِ امروز برپا ہے

◎

آہ کل جو تھے ائمہ غازیانِ ہند کے
اضطرابِ دین محکم بن گیا ہے اُن کا چین

◎

معاذ اللہ یہ رسوائیِ انساں معاذ اللہ
خدا وندا کدھر جائیں گے یہ خیرالبشر والے

کسی کی بھی ایسی جوانی نہیں ہے
تمہارا زمانے میں ثانی نہیں ہے

نظر، زلف، ابرو، جبیں اور شانہ
کہاں جلوۂ لن ترانی نہیں ہے

وہی چاند ہے اور وہی اپنی بستی
مگر چاندنی اب سہانی نہیں ہے

وفورِ گرمیِ الفت کو مدت ہوگئی لیکن
ابھی دوچار چنگاری دبی معلوم ہوتی ہے

سرِ شاخِ چمن جو برق بن بن کر چمکتی تھی
قفس میں بھی وہی تو روشنی معلوم ہوتی ہے

جب آدھی رات کو بیتاب ہوجاتا ہے دل اطہرؔ
شریکِ درد میری شاعری معلوم ہوتی ہے

◎

زمیں فانی، زماں فانی، مکیں فانی، مکاں فانی
خدا کی ذات باقی ہے، بقیہ کل جہاں فانی

سرور و سرخوشی فانی، غمِ وآہ و فغاں فانی
ہے فانی زندگی اور زندگی کی داستان فانی

نمودِ زندگی ہی موت کی تمہید ہوتی ہے
غمِ شامِ محرّم یعنی صبحِ عید ہوتی ہے

◎

بسا اوقات آجاتی ہے رونے میں ہنسی مجھ کو
عطا کی ہے مرے غم نے نوائے دو رُخی مجھ کو

ترے آشفتہ سر کو راس ہے خاکِ گدایانہ
عبث ہے دولتِ قارون و تاجِ خسروی مجھ کو

◎

میں اور بتوں کا عشق، خدا ساز بات ہے
ورنہ خود اپنے درد سے فرصت کہاں مجھے

سر مستیِ شباب میں تھرا چکے تھے پاؤں
میرے خدا نے تھام لیا نا گہاں مجھے

◎

جبینِ ناز بھی لہرا کے جھک ہی جاتی ہے
جہاں نیاز کے سجدے بچھا گیا ہوں میں

میں خود ہی چھیڑ کے ذکرِ کہن نہیں رویا
انھیں بھی بزم میں اکثر رُلا گیا ہوں میں

◎

اسی میں منحصر دیکھی تمھاری جب خوشی میں نے
خدا سے مانگ لی خوش ہو کے آزردہ دلی میں نے

تم آئے سامنے کچھ مسکراتے، کچھ حیا کرتے
تو اس حسنِ ادا پر وقف کردی زندگی میں نے

◎

آدمی کیا ہے کیا نہیں ہوتا
ہاں مگر اک خدا نہیں ہوتا

درد ہوتا ہے، رات ہوتی ہے
کوئی درد آشنا نہیں ہوتا

یاد آتے ہو بیشتر ورنہ
کون کس سے جدا نہیں ہوتا

◎

بڑی مشکل سے جس کو دیدۂ و دل ڈھونڈھ لائے تھے
اسی کو الوداع کہنا پڑا، کیا ہے ستم ساقی

انھیں کی طرح ان کی یاد کو بھی دل میں رکھیں گے
انھیں کی طرح ان کی یاد بھی ہے محترم ساقی

مرا سر مایۂ اخلاص تیرے در پہ حاضر ہے
ہے تیرا ظرف، تو جانے حسابِ بیش و کم ساقی

◎

پھر حاکم و محکوم کی تفریق مٹا کر
آدم کے جگر پاروں کے طبقات بدل دوں

پھر خوگرِ افسانۂ راحت ہو زمانہ
ہر ظلم و تعدی کی روایات بدل دوں

کیا چیز ہے؟ مل جائیں جو کچھ مردِ مسلماں
طاغوت کے ناپاک ارادات بدل دوں

بچے بچیوں کی پیدائش پر اشعار

شاہانہ مریم بنت مولانا عبدالجلیل مدرسہ شاہی کی ولادت پر ۱۹۹۲ء میں فی البدیہ کہے گئے۔

گھر کی زینت یہ پیاری مریم ہے
فضلِ ربِّ جہاں یہ کیا کم ہے؟

اہلِ خانہ سب اس کی آمد پر
شکر جتنا ادا کریں کم ہے

ہے یہ ہم سب کی آنکھ کا تارا
پھول کی پنکھڑی پہ شبنم ہے

رونقِ گلستانِ عبدِ جلیل
ہو فزوں تر، دُعا یہ ہر دم ہے

اس کی طفلانہ حرکتوں کے سبب
پورے گھر میں خوشی کا عالم ہے

پاک طینت ہو، نیک سیرت ہو
سب کے لب پر، دعا یہ پیہم ہے

اس کی ہر ہر ادا ہے شاہانہ
اس لیے جزوِ نامِ مریم ہے

◎

سعدانہ شمیم بنت مولانا عبدالجلیل کی ولادت پر ۱۹۹۵ء میں جب قاضی صاحب مدرسہ شاہی مرادآباد تشریف لے گئے تھے، وہیں یہ اشعار کہے گئے۔

جو خرد کو بنائے پیمانہ
در حقیقت وہی ہے فرزانہ

تا کہ بچی رہے سعادت مند
خوب رکھا ہے نام سعدانہ

◎

محمد عدنان برادرزادہ مولانا عبدالجلیل کی ولادت پر ۲۳؍جون ۱۹۹۵ء کو کہے گئے۔

فضل رب ہے، خوشی کا ساماں ہے
یعنی عدنان راحتِ جاں ہے

شہرِ اُمید کی فصیلوں پر
ہر طرف جشن ہے، چراغاں ہے

رقص کرتی ہے چاندنی ہر سو
روئے عدنان ماہِ تاباں ہے

بچ کے جس سے خزاں گزرتی ہے
تو حقیقت میں وہ گلستاں ہے

تحيةٌ واجلالٌ

لصاحب الفضيلة الشيخ يوسف الفوزان الوزير المفوض بمناسبة اعتلائه كرسى الوزارة الخارجية فى الجمهورية الهندية عن جلالة الملك سعود ملك المملكة العربية السعودية وانشدت هذه القصيدة فى حفلة اقيمت للتذكار عن لجنة خدام النبى بمبئى فى رجب المرجب ١٣٧٤ھ / ٢٧ فبرائر ١٩٥٥ء۔

بفضل الالٰه الواهب الخير واحد
لقد فاز فوزان بجم المحامد

الا مرحبا مسك الختام معجلا
فاهلا وسهلا للوزير الممجّد

لقد حاذ جما لا ، يرام منا له
فطوبى له من كل ولد ووالد

ليوسف هذا اخوة يحفظونه
كما يحفظ الحرّاس من عين حاسد

له همة فى كل يوم وليلة
نبيل العلى والمكرمات الخوالد

لــه جــانــب سهل لــمن كــان طــارقــا
لــلــوارد الــعــطشــان عــذاب الــموارد

لـــه بـــاسـم خُـــدّام الـــنبـــى عــلاقة
تــدوم عـــلـــى مرالـزمـــان الــمســاعــد

لـــه فـــى الامــور الــواجبــات سيــاسة
لــه ذاع صيــت فــى الــرجــال الابــاعد

مســاعيــه قــد جــعـلــت وزيرا مفوضــا
وســـاعـــده لــلــملك خيــر الســواعــد